ہر گھر کیلئے

جلد 38 شمارہ 11
نومبر 20016ء
قیمت -/60 روپے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامیات

انشاء نامہ

یادِ رفتگاں

انٹرویو

ناولٹ

سلسلے وار ناول

مکمل ناول

افسانے

مستقل سلسلے

سردار طاہر محمود نے نواز پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ حنا 205 سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا۔
خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ، **ماھنامہ حنا** پہلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرکلر روڈ
اردو بازار لاہور فون: 042-37321690, 042-37310797 ای میل ایڈریس،
monthlyhina@hotmail.com, monthlyhina@yahoo.com

قارئین کرام! نومبر 2016ء کا شمارہ پیش خدمت ہے۔

گزشتہ دنوں ہماری پارلیمنٹ نے اپنے مشترکہ اجلاس میں غیرت کے نام پر قتل اور انسداد عصمت دری کے دو بلوں کی متفقہ منظوری دے دی۔ پاس کیے جانے سے قبل ان بلوں پر ایوان میں بھرپور بحث ہوئی مگر بالآخران پر اتفاق رائے پیدا کرلیا گیا۔ ان بلوں کی منظوری حکومت کی ایک مثبت کاوش ہے جس کی ستائش کی جانی چاہیے۔ غیرت کے نام پر قتل کے حوالے سے پاکستان پوری دنیا میں بدنام ہورہا تھا۔ پاکستان میں اس طرح کے قتلوں کی بڑھتی ہوئی تعداد پوری دنیا کے ذرائع ابلاغ کی توجہ کا مرکز تھی اور انسانی حقوق کے لئے کام کرتی ہوئی تنظیموں نے ان قتلوں پر تشویش کا اظہار کیا تھا اور سوال اٹھایا جارہا تھا کہ پاکستان آخر ایسے واقعات کی روک تھام کے لئے کوئی قدم کیوں نہیں اٹھا رہا۔ سوال اٹھایا جارہا تھا کہ خواتین کے حوالے سے پاکستانی معاشرہ اتنا سنگدل کیوں ہے ایسے معاملات میں اکثر ماں باپ مدعی ہوتے ہیں۔ جو کچھ عرصہ بعد مجرم کو معاف کردیتے ہیں۔ ہماری سوسائٹی میں تو عورتوں پر ہلکے تشدد کا جواز فراہم کرنے کے لئے بھی میڈیا میں باقاعدہ بحث ہوتی رہی ہے۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ انسانی رشتوں کا تقدس ہی باہمی احترام کے ساتھ وابستہ ہے۔ عوام کی نمائندہ پارلیمنٹ اس بات پر مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے اتفاق رائے سے اتنا اہم مسئلہ حل کردیا ہے جس کی پوری دنیا ستائش کررہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ حکومت کو اس بل پر عمل درآمد کی توفیق عطا فرمائے تاکہ ہماری مائیں، بہنیں اور بیٹیاں اپنے آپ کو مردوں کے برابر کا انسان سمجھ سکیں۔

اس شمارے میں: ۔ ایک دن حنا کے ساتھ میں سونیا چوہدری اپنے شب وروز کے ساتھ، اُم ایمان اور طیبہ ہاشمی کے مکمل ناول، ذُرکمن اور شبانہ شوکت کے ناولٹ، شاہانہ عرفان، رمشا احمد، سیم بنت عاصم، ثناء کنول، حمیرا نوشین، رافعہ جاوید اور کنول ریاض کے افسانے، اُم مریم اور نایاب جیلانی کے سلسلے وار ناولوں کے علاوہ حنا کے سبھی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی آرا کا منتظر
سردار طاہر محمود

حمد باری تعالیٰ

اسی کا حکم جاری ہے زمینوں آسمانوں میں
اوران کے درمیان جو ہیں مکینوں اور مکانوں میں

ہوا چلتی ہے باغوں میں تو اس کی یاد آتی ہے
ستارے چاند سورج ہیں سبھی اس کے نشانوں میں

اسی کے کرم سے طے ہوتی ہے منزل خواب ہستی کی
وہ نام اک حرف نورانی ہے ظلمت کے جہانوں میں

اسی کے پاس اسرار جہاں کا علم ہے سارا
وہی برپا کرے گا حشر آخر کے زمانوں میں

وہ کرسکتا ہے جو چاہے وہ ہر اک شے پہ قادر ہے
وہ سن سکتا ہے رازوں کو جو ہیں دل کے خزانوں میں

بچا لیتا ہے اپنے دوستوں کو خوف باطل سے
بدل دیتا ہے شعلوں کو مہکتے گلستانوں میں

منیر اس حمد سے رتبہ عجب حاصل ہوا تجھ کو
نظیر اس کی ملے شاید پرانی داستانوں میں

منیر نیازی

نعت رسول مقبولﷺ

مرا جذب دل میرے کام آ گیا ہے
مدینے سے آخر پیام آ گیا ہے

جہاں ذکر خیر الانام آ گیا ہے
لبوں پہ درود و سلام آ گیا ہے

چمن میں جو وہ خوش خرام آ گیا ہے
بہاروں کو گویا پیام آ گیا ہے

کہا جس کی آمد پہ انسانیت نے
کہ خیر البشر لاکلام آ گیا ہے

ستاروں کو تابندگی بخشنے کو
افق پہ وہ ماہ تمام آ گیا ہے

ازل سے زمانہ تھا مشتاق جس کا
وہ محبوب بالائے بام آ گیا ہے

خدا کے کرم کی کرامت تو دیکھو
کرم بن کے راس الکرام آ گیا ہے

کوئی کاش آ کر عنایت سے کہہ دے
غلاموں میں تیرا بھی نام آ گیا ہے

پروفیسر عنایت علی خان

ہمارے نبیﷺ کی پیاری باتیں

سید اختر ناز

توبہ

عبد اللہ بن کعب بن مالکؓ سے روایت ہے، یہ (عبداللہ) حضرت کعب کے بیٹوں میں سے ان کا رہبر تھے، جب وہ نابینا ہو گئے تھے، یہ کہتے ہیں، میں نے (اپنے باپ) کعب بن مالکؓ کو وہ واقعہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے، جب وہ غزوہ تبوک میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پیچھے رہ گئے تھے۔

حضرت کعبؓ نے فرمایا۔

"جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی غزوہ (جہاد) کیا، میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پیچھے نہیں رہا، سوائے غزوہ تبوک کے، البتہ غزوہ بدر میں بھی میں پیچھے رہا تھا، لیکن غزوہ بدر میں پیچھے رہنے والوں پر ناراضی کا اظہار نہیں کیا گیا تھا، اس غزوے میں تو دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمان قافلہ قریش کے تعاقب میں نکلے تھے، (یعنی ابتداء جہاد کی نیت نہیں تھی) یہاں تک کہ اللہ نے ان کو اور ان کے دشمنوں کو بغیر وعدے (بغیر ارادہ اعلان قتال) کے ایک دوسرے کے مقابل جمع (صف آرا) کر دیا، اور عقبہ کی رات (منی میں) میں حاضر تھا، جب ہم نے اسلام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عہد وفا باندھا تھا، اگرچہ واقعہ بدر کا چرچا لوگوں میں عقبہ کی رات سے زیادہ ہے، لیکن مجھے بدر کی حاضری سے اس رات کی حاضری زیادہ محبوب ہے، (کیونکہ اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے)

اور میرے غزوہ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پیچھے رہنے کا واقعہ اس طرح ہے کہ میں اتنا زیادہ قوی اور اتنا زیادہ خوش حال کبھی نہ تھا جتنا اس وقت تھا، جب میں غزوہ تبوک میں آپ سے پیچھے رہا۔

اللہ کی قسم! میرے پاس کبھی اکٹھی دو سواریاں نہیں ہوئی تھیں، جبکہ اس موقع پر مجھے بیک وقت دو سواریاں میسر تھیں، (مطلب یہ ہے کہ اسباب و وسائل کے اعتبار سے میرے پیچھے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب بھی کسی غزوے کا ارادہ فرماتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے غیر کے ساتھ توریہ فرماتے، (یعنی سفر کی اصل سمت چھوڑ کر عام طور پر دوسری سمت کا ذکر فرماتے، تاکہ دشمن سے اصل حقیقت مخفی رہے) حتی کہ یہ غزوہ تبوک ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سخت گرمی کے موسم میں یہ غزوہ فرمایا، سفر دور کا اور جنگل بیابانوں کا تھا اور مدمقابل دشمن بھی بہت بڑی تعداد میں تھا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (توریے کی بجائے) مسلمانوں کے معاملے (یعنی اس محاذ جنگ) کو مسلمانوں کے سامنے کھول کر بیان فرما دیا، تاکہ وہ اس کے مطابق بھرپور تیاری کر لیں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں وہ سمت بھی بتلا دی، جس کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارادہ فرما رہے

تھے۔

مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بڑی تعداد میں تھے اور کوئی یادداشت کی کتاب ایسی نہیں تھی جس میں ان کے نام درج ہوتے، اس سے ان کی مراد رجسٹر تھا، حضرت کعبؓ فرماتے ہیں، اس لئے اگر کوئی شخص جنگ سے غیر حاضر رہتا تو وہ یہی گمان کرتا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخفی رہے گا اور وحی الٰہی کے بغیر اس کی غیر حاضری آپ کے علم میں نہیں آئے گی اور یہ غزوہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت فرمایا جب پھل پک چکے تھے اور ان کا سایہ عمدہ اور خوشگوار تھا اور میں ان ہی (پھلوں اور سایوں) کی طرف میلان رکھتا تھا۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں نے تیاری کی اور میرا حال یہ تھا کہ صبح کو آتا، تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تیاری کروں، لیکن بغیر کوئی فیصلہ کیے لوٹ جاتا اور اپنے دل میں کہتا کہ میں جب چاہوں گا (چلا جاؤں گا، کیونکہ......) میں پوری طرح اس پر قادر (وسائل سے بہرہ ور) ہوں۔

میری یہی (گومگو کی) حالت رہی اور لوگ جہاد کی تیاری میں لگے رہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مسلمان ایک صبح کو جہاد پر روانہ ہو گئے اور میں اپنی تیاری کے سلسلے میں کوئی فیصلہ ہی نہ کر پایا۔

میری کیفیت یہی رہی، حتی کہ مجاہدین تیزی سے آگے چلے گئے اور جہاد کا معاملہ بھی آگے بڑھ گیا، میں نے ارادہ کیا کہ میں بھی سفر پر روانہ ہو جاؤں اور ان سے جا ملوں، اے کاش! کہ میں ایسا کر لیتا، لیکن یہ میرے مقدر میں نہ ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چلے جانے کے بعد جب میں لوگوں میں نکلتا تو یہ بات میرے لئے حزن و ملال کا باعث بنتی کہ میرے سامنے اب کوئی نمونہ ہے تو صرف ایسے شخص کا جو نفاق سے مطعون ہے، (یا نفاق کی وجہ سے لوگوں میں حقیر ہے) یا ایسے کمزور لوگوں کا جنہیں اللہ نے معذور قرار دیا۔

(سارے راستے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے یاد نہیں فرمایا، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبوک پہنچ گئے، تبوک میں جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں میں تشریف فرما تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا۔

"کعب بن مالک نے کیا کیا؟"

بنو سلمہ کے ایک آدمی نے کہا۔

"اسے اس کی دو چادروں اور اپنے دونوں پہلوؤں کو دیکھنے نے روک لیا ہے۔" (یعنی دولت اور اس کے عجب اور کبر نے اسے نہیں آنے دیا۔)

معاذ بن جبلؓ نے اس سے کہا۔

"تو نے ٹھیک نہیں کہا، اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم نے اس (کعب) کے اندر خیر کے علاوہ کچھ نہیں جانا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش رہے، یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک سفید پوش آدمی کو ریگستان سے آتے ہوئے دیکھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"ابوخثیمہ ہوگا۔"

اور واقعی وہ ابوخثیمہ انصاری تھے اور یہ وہ شخص ہیں جنہوں نے (ایک مرتبہ) ایک صاع (تقریباً ڈھائی کلو) کھجور کا صدقہ کیا تو منافقین

نے انہیں (اس کے تھوڑا ہونے کا) طعنہ دیا تھا۔

حضرت کعبؓ نے کہا، جب مجھے یہ خبر پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتوک سے واپسی کا سفر شروع فرما دیا ہے تو مجھ پر غم کی کیفیت چھا گئی اور جھوٹے بہانے گھڑنے کا سوچنے لگا اور (دل میں) کہتا کہ کل (جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس تشریف لائیں گے تو) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ناراضی سے میں کیسے بچوں گا اور اس معاملے میں، میں اپنے گھر کے ہر سمجھ دار آدمی سے بھی مدد طلب کرتا رہا۔

جب مجھے بتلایا گیا کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آنے ہی والے ہیں تو (جھوٹے بہانے گھڑنے کا) باطل خیال میرے دل سے دور ہو گیا اور میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ بلاشبہ میں جھوٹ سے کبھی بچاؤ حاصل نہیں کر سکوں گا، چنانچہ میں نے سچ بولنے کا پختہ ارادہ کرلیا۔

صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول تھا کہ جب سفر سے واپس آتے تو سب سے پہلے مسجد میں جا کر دو رکعت نماز ادا فرماتے، پھر لوگوں کے سامنے بیٹھ جاتے۔

(اس سفر سے واپسی پر بھی) جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا ہی کیا تو منافقین نے آ کر عذر پیش کرنے اور حلف اٹھانے شروع کر دیے اور یہ تقریباً 80 آدمی تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ظاہری عذر کو قبول فرم لیا، ان سے بیعت لی، ان کے لئے مغفرت کی دعا فرمائی اور ان کی باطنی کیفیت کو اللہ کے سپرد کر دیا۔

میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گیا، جب میں نے سلام کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ناراض آدمی والا تبسم فرمایا، پھر فرمایا۔

"آگے آجاؤ۔"

میں آگے آ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سامنے بیٹھ گیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے پوچھا۔

"تمہیں کس چیز نے (جہاد سے) پیچھے رکھا؟ کیا تم نے اپنی سواری نہیں خریدی تھی؟"

میں نے کہا۔

"اے اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اللہ کی قسم! میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کسی اور کے پاس بیٹھا ہوتا تو یقیناً میں کوئی (جھوٹ موٹ) عذر کر کے اس کی ناراضی سے بچ جاتا، مجھے بحث وتکرار کا بڑا ملکہ حاصل ہے، لیکن اللہ کی قسم! مجھے معلوم ہے کہ اگر آج میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے جھوٹ بول کر سرخ رو ہو جاؤں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھ سے راضی ہو جائیں تو عنقریب اللہ تعالیٰ (وحی کے ذریعے سے مطلع فرما کر) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مجھ سے ناراض کر دے گا اور اگر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سچی بات عرض کر دوں تو اس کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھ پر ناراض ہوں گے، لیکن اس میں مجھے اللہ سے اچھے انجام کی امید ہے، (اس لئے سچ سچ عرض کرتا ہوں) اللہ کی قسم! (آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جانے میں) مجھے کوئی عذر نہیں تھا، اللہ کی قسم! میں اتنا طاقت ور اور خوش حال کبھی نہیں رہا جتنا میں اس وقت تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پیچھے رہا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"اس شخص نے یقیناً سچ کہا ہے، چنانچہ تم (یہاں سے) کھڑے ہو جاؤ، یہاں تک کہ

تمہارے متعلق اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے۔"
"میرے پیچھے بنو سلمہ کے کچھ لوگ آئے اور مجھ سے کہا۔"
"اللہ کی قسم! ہمیں نہیں معلوم کہ اس سے قبل تم نے کوئی گناہ کیا ہے، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کوئی ایسا عذر پیش کرنے سے کیوں قاصر رہے جیسا دوسرے پیچھے رہنے والوں نے پیش کیا، تمہارے گناہ (کی معافی) کے لئے یہی کافی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے لئے مغفرت کی دعا فرماتے۔"
حضرت کعبؓ نے فرمایا۔
"اللہ کی قسم! مجھ وہ (میری سچائی پر) ملامت کرتے اور ڈانٹتے رہے، یہاں تک کہ میرے جی میں آیا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہو کر اپنی پہلی بات کی تکذیب کر دوں (اور کوئی جھوٹا عذر پیش کر دوں) لیکن پھر میں نے ان سے پوچھا۔
"کہ میرے ساتھ والا معاملہ کسی اور کو بھی پیش آیا ہے؟"
انہوں نے کہا۔
"ہاں تمہارے جیسا معاملہ دو اور آدمیوں کو بھی پیش آیا ہے اور انہوں نے بھی وہی بات کہی ہے جو تم نے کہی ہے اور انہیں بھی (بارگاہ رسالت سے) وہی کچھ کہا گیا ہے جو تمہیں کہا گیا ہے۔"
میں نے ان سے پوچھا۔
"وہ شخص کون ہیں؟"
انہوں نے کہا۔
"مرارہ بن ربیع عمری اور لال بن امیہ واقفی۔"
یہ دونوں آدمی جن کا انہوں نے میرے سامنے ذکر کیا، نیک تھے اور جنگ بدر میں شریک ہوئے تھے اور ان میں میرے لئے نمونہ تھا، جس وقت انہوں نے ان دونوں آدمیوں کا میرے سامنے ذکر کیا تو میں اپنے سابقہ موقف پر جم گیا۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیچھے رہ جانے والوں میں ہم تینوں سے، لوگوں کو گفتگو کرنے سے روک دیا۔
حضرت کعبؓ بیان کرتے ہیں کہ لوگ ہم سے کنارہ کش ہو گئے، یا یہ کہا کہ لوگ ہمارے لئے بدل گئے، حتیٰ کہ زمین میرے لئے اوپری بن گئی، یہ زمین میرے لئے وہ نہ رہی جو میری جانی پہچانی تھی۔
اس طرح پچاس راتیں ہم نے گزاریں، میرے دوسرے دو ساتھی تو عاجز آ گئے اور گھروں میں بیٹھے روتے رہے، لیکن میں بالکل جوان اور نہایت قوی و توانا تھا، چنانچہ میں گھر سے باہر نکلتا مسلمانوں کے ساتھ نماز میں حاضر ہوتا اور بازاروں میں گھومتا پھرتا، لیکن مجھ سے کلام کوئی نہ کرتا۔
میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھی حاضر ہوتا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سلام بھی عرض کرتا اور اپنے دل میں کہتا کہ سلام کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے مبارک لبوں کو جنبش دیتے بھی ہیں یا نہیں؟
پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب ہی نماز پڑھتا اور دزدیدہ نظروں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھتا، (تو میں نے دیکھا کہ) جب میں نماز کی طرف متوجہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رخ کرتا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھ سے اعراض فرما لیتے۔
یہاں تک کہ جب مسلمانوں کی (میرے ساتھ) سختی اور بے رخی زیادہ دراز ہو گئی تو ایک

روز میں ابوقتادہ کے باغ کی دیوار پھاند کر اندر چلا گیا اور وہ میرا چچازاد بھائی اور لوگوں میں مجھے محبوب ترین تھا، میں نے اسے سلام کیا، لیکن اللہ کی قسم! اس نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا، میں نے اس سے کہا۔

''ابو قتادہ! میں تجھے اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، کیا تو میرے متعلق جانتا ہے کہ میں اللہ سے اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرتا ہوں؟''

وہ خاموش رہا، میں نے دوبارہ قسم دے کر پوچھا تو بھی وہ خاموش رہا، حتی کہ تیسری بار دے کر سوال دہرایا تو اس نے یہ کہا۔

''کہ اللہ اور اس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی بہتر جانتے ہیں۔''

جس پر میری آنکھوں سے (بے اختیار) آنسو جاری ہو گئے اور میں (جیسے گیا تھا ویسے ہی) دیوار پھاند کر واپس آ گیا۔

اسی اثنا میں (ایک روز) میں مدینے کے بازار میں جا رہا تھا کہ اچانک اہل شام کے نبطیوں میں سے ایک نبطی جو مدینے میں غلہ بیچنے کے لئے آیا تھا، کہہ رہا تھا۔

''کہ کون ہے جو کعب بن مالک کی طرف میری رہنمائی کرے؟''

لوگ اس کے لئے میری طرف اشارہ کرنے لگے، یہاں تک کہ وہ میرے پاس آ گیا اور اس نے مجھے شاہ غسان کا ایک خط دیا، میں پڑھا لکھا تو تھا ہی، میں نے اسے پڑھا، اس میں اس نے لکھا تھا۔

''امابعد! ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ تمہارے ساتھی نے تم پر ظلم کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں ذلت کے گھر میں رہنے یا ضائع کرنے کے لئے نہیں بنایا ہے، ہم تمہیں دعوت دیتے کہ ہمارے پاس آ جاؤ، ہم تم سے پوری ہمدردی کریں گے۔''

جب وقت میں نے یہ پڑھا تو میں نے کہا۔

''یہ بھی ایک آزمائش ہے۔''

میں نے اس (خط کو) تنور میں ڈال کر جلا ڈالا، حتی کہ جب پچاس دنوں میں سے چالیس دن گزر گئے اور (میرے بارے میں) وحی کا سلسلہ بھی (ابھی تک) موقوف ہی تھا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک قاصد کو اپنے پاس آتے ہوئے دیکھا، اس نے آ کر کہا۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ تم اپنی بیوی سے (بھی) علیحدگی اختیار کر لو۔''

میں نے پوچھا۔

''کیا میں اسے طلاق دے دوں یا کیا کروں؟''

اس نے کہا۔

''(طلاق) نہیں، اس سے علیحدگی اختیار کرو، اس کے قریب مت جاؤ۔''

اور میرے دوسرے دو ساتھیوں کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی پیغام بھجوایا، میں نے اپنی بیوی سے کہا۔

''اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ اور ان ہی کے پاس رہو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس معاملے کا فیصلہ فرما دے۔''

☆☆☆

انشاء نامہ

ڈگریاں بڑی نعمت ہیں

ابن انشاء

لاہور کے ایک اخبار میں ایک وکیل صاحب کے متعلق یہ خبر مشہور ہوئی ہے کہ کوئی عالم دین کا سرمایہ علم وفضل اور دولت صبر وقرار اور آلات کاروبار لوٹ لے گیا ہے، تفصیل مال مسروقہ کی یہ ہے۔

ڈگری بی اے کی، ایک ایل ایل بی کی، ایک کریکٹر سرٹیفکیٹ بدیں مضمون کہ حامل سرٹیفکیٹ ہذا کبھی جیل نہیں گیا، اس پر ہر قسم کے مقدمے چلے لیکن یہ ہمیشہ بری ہوا، وکیل صاحب نے اعلان کیا ہے کہ یہ صاحب غلطی سے میری الماری کا تالا توڑ کر یہ سرٹیفکیٹ لے گئے ہوں یا سہواً خود ان کے پاس چلے گئے ہوں، وہ براہ کرم واپس کر دیں، ان کو کچھ نہیں کہا جائے گا، اگر کوئی اور صاحب اس نابکار چور کو پکڑ کر لائیں تو خرچہ آمد و رفت بھی پیش کیا جائے گا، حلیہ یہ ہے، چور کا نہیں، سرٹیفکیٹوں کا کہ ان پر بندے کا نام لکھا ہے، گلشن علی ثمر قندی، سابق سوداگر شکر قندی، مقیم گوالمنڈی، بعض کم فہم ظاہر بین کہیں گے کہ ڈگری سے کیا ہوتا ہے وکیل صاحب! شوق سے کاروبار جاری رکھیں، وکالت علم و عقل بلکہ زبان سے کی جاتی ہے، ڈگری کوئی تعویذ تھوڑا ہی ہے کہ جس کے بازو پر باندھا وہ گونگا بھی ہے تو پٹ پٹ بولنے لگا، فصاحت کے بتاشے کھولنے لگا، لیکن ہماری سنیے تو ڈگری اور عہدہ دونوں کام کی چیزیں ہیں، بلکہ علم اور لیاقت کا نعم البدل ہیں۔

آناں راکہ ایں دہند ان نہ دہند

تم نے منصب دار لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ بظاہر بے علم معلوم ہوتے ہیں، لیکن وقت آنے پر اب اور آرٹ کے اسرار و عوامض پر ایسی مدبرانہ گفتگو کرتے ہیں کہ داناں اندراں حیراں بماند، جتنا بڑا عہدہ دار ہوگا، اتنی ہی اونچی بات کرے گا، نیچے والوں کو خاطر میں نہ لائے گا، ڈگری کو بھی ہم نے اسی طرح لوگوں کے سر چڑھ کر بولتے دیکھا۔

ایک ہمارے مہربان ہیں اردو زبان وادب کے پروفیسر، ایک روز دست نگر کو دست نگر پڑھ رہے تھے اور استفادہ حاصل کرنا بول رہے تھے ہم نے بڑے ادب سے ٹوکا، لیکن وہ بگھر گئے اور پوچھنے لگے۔

''کتنا پڑھے لکھے ہو تم؟''

ہم نے کہا۔

''کچھ بھی نہیں، بس حرف شناس ہیں، الف ب آتی ہے، گنتی بھی لکھ لیتے ہیں۔'' اس پر وہ اندر سے فریم شدہ چوکھٹے اٹھا لائے، ان پر ایک ڈگری ایم اے کی تھی، دوسری پی ایچ ڈی کی، بولے۔

''اب کہو تمہارا کہا سند ہے یہ ہمارا فرمایا ہوا؟'' اس دن پہلی بار ہمیں اپنی غلطی معلوم ہوئی، اب ہم بھی ریڈیو اور ٹیلی ویژن والوں کی طرح دست نگر، چشم دیدہ دم زدن اور استفادہ حاصل کرتے ہی بولتے اور لکھتے ہیں۔

ڈگری اور سرٹیفکیٹ کا چلن پرانے زمانے میں اتنا نہ تھا جیسا آج کل ہے، اس زمانے کے لوگ بیمار بھی سرٹیفکیٹ کے بغیر ہو جایا کرتے تھے

اور بعض اوقات تو شدت مرض سے مر بھی جایا کرتے تھے، اب کسی کی علالت کو خواہ سامنے پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہو، بلا سرٹیفکیٹ کے ماننا قانون کے خلاف ہے، پرانے زمانے میں لوگوں کے اخلاق بھی بلا سرٹیفکیٹ کے شائستہ ہوا کرتے تھے، اب جس کے پاس کریکٹر سرٹیفکیٹ نہیں، سمجھو کہ اس کا کچھ اخلاق نہیں، اس کی نیک چلنی مشتبہ، اب تو مرنے جینے کا انحصار بھی سرٹیفکیٹ پر ہے، سانس کی آمد و رفعت شدید نہیں، آپ نے اس شخص کا قصہ سنا ہوگا، جو خزانے سے پنشن لینے گیا تھا، جون کی پنشن تو اسے مل گئی، کیونکہ اس ماہ کے متعلق اس کے پاس بقید حیات ہونے کا سرٹیفکیٹ تھا، لیکن مئی کی پنشن روک لی گئی کہ جب مئی میں زندہ ہونے کا سرٹیفکیٹ لاؤ گے، تب ادا کی جائے گی، اصول، اصول ہے، اس منطق سے تھوڑا ہی توڑا جا سکتا ہے کہ، جو شخص جون میں زندہ ہے اس کے مئی میں بھی زندہ ہونے کا غالب امکان ہے، باقاعدہ سرٹیفکیٹ ہونا چاہیے۔

عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کند......

وکیلوں کے لئے بے شک ڈگری کی پابندی ہے اسی لئے وہ ڈگری چوری ہو جانے پر پریشان اور بے بس ہو جاتے ہیں، لیکن موکلوں اور گواہوں کو ان کے بغیر ہی ایسی لیاقت پیدا کرتے دیکھا ہے کہ ڈگری والا تیری قدرت کا تماشا دیکھے، آپ نے ان میر صاحب کا ذکر سنا ہے جو ہاتھ میں چھڑی لئے پھندنے دار ٹوپی پہنے، بغل میں بستہ مارے کچہری کے احاطے میں گھومتے رہتے تھے کہ اگر لکھوائے کوئی ان کو خط تو ہم سے لکھوائے یعنی...... مناسب معاوضے پر گواہی دے کر حاجت مندوں کے آڑے وقت کام آتے تھے۔

ایک روز کی بات ہے کہ کوئی جائیداد کا مقدمہ عدالت میں تھا، مدعی کا وکیل تیار نہ تھا، اسے پوری امید تھی کہ آتے ہی تاریخ لے لے گا، لیکن مجسٹریٹ نے جانے کیوں اصرار کیا کہ سماعت آج ہی ہوگی، گواہ پیش کیے جائیں، ورنہ یک طرفہ ڈگری دیتا ہوں، وکیل صاحب بوکھلائے ہوئے باہر نکلے کہ میر صاحب دکھائی دیے، ان کی جان میں جان آئی، فوراً انہیں بازو سے پکڑ کر اندر لے گئے، مقدمہ سمجھنے سمجھانے کا وقت ہی نہ تھا، بس اتنی بھنک کان میں پڑی کہ کوئی خان بہادر رضا علی مر گئے ہیں، ان کی جائیداد کا قصہ ہے، یہ کون تھے، کیا تھے، جھگڑا کیا ہے، کچھ معلوم نہ ہو سکا، بہر حال پیش ہو گئے اور حلف اٹھا کٹہرے میں کھڑے ہو گئے، وکیل مخالف کو معلوم تھا کہ...... یہ بھاڑے کے ٹٹو ہیں، ابھی ان کے قدم اکھاڑوں گا، جرح...... شروع کر دی۔

میر صاحب نے فرمایا۔

''اجی جاننا کیا معنی...... دانت کاٹی روٹی تھی، بڑی خوبیوں کے آدمی تھے، خدا مغفرت کرے، ان کی صورت ہمہ وقت آنکھوں کے آگے پھرتی ہے۔''

''کیا عمر تھی ان کی؟''

''بس چالیس اور اسی کے دوران ہوں گے، بدن چور تھے اسی لئے صحیح اندازہ آج تک کوئی نہیں لگا سکا۔''

''اچھا یہ بتایئے کہ وہ لانبے تھے یا ناٹے۔''

میر صاحب نے کہا۔

''خوب لانبا قد تھا، لیکن ازراہ خاکساری جھک کے چلتے تھے، اس لئے ناٹے معلوم ہوتے تھے۔''

وکیل نے دوسرا سوال داغا۔

''ان کی رنگت تو آپ بتا ہی سکتے ہیں،

گورے تھے یا کالے؟"

میر صاحب نے کہا۔

"خوب سرخ و سفید رنگت تھی، لیکن بیماری کے باعث جلد سنولا جاتی تھی تو کالے نظر آنے لگتے تھے۔"

وکیل نے ایک اور وار کیا۔

"یہ بتائیے کہ داڑھی مونچھ رکھتے تھے یا صفا چٹ تھے؟"

میر صاحب ہنسے اور کہا۔

"مرحوم کی طبیعت عجب باغ و بہار تھی، کبھی جی میں آیا تو مونچھیں رکھ لیں، وہ بھی کبھی پتلی، کبھی گچھے دار، داڑھی بھی چھوڑ دیتے تھے، خشخشی کبھی یک مشت، کبھی یہ لمبی ناف تک اور پھر ترنگ آئی تو سب کچھ منڈا صفا چٹ ہو جاتے تھے۔"

"اچھا داڑھی آپ نے ان کی دیکھی ہوگی، سفید سفید ہوتی تھی یا کالی؟"

میر صاحب نے کہا۔

"ویسے تو سفید ہی ہوتی تھی لیکن جب خضاب لگا لیتے تھے تو بالکل کالی نظر آتی تھی، ان کی طبیعت ایک رنگ پر نہیں تھی، وکیل صاحب! کہہ دیا نا کہ باغ و بہار آدمی تھے۔"

وکیل صاحب نے کہا۔

"اچھا یہ فرمائیے کہ ان کا انتقال کس مرض میں ہوا۔"

میری صاحب نے ایک لمبی آہ بھری اور کہا۔

"رونا تو یہی ہے کہ آخر تک کچھ تحقیق نہ ہوئی، ڈاکٹر کہتے تھے، حکیم کچھ، مرگ چو آید طبیب ابلہ شود، ہم تو یہی کہیں گے کہ ان کو مرض الموت تھا ہائے! کیسی نورانی صورت تھی ہمارے خان بہادر صاحب کی، ان کی یاد آتی ہے تو سینے میں تیر سا لگتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ڈس ڈس رونے بھی لگے۔

مجسٹریٹ نے کہا۔

"اچھا اب دوسرے مقدمے کی باری ہے، اگلی بدھ کو دوسرے گواہان پیش ہوں۔"

☆☆☆

☆☆☆

ایک دعا حنا کے ساتھ

مہمان سونیا چوہدری

ابتداء اس پاک ذات کے نام سے جس کے قبضہ قدرت میں اس کائنات کا تصرف ہے۔

جو اول سے پہلے بھی اول تھا جو آخر کے بعد بھی آخر ہے، عطا کرنے والے نے اوقات سے بڑھ کر عطا کیا اور اس کی عطا کردہ تمام تر نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے اور فوزیہ آپی کی بھر پور محبت کو مدنظر رکھتے ہوئے آج آپ سب کی خدمت میں حاضر ہوں۔

السلام علیکم!

یہ میرے لکھے گئے الفاظ نہیں مگر ہر بار پڑھنے کے بعد مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرے ہی لئے تحریر کیے گئے ہیں۔

بہت مشکل ہوتا ہے اپنی ذات کو بیان کرنا، اگر کسی کے بارے میں لکھنا ہو تو ایک جملہ بھی کافی ہوتا ہے، مگر انسان خود کو اتنی آسانی سے جج نہیں کر سکتا۔

میں کبھی دھوپ ہوں تو کبھی چھاؤں، کبھی بہت تھوڑے میں خوش اور کبھی سب کچھ پا لینے کے باوجود بھی اداس، کبھی انتہائی خود غرض اور کبھی دوسروں کے لئے سب وار دینے والی۔

کبھی اس قدر حساس کہ معمولی بات پر گھنٹوں رونا اور کبھی بڑی سے بڑی بات پہ یہ کہنا کہ یہ بھی کوئی بات ہے؟ کبھی اس قدر انا والی کہ چھوٹی سی بات پر سالوں رنجیدہ رہنا اور قطع تعلق کر لینا اور کبھی بڑی سے بڑی بات کو چٹکیوں میں اڑا دینا، کبھی دل چاہتا ہے۔ کہ میرے اردگرد بہت سے لوگ ہوں اور کبھی سب سے چھپ جانے کو دل کرتا ہے۔

کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے پر کبھی اچھی سے اچھی کتاب بھی پڑھے بنا واپس رکھ دیتی ہوں، بہت لاپرواہ ہوں پر ذمہ داری نبھانا جانتی ہوں۔

ہاں ایک چیز مستقل ہے کہ بارش، پھول، بادل، تتلی، چاند ڈھلتا سورج در حقیقت فطرت کے تمام نظارے بہت اچھے لگتے ہیں، پر کبھی کبھی نہیں بھی لگتے جب موڈ سیٹ نہ ہو، دراصل مجھے خود بھی نہیں پتہ میں کیسی ہوں تو پھر آپ لوگوں کو کیسے بتاؤں کہ میں ایسی ہوں۔

اف کچھ زیادہ نہیں ہو گیا، چلیں کوئی بات نہیں آج کچھ دیر کے لئے مجھے بھی برداشت کر لیجئے اور اگر آپ لوگ بور نہ ہوئے ہوں تو اب تھوڑا میری روٹین کے بارے میں بھی جان لیں، میری صبح کا آغاز بہت جلد ہوتا ہے، دل نہ چاہنے کے باوجود بھی میں جلدی ہی جاگ جاتی ہوں کیونکہ جناب میں اسکول میں جاب بھی کرتی ہوں، اسکول میں سارا دن بہت بزی گزرتا ہے وہاں سے واپسی کے بعد گھر آ کر موڈ ہوا تو لنچ کیا ورنہ یونہی سو گئی، کیونکہ کھانے کے معاملے میں میں بہت لاپرواہ سی ہوں سو کر اٹھنے کے بعد میں شام کی چائے اپنی امو کے ساتھ لازمی پیتی ہوں کہ چائے بھی تو باذوق بندوں کا مشغلہ ہے بھئی۔

کوکنگ میری امو ہی کرتی ہیں، ایسا نہیں ہے کہ میں بالکل ہی نکمی ہوں، مجھے کھانا بنانا بھی آتا ہے، بس لاڈلی ہونے کی وجہ سے ذرا ناز

نخرے اٹھواتی ہوں اور بس پھر ایسے ہی دن گزر جاتا ہے، ٹی وی دیکھنے کا مجھے بالکل بھی شوق نہیں، ٹی وی کا ٹائم میں کتابوں کو دیتی ہوں کہ مجھے کتابیں اکٹھی کرنا اور پڑھنا بہت اچھا لگتا ہے۔

اور اب بات ہو جائے کچھ میرے لکھنے کے حوالے سے رائٹر بننے کا شوق مجھے بہت پہلے سے تھا، میں جب بھی کوئی کہانی پڑھتی تھی تو میرے ذہن میں خود کی کہانیاں ابھرنے لگتی تھیں، لیکن میں نے کبھی سنجیدگی سے اس بارے میں نہیں سوچا تھا، ایک بار یونہی ایک افسانہ لکھا تو اپنی ایک محترمہ دوست جن کا ذکر یہاں میں لازمی کرنا چاہوں گی عالیہ وسیم جنہوں نے مجھے کہا میں لکھ سکتی ہوں، مجھے کسی جگہ ضرور کوشش کرنی چاہیے، اس کے علاوہ میری والدہ بھی مجھے بہت اسپورٹ کرتی ہیں، میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے اتنے اچھے ہر قدم پہ ساتھ دینے والے والدین ملے، اتنی سلجھی ہوئی سمجھدار عالیہ جیسی دوست ملیں، جبکہ اسراء نے میری زندگی میں آکر چار چاند لگا دیئے، اسراء اور کائنات بھی میری وہ فرینڈز ہیں جن سے میں اپنی اسٹوری کے بارے میں ضرور ڈسکس کرتی ہوں، اسراء کی چلبلی حرکتیں بالکل ایسی ہیں جیسے ناول کی کوئی دیوانی سی لڑکی کی سی ہوں۔

ہاں جی تو یہ وہ فرینڈز تھیں جن کا ذکر کرنا میں ضروری سمجھتی تھی کہ اچھے دوست بھی اچھے نصیب والوں کو ملتے ہیں۔

اس کے علاوہ اکثر فیس بک پر بہت سے ریڈرز پوچھتے ہیں کہ میں اپنی پرسنل لائف کیسے گزارتی ہوں، تو میرا آپ سب کو یہی جواب ہے کہ ہم تمام رائٹرز بھی آپ ہی کی طرح عام سے انسان ہیں۔

اف آپ لوگ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ کتنا بولتی ہوں میں تو جناب ایسی کوئی بات نہیں، آج بس آپ لوگوں کی خاطر ہے یہ انداز بیان بھی۔

آخر میں، میں ایک بات لازمی کہوں گی نہ جانے اللہ پاک نے ہمارے کتنے عیبوں پر پردہ ڈال کر ہم کو یہ عزت بخشی ہے اس رب کائنات کے بعد میں حنا کے تمام ٹیم ممبرز کی شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میں حنا کی فیملی ممبر بن سکوں۔

اجازت لینے سے پہلے اپنے تمام پڑھنے والوں کے نام ایک چھوٹی سی نصیحت، کہتے ہیں کہ۔

مسکراہٹ وہ واحد لباس ہے
جو ہمیشہ فیشن میں رہتا ہے
اس لئے ہمیشہ مسکراتے رہیے اور دوسروں کے لئے مسکراہٹیں بکھیرتے رہیے۔

یہ مت سوچیے کہ آپ لوگوں کی نظر میں کیسے ہیں بلکہ یہ سوچیے کہ آپ اللہ پاک کی نظر میں کیا ہیں کہ اعمالوں کا حساب دکھاؤں پر نہیں نیتوں پر کیا جائے گا۔

دعاؤں میں ضرور یاد رکھیئے گا، اللہ آپ کا اور ہمارا حامی و ناصر ہو، رب کائنات کی بے شمار نعمتیں ہمیشہ ہم پہ برستی رہیں، آمین ثم آمین، اللہ حافظ۔

☆☆☆

دل گزیدہ

اُم مریم

دسویں قسط کا خلاصہ

بالآخر محبت کو فتح نصیب ہوئی اور غانیہ کا ستارہ چمک اٹھا، گاؤں سے تاؤ جی کی بیماری کی اطلاع کے ساتھ اچانک شادی کا اصرار ہوا اور شادی کی تاریخ طے کر دی گئی، غانیہ خواب کی سی کیفیت کے زیر اثر ہنوز غیر یقینی کا شکار ہے، کیا واقعی وہ اتنی خوش قسمت ہے......؟

منیب چوہدری دوسری مرتبہ اس تلخ تجربے سے گزرنے پہ آمادہ نہیں، کوئی راہ فرار نہ پا کر وہ غانیہ سے شادی سے منکر ہونے کا کہتا ہے، غانیہ کی پہلو تہی کو اپنی توہین محسوس کرتا وہ سر تا پا قہر و غضب ہے۔

حمدان ماں کی کمی کا شکار بچہ ماما کی آمد کا سن کر خوش ہے مگر یہ خوشی بہت سے سوالوں کے جواب نہ ملنے پہ ادھورے پن کا شکار ہے۔

اب آپ آگے پڑھیے

صورت حال لمحوں میں تبدیل ہوئی تھی، کچھ کی کچھ ہو گئی تھی، منیب جو اس کی چیخ سن کر ہی حیران پریشان آیا تھا، اسے یوں گرے اور اذیت میں پا کر گہرا سانس بھر کے رہ گیا، غانیہ اس کی بے حسی بھری خاموشی پہ آنکھوں میں آنسو لئے نظریں جھکا گئی۔

"کیسی گر گئی ہو؟"

"پاؤں پھسلا۔" غانیہ بامشکل بول پائی۔

"تو کد کڑے نہ لگایا کرو۔"

اب تو گویا موقع ملا تھا اسے کھل کر برسنے کا، غانیہ کا حلق نمکین پانی سے لبریز ہو گیا، اس بات کا جواب کیا دیتی وہ خود کو سنبھال کر اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ تکلیف کے شدید احساس نے چہرے کے عضلات میں اذیت کا رنگ بکھیر دیا، منہ سے پھر کراہیں بے اختیار پھوٹیں۔

"صبر کرو، اماں کو بلاتا ہوں، وہ سہارا دیں گی تمہیں۔" منیب نے درشتی سے ٹوکا، غانیہ کا دکھ بڑھ گیا، رات وہ اپنے مقصد کے لئے کس حد تک چلا گیا تھا، اب جیسے کوئی تعلق کوئی رشتہ نہیں تھا ان کے درمیان، ہمدردی کا نہ انسانیت کا ہی۔

"زحمت نہ کریں، وہ گھر پہ نہیں ہیں۔" نا چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ نروٹھا پن سمیٹ لایا، منہ پھیر کر آنسو پونچھتے اس نے اس بار تکلیف کی پرواہ نہیں کی اور جیسے تیسے اٹھ گئی، منیب نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا اور قدرے بوکھلا کر اس کی جانب لپک کر آیا تھا۔

"ارے ارے...... دھیان سے بھئی، سنبھل کر، اتنا غصہ نہ دکھاؤ، اگر پھر گر گرا گئیں تو اب کی بار جو ہڈیاں بچ گئیں وہ بھی سلامت نہیں رہیں گی۔"

وہ اسے سہارا دے چکا تھا، بلکہ ایک طرح سے ہاتھوں پہ اٹھا چکا تھا، غانیہ کے تو حواس ہی سلامت نہ رہے، کچھ بولتی بھلا کیا، منیب نے اسے لا کر اندر صوفے پہ بٹھایا خود اس کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھتا ہوا گہرا سانس بھر کے گویا ہوا تھا۔

"کہاں چوٹ لگی بتاؤ۔" غانیہ سے پلکیں نہیں اٹھائی گئیں، اسے دیکھا نہ گیا، کتنی عجیب سی کیفیت تھی، کتنی شرمندہ ہو رہی تھی۔

"کہیں نہیں۔" اس نے گھبرا کر تیزی سے اپنا پیر سمیٹ لیا، اب کے منیب نے اسے بغور دیکھا، یہ گریز یہ ہچکچاہٹ کچھ بھائی نہیں تھی، جبھی سنجیدگی میں اضافہ ہوا، ہونٹ بھینچے اٹھ کھڑا ہو گیا۔

"اب جانے کتنے دن بستر سے نہ اٹھ سکو، کام کون کرے گا۔" غانیہ کا چہرہ ایکدم اتر گیا، رنگت متغیر ہو گئی، تو یہ تشویش کی وجہ تھی، اس کا دل بے تحاشا نمی سمیٹ لایا۔

"فکر نہ کریں، میں کام سے غفلت نہیں برتوں گی، نہ بستر سنبھالنے کا ارادہ ہے۔" وہ اتنا دکھی ہوئی تھی کہ لہجہ تڑخ گیا، تلخ ہو گیا اسے اندازہ ہی نہ ہو سکا تھا جیسے، منیب جیسے اسے بغور دیکھ رہا تھا، دیکھتا رہا اور کاندھے جھٹک کر مبہم سا مسکرایا۔

"پھر کیا سمجھوں کہ یہ سارا کھڑاک مجھ سے بچنے کے لئے پیدا کیا ہے؟" بات گمبھیر تھی، معنی خیز تھی، ہلا دینے والی تھی، وہ بھی دھک سے رہ گئی، دہک سی گئی، اس نے چونک کر دیکھا، منیب متوجہ تھا، جبھی پلکیں لرز کر پھر جھک گئیں، دوبارہ اٹھنے کی ہمت نہ کر سکیں، چہرے پر تمتماہٹ سی پھیل گئی،

وہ اضطراری کیفیت کے زیر اثر ہونٹ چبانے لگی۔
''بتاؤ۔'' ادھر اصرار تھا، ادھر حجاب، وہ پلکوں کے ساتھ سر بھی جھکا گئی۔
''جواب دو غانیہ۔'' جانے کیسے موڈ میں تھا، عجیب اصرار بھرا انداز تھا، جاری تھا۔
''میں ایسی گستاخی کی مرتکب ہونے کا تصور بھی نہیں رکھتی منیب! جن سے محبت کی جائے ان کی اطاعت لازم ہوا کرتی ہے، خدارا ایسا نہ سوچیں آپ۔'' سوچ سوچ کر محتاط انداز میں بولتی وہ لڑکی اپنے اندر کوئی تو ایسا سحر ایسا طلسم رکھتی تھی کہ اس دل گزیدہ شخص کے دل سے سابقہ ہر زخم سے وقتی سہی مگر ٹیس اٹھنے کا احساس ماند پڑتا محسوس ہوا تھا، اب کے وہ کچھ نہیں بولا، کچھ دیر اسے دیکھتا رہا، پھر تیز قدموں سے پلٹ کر باہر چلا گیا، کچھ تاخیر سے لوٹا تو ہاتھ میں گرم دودھ کا گلاس تھا۔
''میں جانتا ہوں تم دودھ نہیں پیتیں مگر اس وقت پی لو، سکون دے گا تمہیں۔'' گلاس بڑھائے وہ اس سے نظریں چار نہیں کر رہا تھا، غانیہ نے تردد نہیں کیا، گلاس تھام لیا، اس کی تسلی کی خاطر ایک آدھ گھونٹ بھی بھرا۔
''سب لوگ کہاں ہیں؟''
''دادی کو بخار تھا، اماں ابا انہیں لے کر گئے ہیں دوائی لینے، یارمن اور......''
''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا، کب کے گئے ہیں وہ لوگ؟'' وہ ایک دم متفکر ہوتا اٹھ کھڑا ہوا، غانیہ نے شاکی نظر اس پر ڈالی تھی۔
''میں دیکھتا ہوں، تم اٹھنا نہیں، دروازہ میں باہر سے لگا کے جاؤں گا۔'' عجلت میں بولتا ہوا وہ اگلے لمحے کمرے سے نکل گیا، غانیہ گہرا سانس بھرتی اپنا پیر ہلا جلا کر دیکھنے لگی، کمر میں پسلی کے نزدیک کھچاؤ سا محسوس ہو رہا تھا، پیر میں تو باقاعدہ درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں، وہ خود سے ہل بھی نہیں سکتی تھی، مگر گزرتا وقت اسے احساس دلا رہا تھا، منیب کو بھی گئے خاص تاخیر ہوئی، آخر یہ لوگ واپس کیوں نہیں آ رہے تھے، اس کا دل عجیب سے واہمے لئے دھڑکنے لگا، باہر ہواؤں کی شوریدہ سری میں اضافہ ہو رہا تھا، کھڑکی زوردار آواز کے ساتھ کھلی وہ ہڑبڑا سی گئی، دھڑ دھڑاتے دل پہ ہاتھ رکھے اس نے کھڑکی کی جانب دیکھا جس کے دونوں پٹ شوریدہ سر ہواؤں کے سامنے سر پٹخ رہے تھے، سیاہ بادل اب گرج گرج کر وقت سے پہلے ہو جانے والی رات کی ہیبت ناکی میں اضافہ کر رہے تھے، اس نے چاہا اٹھ کر کھڑکی بند کر دے مگر دکھتا پیر اس کی اجازت نہ دیتا تھا، دل پہ عجیب ہیبت ناک سا لرزہ طاری تھا، اتنے بڑے گھر میں تنہائی کا احساس وحشت میں مبتلا کر دینے کو کافی، وہ کھڑکی پہ نظر جمائے بیٹھی تھی، برآمدے سے آگے صحن میں لگے لمبے درخت جھک کر جب زمین کو چھوتے تو اسے لگتا ان کی شاخیں کمرے کے اندر تک آ جائیں گی، اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنی شال دبوچ کر اپنے گھٹنے سمیٹ لئے، اس کا دل سینے کے اندر لرز رہا تھا، یہ لرزاہٹ اس وقت بڑھ گئی تھی، جب اس نے اس طوفانی رات کی ہیبت ناکی میں رونے کی آوازیں سنی، ابھی وہ ٹھیک طور سمجھ بھی نہیں پائی تھی کیا ہوا کہ یہ آوازیں اس گھر اس کے دل تک آ گئیں، وہ گھبرا کر اٹھی، مگر کھڑی نہیں ہو سکی، اماں روتے ہوئے اندر آئی تھیں، جو کچھ انہوں نے بتایا، اسے یقین نہیں آ سکا، اسے یقین نہیں آ سکا کہ دادی جو اچھی بھلی دوائی لینے گئی تھیں، اپنے پیروں پہ چل کر واپس نہیں

آئیں، دادی ان سب کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے چلی گئی تھیں۔

☆☆☆

اسے کہو اک نظر دیکھ لے
شاید کہ میں مرنے والا ہوں

اور مرنا بھی آسان نہیں تھا، وہ پھر بچ گئی، اس کی اس حالت پہ روتے تھے، وہ اپنے بچ جانے پہ فریاد کناں تھی، آنسو بہاتے نہ تھکتی تھی، کیسی شوریدہ سری تھی جذبات میں دل بربادی پہ تلا تھا، اکسا ہوا تھا، بس اک موہوم سی امید تھی، شاید۔

وہ نرم دل ہے بجھانے کے لئے آئے گا
کیا ہی اچھا ہو اگر آگ لگا دوں خود کو

مگر اس نے یہ بھی کر کے دیکھ لیا، وہ آیا تو تھا، مگر کیسا ستم گر تھا، اسے جلتا چھوڑ کر رخ موڑ کر چلا گیا، اسے تو یقین ہی نہ آتا تھا، ایسا بھی کر سکتا ہے وہ، مگر وہ کر چکا تھا، کر گزرا تھا، اب پھر جینے کی آس کیا تھی، جواز کیا تھا، وجہ کیا تھی، نہیں تھی، ہونی بھی نہیں چاہیے تھی، مگر وہ زندہ تھی، سانسیں گھسیٹتی تھی، مرنے پہ قادر نہ تھی، جینا چاہتی نہ تھی، زندگی کیسی تھی، ویسی ہی تھی جیسی اس ہیرے جیسے انسان کے بغیر اسے کھو کر ہو سکتی تھی، حلقوم میں پیاس نے کانٹے ڈال دیئے اور روح جلتی تھی۔

اس نے تکیے پہ بے چینی سے سر پٹخا اسے یاد آیا وہ ذرا ذرا سی بات پہ طوفان اٹھا دیا کرتی تھی، اب اس عظیم نقصان پہ کیسے لاچار ہو چلی تھی، اسے پھر یاد آیا، اس نے اک بار ایسی ہی معمولی بات پہ کیسے سلیمان پہ گرفت کر لی تھی۔

''میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ یوں لڑکیاں ابھی تک آپ پہ فدا ہوں۔'' وہ کیسے ناز سے بسورا کرتی تھی، عورت ناز سے گندھی ہے اور منوائے جانے کا حق رکھتی ہے اور اسے بہت پیار سے منایا بھی جاتا رہا تھا، جبھی تو وہ لاکھوں دلوں کی دھڑکن کا باعث شخص مسکرا دیا تھا، بہت بے ساختہ مسکان تھی اس شا کی انداز پہ۔

''تو کس نے کہا ہے کرو۔'' سلیمان کا لہجہ خوب صورت جذبات سے بھیگ گیا تھا، نظروں میں کتنی چاہت تھی، کہ وہ خود پہ فخر کر سکتی، خود پہ نازاں ہو جاتی، وہ یک ٹک بجن کو دیکھتی تھی، یار پر فدا ہوتی تھی اور بے ساختہ گنگنا اٹھی تھی، مچل گئی تھی۔

ہے آپ کے ہونٹوں پہ جو یہ مسکان وغیرہ
قربان گئے اس پہ دل و جان وغیرہ

سلیمان اس کے اس خالص ادبی تعریف پہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا، کتنا حیران نظر آیا تھا۔

''تم......'' وہ ایک دم ہنسا، یہ ہنسی بہت دلفریب تھی، اتنی کہ وہ مرمٹی تھی اس ہنسی پہ۔

''تمہیں یہ شعر کیسے یاد ہو گئے؟''

''سب آپ کی محبت کا اعجاز ہے صاحب!'' جواباً اس کی عاجزی میں بھی غرور تھا، فخر تھا، ناز تھا، سلیمان پھر سے ہنسنے لگا۔

''بالکل بدل گئی ہو، لگتا ہی نہیں ہے وہی فرنگی لڑکی ہو۔'' وہ جواباً اسے چھیڑ رہا تھا، دونوں

جانتے تھے، ایسا کیوں کہا ہے اس نے، پہلی بار جب جذبات سے مغلوب ہوتے اس نے سلیمان سے اپنے دل کی کیفیت کہی اور شادی کا مطالبہ کیا تھا تو سلیمان کے الفاظ یہی تھے۔

''میں اک غیر مسلم فرنگی لڑکی سے شادی کا کوئی تصور نہیں رکھتا۔''

دروازے پہ کھٹکا ہوا اور یادوں کا یہ حسین طلسم بکھر کر اسے بھی بکھیر کر رکھ گیا، وہ جو یادوں کی پرخار راہ کی مسافر تھی، ایسی پرخار راہ کی جہاں نیندیں زخم زخم ہو کر گم ہو جاتی تھیں، ان لیرو لیر نیندوں کے ساتھ دن سے رات کرنا رات سے دن کرنا دشوار کار تھا، یادوں کی محفل محبوب کی جدائی کا ستم ہر دم رستا زخم اور اکیلی جان۔

تب ہی دروازہ کھلا اور ڈیڈ کو آتے دیکھ کر اسے ہلکی سی ناگواری ہوئی، انہیں اس کا یہ ماتم کناں انداز پسند جو نہیں آتا تھا، مگر اب کے بولے تو لہجہ پست تھا۔

''اب بس کر دو اس سلسلے کو پلیز، تمہاری زندگی صرف اسی کے لئے نہیں تھی، اس پہ کچھ نہ کچھ ہمارا بھی حق ہے، اگر تم سمجھو۔'' ان کا لہجہ پست ضرور تھا، مگر تلخ بھی تھا، اس نے خفا مگر بے حد دکھی نظروں سے انہیں دیکھا۔

''آپ اپنی تصحیح کر لیں، میری زندگی کے ساتھ چلے گا یہ سلسلہ، موت کے بعد ہی ختم ہو گا، بی کوز واقعی میری زندگی صرف اسی کے لئے تھی، اس کے نام رہے گی۔''

وہ بھی ان ہی کی بیٹی تھی، تلخ ہوتی تو رج کے ہوتی، خون کا اثر گہرا نظر آنے لگتا، ڈیڈ کچھ نہ بولے، دکھ ان کی آنکھوں سے چھلکتا رہا بس، زندگی بھر کی جمع پونجی داؤ پہ جا لگی تھی، بے بسی کا عالم انوکھا تھا، وہ مگر ان کے دکھ کو نہیں سمجھ سکی حالانکہ خود سب سے بڑا دکھ جھولی میں ڈال بیٹھی تھی، شاید جبھی اپنے دکھ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا، مگر محبت نے ان کی بیٹی سے ساری تمکنت چھین لی، وہ شاہ سے فقیر ہو گئی، منگتی ہو گئی، دیوی سے داسی ہو گئی، انہوں نے صبر کر لیا، جبر کر لیا، قبول بھی کر لیا۔

مگر اب وہ زندگی کو نفرت سے دیکھتی تھی، زندگی کو ٹھوکر مارتی تھی، تو ان سے کیسے برداشت ہوتا، اس اک شخص کے نہ ہونے سے ان کی بیٹی کو اور کچھ بھی نہیں چاہیے تھا...... جیسے یہ کیا بات تھی بھلا؟ یہ کیا طریقہ ہوا، وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے، شاید محبت نہ کرتے تھے اس لئے،...... شاید روگی نہ ہوئے تھے جبھی۔

انہوں نے اک نظر بیٹی پہ ڈالی، جو ہر گزرتے دن کے ساتھ زندگی سے دور ہوتی جاتی تھی، پھر اک نظر اس کے کمرے پہ ڈالی، جہاں جنت کو سمانے کی اپنی سی کوشش انہوں نے پوری کر ڈالی تھی، کمرے میں تین بے حد قیمتی صوفے سیٹ لگے تھے، چھت تک اونچی بڑی بڑی خوب صورت کھڑکیاں تھیں، جن پہ قالین کے ہمرنگ ویلوٹ کے بھاری پردے پڑے تھے، کمرے میں روشنی باہر کی نسبت بہت کم تھی، یہ نیم تاریکی سکون کا باعث تھی مگر انہیں یہ موت کی سی مایوس کن اور سرد لگی تو گھبراہٹ زدہ وحشت سے آگے بڑھ کر پردے سمیٹنے لگے، جبکہ اس کے سامنے اس نیم تاریکی میں ہی یادیں بکھری پڑی تھیں۔

سامنے بیڈ پہ وہ تھی اور اس کا شبنمی حسن، میرون اور ڈیپ ریڈ کلر کے بے حد خوبصورت سوٹ میں وہ شعلہ جوالہ سب سے منفرد نظر آ رہی تھی، اسے پورا یقین تھا سلیمان نے اپنی زندگی میں اس

سے بڑھ کر حسن کہیں مجسم نہ دیکھا ہوگا، وہ دل لگا کر تیار ہوئی تھی، پورا یقین تھا یار بات نہیں ٹالے گا، دوسری طرف وہ تھا، یار، سجناور اس کا صاحب، اپنی جان لیوا خوبروئی کے ساتھ اسے مارے ڈالتا ہوا، قامت ایسی دراز کہ سب اس کے سامنے ہیچ لگیں، شانے مضبوط اور چوڑے تھے، فراغ سینہ جس پہ سر رکھنے کی تمنا نے اسے دنیا بھلا رکھی تھی، آنکھوں میں چیتے کی سی چمک جو اس کے خوب صورت پر جمال چہرے کا خاصا تھی۔

"یہ دیکھیں صاحب، اس محل نما گھر کو، اس جنت کو، اسے کیسے چھوڑ دوں؟ پھر کیوں؟ جبکہ دوسری جگہ ایسا کچھ بھی نہیں، خود فیصلہ کرلیں اور آپ بہت منصف، بہت دیانت دار ہیں، مجھے معلوم ہے۔"

وہ مسکرا رہی تھی، ملتجی بھی تھی، سلیمان نے اک نظر اسے دیکھا تھا، اس نظر میں کتنی سنجیدگی تھی، یہ اس وقت وہ جان ہی نہ سکی، سمجھ ہی نہ سکی، ورنہ اک لحہ نہ لگاتی ضد چھوڑنے میں، دستبردار ہونے میں، یار سے دوری یار سے دستبرداری کا تو تصور بھی محال تھا، اگر وہ نہ سمجھی، تو سمجھا سلیمان بھی نہ، اور یوں جدائی کا فاسق وار چل گیا، ہجر سسکتا ہوا اس کی جھولی میں دائمی آن گرا اور وہ پھٹی آنکھیں خالی ڈھنڈورا دل لئے سکتہ زدہ بیٹھی رہ گئی، حواس سلامت نہ رہے، دل قابو میں نہ رہا، آنکھیں پتھرا گئیں، وہ پاگل ہوگئی، موت کے پیچھے بھاگتی پھری، مگر نقصان کی شدت کو کم نہ کرسکی، وہ اسے کیسے یقین دلاتی وہ اس کے بغیر نہیں جی سکتی، وہ اسے کیسے سمجھاتی اسے اپنے حساب سے بڑھ کر آسائشیں اور دولت وسہولت یا سکون عزیز نہیں ہے، وہ اسے نہیں سمجھا سکتی تھی، وہ اسے نہیں بتا سکی کہ۔

بہت خاموشی سے ٹوٹ گیا
وہ ایک مان
جو تم پہ تھا

وہ سسکیوں سے ہچکیوں سے رو رہی تھی، اس کا وجود تشنج زدہ مریض کی مانند لرزتا تھا، ڈیڈ کی اسے دیکھتی نگاہوں میں دکھ مایوسی اور اذیت بڑھنے لگی، کچھ کہے بنا وہ خاموشی سے باہر نکل گئے تھے، انہوں نے سوچا تھا، اس فیز سے اسے نکالنے کے لئے وہ زبردستی اس کی کہیں اور شادی کرا دیں گے، مگر اب انہیں یہ بھی ناممکن لگ رہا تھا، وہ زبردستی نہیں کر سکتے تھے، یعنی اب اس پہ ہر خوشی کا دروازہ بند تھا، ہر طرف اندھیرا تھا اور یہ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی، انہیں یاد تھا، انہوں نے اسے سمجھایا تھا۔

"جو ہو چکا جیسے بھی ہو چکا، اب اس پہ سمجھوتے کے سوا چارہ نہیں، تم اس حقیقت کو جتنی جلدی سمجھ لو اتنا تمہارے حق میں بہتر ہوگا، بیٹے اگر تم زندگی کے اس دکھ پہ ایسے ہی ٹوٹ کر روتی رہوگی، یونہی بکھرتی رہوگی، تو کوئی بھی تمہیں سمیٹنے نہیں آئے گا، وہ تو خاص طور پہ نہیں جس کے یکلخت فیصلے نے تمہیں ہرے بھرے شجر سے ایسے مٹی کی ڈھیری کر دیا، اتنا سلین زدہ کر دیا، تم یونہی روتی رہی خود کو نہ سنبھالا تو اک دن کرچی کرچی بکھر جاؤ گی، پھر جتنا زیادہ بکھرو گی، اتنا ہی زیادہ تمہیں خود کو سمیٹنے میں وقت لگے گا اور ممکن ہے کہ جب تک تم خود کو سمیٹ کر اٹھو تو بہت پیچھے رہ جاؤ اپنے ساتھ

چلنے والوں سے اور یہ ساتھ چلنے والے ان فاصلوں کے باعث تمہاری آواز سننے سے بھی قاصر رہیں۔'' ان کا انداز ناصحانہ تھا، محبت آمیز فکرمندی سے لبریز تھا، مگر اسے اچھا لگا نہ اس کے اندر کوئی امید جگا سکا، کوئی تحریک پیدا کرسکا، اس کی آنکھوں میں اتنی ہی مایوسی اور دکھ تھا جتنا اس بات کو سننے سے قبل وہ دیکھ چکے تھے۔

''کچھ تو بولو بیٹے، پلیز۔'' وہ ملتجی ہوئے، آواز بھرا گئی، حالانکہ وہ گواہ تھی، اس کے ڈیڈ کیسے بہادر جابر اور سفاک تھے، مگر بیٹی کے سامنے ہارے ہوئے لگتے تھے، کتنے دکھی نظر آتے تھے، جھکی ہوئی تو وہ بھی کم نہ تھی، دکھی تو اس سے بھی زیادہ کوئی نہ ہوا ہوگا، جبھی تو آنسو پھر سے ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی بے خواب بوجھل پلکوں سے گرنے لگے تھے۔

''جس کے ساتھ چلنے کی تمنا تھی جب اس کا ساتھ چھوٹ گیا ہے ڈیڈ تو اب کسی کو پکارنے کی خواہش اندر نہیں ہے، خود کو سمیٹنا اور خود کو بچانا تو اب احمقانہ بات لگتی ہے محض......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر ضبط گنواتی بلکنے لگی۔

''زندگی جینے کا باعث صرف سلیمان ہی تو نہیں تھا، ایزد اسی کا بیٹا اسی کی نشانی ہے تمہارے پاس، اسی کی خاطر خود کو سنبھال لو بیٹے۔'' انہوں نے کتنی بے بسی سے اس کا دھیان بٹانے کی سعی کی، جو بٹتا ہی نہ تھا، جو اس ایک مرکز سے ہٹتا ہی نہ تھا۔

''کوئی بھی سلیمان کی جگہ نہیں لے سکتا ہے ڈیڈ، چاہے وہ انہی کا بیٹا ہو، مجھے زندگی جینے کے لئے صرف صاحب چاہیے، صرف سلیمان واپس چاہیے، مجھے ایک بار پھر سے سلیمان دے دیں ڈیڈ، اس بار کوتاہی نہیں ہوگی، وعدہ کرتی ہوں، انہیں آپ سمجھائیں، وہ میری نہیں سنتے، انہیں آپ منائیں پلیز وہ مجھ سے نہیں مانتے، ایک بار، صرف ایک بار ڈیڈ!'' وہ پھر سے حواسوں سے باہر ہونے لگی، اس کی سانسیں پھر سے اکھڑنے لگیں، ڈیڈ گھبرا گئے، اسے سنبھالنے لگے، مگر اب یہی سب سے مشکل کام تھا، سب سے دشوار کام تھا، گویا ناممکن تھا یہ سب۔

☆☆☆

گہری ہوتی شام کے کہیں منظر میں ننھی چڑیا کی چوں چاں نے ارتعاش سا برپا کر رکھا تھا، اندر کمروں میں بھی خاموشی کا راج تھا، دادی کا چہلم بھی ہوگیا، عورتیں روز ایصال ثواب کے لئے پرسہ کے لئے آتیں، اس وقت مغرب ہونے والی تھی، دونوں وقت مل رہے تھے، ان لمحوں نے فضا کو اداسی کی چادر اوڑھا دی تھی، اس نے سر اٹھا کر دیوار پہ بیٹھی چڑیا کو دیکھا، عین اسی پل آسمان پہ پرندوں کا اک غول شور مچاتا اس کے اوپر سے گزر کر عقب میں غائب ہوگیا، سردیاں اپنے عروج پر آ پہنچی تھیں، فروری کی یخ بستہ راتوں میں دھند کے بادل پیڑوں کو اپنی لپیٹ میں لئے رکھتے، صبح کہرے کی باریک تہہ گھاس کی پتیوں پہ جمی ہوتی، درختوں کے پتے زرد ہو ہو کے گھاس پہ ڈھیر ہونے لگے تھے، جھڑیاں شروع ہوتیں تو ساری رات آسمان سے اک پھوار سی برستی رہتی، فضا میں بارش کی سرگوشیاں خزاں زدہ پتوں کی آواز اور کہرے میں دبی ہوئی مرجھائی ہوئی گھاس کی مہک گھلی ملی تھی، مختلف کاموں میں مصروف رات کو اپنے بستر میں دبکی وہ ایک ہی بات بار بار سوچتی۔

''زندگی اتنی بے اعتبار اور اتنی دکھ دینے والی کیوں ہے؟''

منیب نے اس رات کے بعد دوبارہ بھی اس سے اپنی ضرورت پوری کی تھی اور بس ضرورت ہی پوری کی تھی، کبھی اسے مان عزت یا محبت دینے کا خیال نہیں آسکا تھا، اس شخص کے دل میں وہ ضرورت کی رات ہی اس کے بستر کی زینت بنتی باقی پھر سے اس کا ٹھکانہ صوفے پہ ہوتا، نہ کبھی منیب نے اسے اس کے علاوہ مستقل بستر پہ آنے کا اشارہ کیا نہ اس نے یہ جسارت کرنے کی ہمت اپنے اندر پائی، وہ یہ سوچ کر گھلتی جاتی تھی، زندگی اگر صرف ضرورت کا نام ہے تو محبت کا آفاقی وجود زمین پہ اتارنے کی وجہ آخر کیا تھی۔

سردیوں میں شام اتنی جلدی ہی گہری ہو جاتی ہے جتنی جلدی اس کے دل میں اترنے والی محبت پہ زوال آیا تھا، درختوں کی چوٹیوں پہ گہرے ہوتے اندھیرے کو دیکھتے اس نے دانستہ اپنا دھیان بٹانا چاہا، صحن سے پرے بیرونی دروازے کے پاس پیپل کے درخت کے پاس اندھیرا اتر چکا تھا، موسم آج بھی سرد تھا، آسمان پہ موجود سرمئی بادل گہرے ہوتے جا رہے تھے، انہیں یقیناً رات کو برسنا تھا، ہوا بالکل بند تھی۔

دادی کی وفات پہ صرف پاپا آسکے، مما کی طبیعت ان دنوں ٹھیک نہ تھی، فضہ اور اسد واپس جا چکے تھے، اداسی دل کے اندر مستقل ٹھکانہ کیے بیٹھی تھی، طبیعت بوجھل سی رہتی، ایسے میں اسے خبر ہی نہ ہو سکی اپنے اندر رونما ہونے والی تبدیلیوں کی، حمدان بھی واپس نہیں آسکا، البتہ فون پہ اس سے اکثر بات کیا کرتا۔

پچھلے کئی دنوں سے طبیعت بہت گری گری تھی، اسے خاک سمجھ آتی، ایسے ہی کاموں میں لگی رہتی، اماں کا دھیان بھی آج کل بٹا ہوا تھا، ساس کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا تھا، جدائی کا غم بھی آسانی سے بھلا نہیں پا رہی تھیں، پھر ساس تھی بھی سگی خالہ، زیادہ وقت اب عبادت میں گزارتیں، یہی وجہ تھی کہ غانیہ کی خرابی طبیعت پہ ان کا بھی دھیان نہیں جاسکا، وہ تو اس وقت ایک دم صورتحال تبدیل ہوئی جب حسب معمول صبح ناشتے کی تیاری میں مصروف غانیہ اچھی بھلی کھڑی کام کرتی بالکل اچانک گری اور بے ہوش ہو گئی، گو کہ یہ بے ہوشی کا غلبہ بہت شدید نہیں بلکہ عارضی تھا مگر تشویش کا باعث ضرور ٹھہرا، پاس اماں ہی تھیں، ان کے واویلے پہ ہی اندر کمرے میں تیار ہوتا منیب گھبرا کر بھاگا آیا تھا، اماں تو اپنے حواسوں میں نہیں لگتی تھیں، نیچے گری غانیہ کا سر گود میں رکھے بلند آواز سے روتیں اس شخص کے بھی ہاتھ پیر پھلا کے رکھ گئیں، دادی کی موت کے بعد سے ان کا دل ایک دم سے بہت کمزور ہو گیا تھا، منیب سمجھتا تھا، جبھی کوفت کے باوجود انہیں ٹوکا نہیں۔

''کچھ نہیں ہوا اماں حوصلہ رکھیں۔'' وہ پینٹ پر بنیان پہنے تھا، شرٹ ہاتھ میں پکڑی تھی، جسے پہننے کی نوبت نہیں آسکی۔

''اسے اٹھا، منجی پہ لٹا، سہیل...... سہیلے پتر بھاگ کے جا، ڈاکٹرنی کو تو بلا لا، پتا نہیں کی ہویا میری دھی رانی نوں، اللہ رحم کرنا۔'' اماں مسلسل غانیہ کے ہاتھ سہلا رہی تھیں، منیب اٹھانے منجی پہ لٹانے کے تقاضے پہ اچھا خاصا جز بز ہوا مگر اماں کے سامنے بھلا کہاں چلی، اسے نیم بے ہوش غانیہ کو کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر صحن میں بچھی چارپائی تک لانا پڑا، جو تب تک کسی حد تک حواسوں میں لوٹتی لرزتی پلکوں کے دریچے وا کیے، نقاہت زدہ حیران نظروں سے اس صورت حال کو سمجھنے کی

کوشش کرتی بڑی بے چاری بڑی لاچار محسوس ہوئی مگر اس شخص کو نہیں، جسے اس سے بے تحاشا چڑ محسوس ہو رہی تھی۔

''اگر خود چل سکتی تھیں تو پھر اس سارے ڈرامے کی کیا ضرورت تھی؟ عورت حیا کھو دے تو اس کے پاس کچھ نہیں بچتا، مگر تمہیں ان باتوں کی سمجھ ہوتی تو میں اس مشقت میں پڑتا ہی کیوں۔''

یہ بھلا ممکن تھا کہ وہ جل رہا ہوتا اور اس آگ کی چنگاریاں غانیہ سے محفوظ رکھتا، نہیں یہ ممکن نہیں تھا، غانیہ نے اذیت سے نہیں تھک کر پھر سے آنکھیں بند کر لیں، اسے لگا تھا پھر لگا تھا، اس پتھر دل شخص پہ اس کا ہر جذبہ، ہر احساس بے کار ہے، بے اثر ہے، بے اثر رہے گا۔

''لے دو گھٹ پانی کے پی، تیری سرت ٹکانے آئے، اٹھ میری دھی۔'' اماں گلاس پانی کا بھرے پاس آ گئیں، منیب ہونٹ بھینچے اندر کی جانب بڑھا، سہیل چپل گھسیٹتا اسے پر تشویش متاسفانہ نظروں سے دیکھتا قریب آ گیا۔

''ڈاکٹرنی اتنے سویرے کہاں بیٹھتی ہے اماں؟''

''نہیں بیٹھتی تو اس کے گھر سے بلا لا، یہ بھی کوئی پوچھنے کی گل ہے پاگلا۔'' اماں جھلا گئیں، ایک بیٹے کی بے اعتنائی دوسرے کی بے وقوفی انہیں تاؤ دلا چکی تھی، اب کے سہیل کچھ نہیں بولا یونہی سلیپر گھسیٹتا ہوا باہر چلا گیا، غانیہ کہنا چاہتی تھی نہ جائے وہ ٹھیک ہے مگر شدید نقاہت نے اسے بولنے کی اجازت نہیں دی۔

''میں جاتا ہوں اماں، ناشتا تو گول ہو ہی گیا ہے، ذرا جلدی نکلوں گا تب ہی کچھ حلق سے اترے گا ورنہ ٹائم کی قلت، سارے دن کی بھوک ہڑتال کا باعث ٹھہرے گی۔'' وہ نک سک سے تیار باہر آیا اس پہ خشمگیں تلخ نگاہ ڈالنا نہیں بھولا، لہجہ بھی سراسر شاکی شکایتی اور غصیلا تھا، غانیہ جیسے نڈھال پڑی تھی پڑی رہی، اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اس شخص کی نظروں کو سہہ پاتی، ان نظروں کی شکایت اور دکھ مٹانے کی چاہ میں وہ خود مٹتی جا رہی تھی، ختم ہو رہی تھی۔

''گل سن منیبے! ادھر بیٹھ ذرا۔''

''اماں مجھے دیر......''

''میں نے کہا بیٹھ جا۔'' اماں کے لہجے میں انداز میں یکدم بے تحاشا ناراضگی سختی اور غصہ اترتا محسوس کر کے ہی منیب اپنی جگہ سے آگے قدم نہیں بڑھا سکا، پہلے گردن موڑ کر انہیں دیکھا، وہ بہت سنجیدہ تھیں، بلکہ شاید دکھی، وہ نا چاہتے ہوئے بھی ان کے پاس آیا، رک گیا، سوالیہ نظریں انہی پہ تھیں، غانیہ کو وہ کسی لائق شاید سمجھتا ہی نہ تھا۔

''مجھے لگتا ہے تو باپ بننے والا ہے، پھر سے باپ بننے والا ہے، منیبے...... یاد رکھ پھر سے باپ تو بنے گا، یہ کڑی پہلی بار ہی ماں بننے والی ہوئی ہے، اس کا دکھ اس کی تکلیف اس کی خوشی سب کچھ پہلا ہے، تجربہ بھی پہلا ہے اور تیری وجہ سے ہے، سمجھ رہا ہے کہ اس کا باعث تو ہے، بچی کا خیال رکھنا اس کو سنبھالنا سب سے زیادہ ذمہ داری بھی تیری ہے، شادی کر لینا اور شادی کا بار اٹھانا، دو بالکل الگ باتیں ہیں، جے تو اپنے ابے کی خاطر دیاہ کیا ہے تو ابے کی خاطر اسے نبھاہ وی، میں یہ گل تیرے ساتھ کرنا نہیں چاہتی تھی، پر پتر تو نے مجبور کر دیا ہے، یہ باتیں مجھے منہ سے نکالنے کو، تیرا ابا

تیرے اس سلوک کی وجہ سے بہت پریشان ہے، ان کی شکایتوں میں وارانہ کر۔"

غانیہ جو اس بات کے آغاز کے ساتھ ہی ہونٹ بھینچتی ہوئی چہرے کا رخ پھیر گئی تھی، آنکھوں کی نمی کو کناروں سے پھسل کر گردن تک جانے سے روکنے پہ قادر نہ رہ سکی، منیب نے سلگتی نظروں سے اس منظر کو دیکھا اور درشتی سے اماں کو ٹوک دیا۔

"چلیں بس کریں، ڈاکٹر صاحبہ آرہی ہیں، گھر کے معاملے کسی کے سامنے رکھنا مجھے پسند نہیں۔" اماں نے جواباً اسے بے حد بے بس نظروں سے دیکھا تھا، ڈاکٹر صاحبہ جو کہ ادھیڑ عمر شفیق خاتون تھیں، خود اپنی مرضی سے یہاں ٹرانسفر کروایا ہوا تھا کہ مقصد واقعی خدمت خلق تھا، جبھی ورکنگ آورز کے علاوہ بھی خدمت خلق میں کوشاں مریض کے گھر آنے پہ بھی عار نہیں سمجھتی تھیں، غانیہ کے مکمل چیک اپ میں مصروف رہ کر گہرا سانس بھر کے گویا ہوئی تھیں۔

"بچی پریشنٹ ہے اور کم عمر بھی، ویک نیس بھی حد سے زیادہ ہے، پراپر ڈائٹ اور علاج نہ ملا تو کیس بہت کمپلیکیٹڈ ہو سکتا ہے، خدانخواستہ ماں یا بچے میں سے کسی کی جان بھی جانے کا خدشہ ہے، احتیاط بے حد ضروری ہے، آپ سمجھ رہے ہیں بیرسٹر صاحب، مجھے تو اس بات پہ حیرانی ہے آپ پڑھے لکھے ہو کر بھی اپنی وائف کی زندگی سے کھیل رہے ہیں، انہیں فوری شہر کے ہاسپٹل لے کر جائیں اور ان کا خصوصی خیال رکھیں، سمجھ رہے ہیں آپ؟"

گاؤں بھر کا اکلوتا وکیل ہونے کے باعث یہ نقصان بھی ہوا تھا کہ اسے ہر کوئی جاننے پہچاننے لگا تھا، چاہے وہ نئی نئی یہاں اپائنٹ ہونے والی ڈاکٹر ہی کیوں نہ ہو، منیب کو جی بھر کے کوفت اور بے زاری نے آن لیا، محض سر ہلایا، بولنا ضروری نہیں سمجھا۔

"تو ایسا کر منیب، غانیہ دھی کو جاتا ہوا شہر اپنے ساتھ لے جا، شہر کی ڈاکٹرنی سے دکھانا اسے اور دوائی شوائی لے کے دینے کے بعد اسے اپنے چاچے ول چھوڑ دینا، ادھر رہے گی تے کم سے جان نہیں چھٹے گی اس کی، ماں ماں ای ہوتی ہے، اپنی دھی کو کالجے سے لگا کر رکھے گی، سمجھ رہا ہے؟"

ڈاکٹر صاحبہ کے جانے کے بعد اماں اس کے سر ہوئیں، وہ تو جیسے اس بات کو سنتے ہی سارا ضبط بھول بیٹھا۔

"کیوں؟ ادھر یہ ایسے کون سے ہل جوتتی ہے جو کاموں سے نجات نہیں ملے گی اور اماں کیسی بے تکی بات کہی آپ نے، اپنی بلا دوسروں کے سر ڈالنا عادت نہیں ہے میری، وہ بھی کیا سوچیں گے ہم کیسے لوگ ہیں، ویسے بھی محترمہ کے لئے تو آپ اور ابا بھی والدین سے کم کردار نہیں نبھا رہے محترمہ کے لئے، اسے چارپائی پہ بٹھا دیں اور ادھر ہی خدمت کا شوق پورا کر لیں۔" جھنجھلاہٹ اکتاہٹ بے زاری، وہ تو گویا ان کے گلے پڑ گیا تھا، اماں نے تاسف بھری نگاہ سے بیٹے کو دیکھا اور لب سی لئے، وہ یونہی جھلاتا ہوا گھر سے نکل گیا تھا۔

"مجھے معاف کر دینا میری دھی، ہم تیرے لئے کچھ وی نہیں کر پا رہے۔" اماں آنکھوں کی نمی دوپٹے سے پونچھتی بھرائی آواز میں بولیں تو غانیہ جو ان سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی بے ساختگی میں ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ کر ہونٹوں سے لگاتی آبدیدہ ہو گئی۔

"ایسا کچھ نہ کہیں اماں، پلیز ایسے نہ سوچیں، مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں، پھر آپ لوگ تو

میری سب سے بڑی دعاؤں کا باعث ہیں، پریشان نہ ہوا کریں، منیب بھی بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔" ان کے آنسو عانیہ کے دل پر گرتے تھے گویا، اب کے اماں کچھ نہیں بولیں، یونہی آنسو بہاتی رہیں، عانیہ نے چاہا تھا اٹھ کے ناشتہ لے آئے مگر اماں نے اجازت نہیں دی، اجازت تو یکدم طاری ہو جانے والی نقاہت بھی نہیں دیتی تھی اٹھنے کی، سو لیٹے رہنے کے سوا کچھ چارہ نہ تھا، اماں خود اٹھ کر باقی ماندہ ناشتہ تیار کر کے لائیں تو سہیل کو بھی پکار لیا تھا، جو اندر کمرے میں گھسا جانے کیا کرتا رہا تھا۔

"اٹھ دھی رانی، کچھ کھا لے۔" اماں نے خود اسے سہارا دیا، وہ مزید شرمسار ہو کر رہ گئی۔

"کیا شک کہ میں اور تیرا تایا ابا تیرے مجرم ہیں دھیئے، منیا نہیں مانتا تھا ہم نے ہی اسے مجبور کر ڈالا، اس کی محبت اس کی بربادی نے ہمیں یہ قدم اٹھانے پہ مجبور کیا، پر اب لگتا ہے، غلطی کر بیٹھے ہیں، جرم کر دیا ہے، تیرے ساتھ زیادتی صرف منیا نہیں کرتا، ظلم کرنے والوں میں ہم بھی شامل ہو گئے ہیں، اس لئے معاف کر دے پتری!"

انہیں جانے کیا ہوا، ایکدم سے زار و قطار رو پڑیں، عانیہ کو تو ان کے سوا سب بھول گیا، بوکھلاہٹ سراسیمگی بے قراری، اس کی پریشانی دیکھنے والی تھی جیسے۔

"پلیز اماں! ایسے مت کریں، اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے، ایسی باتیں کر کے مجھے تکلیف نہ دیں پلیز۔" وہ اتنی لجاجت اتنی عاجزی سے گویا تھی، اتنی محبت سے ان کے آنسو پونچھ رہی تھی، کہ کمرے سے نکل کر اس سمت آتے سہیل کو منیب کی قسمت پہ رشک آیا، وفادار نیک محبت کرنے والی عورت تو بڑے نصیب والوں کو ملا کرتی ہے، ویرا کیسا خوش بخت تھا کہ اسے اپنی اس خوش نصیبی کا احساس نہیں تھا اور ایک تو یہ تھا۔

"اماں! بھرجائی کو ناشتہ کرانے کی بجائے آپ نے رلا ڈالا، کر دی ناں ساسوں والی حرکت، روٹی کی بچت کرنا چاہتی ہیں یا کوئی پرانا بدلہ چکا رہی ہیں؟" سہیل نے ٹوکا، انداز ہرگز ملامتی نہیں تھا، شاکی بھی نہیں تھا، اس سے برعکس مزاح کا رنگ لئے ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کا تھا، جبھی دونوں بے ساختہ مسکرا دیں اماں تو کھسیانی بھی ہوئیں۔

"ہٹ پرے، بکواس جیا نہ ہووے تے۔" انہوں نے اسے ایک دھپ لگاتے روٹی کی چنگیر عانیہ کے سامنے کی۔

"کھا میری پتری، ہن میں آپے تیرا خیال رکھوں گی، منیا ہے تو بوت کو ہجا پہ پیارا وی بوت ہے، سانوں کی شک، اس کی اولاد کا بڑا ارمان رہا ہے ہمیشہ ہمیں، اک پتر پہلے ہے، رب جوڑی رلا دے اب تو۔" ان کی باتوں میں انداز میں پھر سے محبت کے سوتے پھوٹنے لگے، عانیہ جھکے سر سے سب سنتی اپنی ہتھیلیوں کو خالی نظروں سے دیکھتی رہی، جہاں گلابی پن کی جگہ پیلاہٹ نے لینی شروع کر دی تھی، گلاب دھیرے دھیرے کہیں مگر مرجھا رہا تھا۔

"اوہ...... پھر...... وہی روایتی سوچ، یعنی بیٹے کی خواہش، حالانکہ پہلے سے موجود ہے پھر بھی، اماں بیٹی کے لئے بھی گنجائش اور خواہش رکھا کریں۔" سہیل مداخلت کیے بغیر نہ رہ سکا، اسے اس عامیانہ سوچ اور طرز عمل سے واقعی اختلاف تھا، اماں نے گھور کر اسے دیکھا۔

"تجھے کس نے کہا کہ گنجائش یا خواہش نہیں ہے، مرضی تو رب سوہنے کی ہی چلتی ہے، پر پتر دھیاں کے نصیں بھاتیں، ہاں ان کے نصیبوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔" غانیہ کو دیکھتی ان کی آنکھیں پھر سے یاسیت سمیٹ لائیں، ثانیہ کا اپنا دل سینے میں لرز گیا تھا، ہاں بچی کی پیدائش اور اس کے نصیب سے ڈر تو اب اسے بھی لگنے لگا تھا، بہت ڈرنے لگی تھی وہ۔

☆☆☆

آخیر سردیوں کی خاموش سی دوپہر تھی، فضا میں ایک عجیب سی اداسی محسوس ہو رہی تھی، وہی اداسی جو کسی موسم کے رخصت ہونے پر درختوں سے لپٹی اور شاخوں سے لٹکنے لگتی ہے، دوپہر اب بھی جلدی ڈھلتی تھی، پرندوں کے آنے جانے کا وقت ایک گھنٹہ ضرور آگے ہو گیا تھا، موذن کی پکار گھنٹہ بھر بعد مسجد کے گنبد سے اٹھتی تھی، آنے والا موسم ابھی دور تھا، مگر ماحول میں ایک موہوم سی اداسی خاموشی کا احساس باقی تھا، وہ لان میں کھڑے املتاس کے پیلے پھولوں سے لدے درختوں کو دیکھ رہا تھا، املتاس کے پیلے پھولوں پر دوپہر کے آخری قدم تھے، اس نے گہرا سانس بھر کے گردن موڑی اور واکر میں ہاتھ مار مار کے ٹھیٹ کلتاریاں مارتی قدر کو دیکھا، جسے وہ روشنی سے تشبیہ دیتا تھا، وہ واقعی روشنی تھی، اس کا اپنا اور ماں کا سانجھا عکس، نور کا منبع، ہاں وہ روشنی کہلائے جانے کی حقدار تھی، اس کے بال سنہرے تھے اور آنکھیں بالکل سیاہ بال مون کے بھی بچپن میں سنہرے ہی تھے، جو وقت کے ساتھ ساتھ رنگ بدلتے جوانی تک بالکل سیاہ رنگ ہو گئے تھے، اس کی گورنس اچھی عورت تھی، بوڑھی تھی مگر مخلص اور خدا ترس تھی، بیٹے نے گھر سے نکال دیا تو مون نے خدا ترسی میں اپنے ہاں پناہ دے دی، حالانکہ آپا نے کتنا احتجاج کیا تھا بنا پرکھ بنا سوچے سمجھے انجان عورت کو گھر میں رکھ لینے پہ مگر مون کسی معاملے میں کب ان کی سن چکا تھا اب تک جواب سنتا، ان کی اتنی لمبی تقریر اور نصیحتوں کے جواب میں بس یہ الفاظ ہی سننے کو میسر آسکے۔

"دنیا دیکھ رکھی ہے آپا، لوگوں کی پرکھ ہے، پریشان نہ ہوں بالکل بے ضرر خاتون ہیں، مجھے تو اماں جان کے جیسے لگیں، آپ کو نہیں لگا ایسا؟"

اور آپا سر تھام کر رہ گئیں، ان کا بھائی جتنا چہرہ حسین رکھتا تھا دل اس سے بڑھ کر پیارا بنایا تھا رب نے مگر قسمت کے معاملے میں جانے کیوں اتنا مات کھا رہ گیا، آپا کو رکھے چوتھا مہینہ تھا، اب تو جیسے وہ گھر کی ہی ایک فرد تھیں، مون ویسے بھی مست اور درویش طبیعت رکھتا تھا، نوکروں کو بھی نوکروں کی حیثیت نہیں دی، ایک خاندان کے افراد جیسا برابری کی سطح پر سلوک روا رکھتا اور تنخواہیں کسی سرکاری ملازم کی طرح پرکشش تھیں، چھوٹی ثانیہ تو صاف کہا کرتی۔

"بھائی جان کے تو ملازم بھی بھائی جان سے زیادہ مالدار ہو گئے ہوں گے۔"

اس میں شک بھی نہیں تھا، ہر سال خود تو تنخواہ میں اضافہ کرتا ہی، کوئی نہ کوئی ملازم اپنی مجبوری کی داستان سنا کر تنخواہ میں اضافہ کا مطالبہ کرتا تو صاحب بغیر کسی رد و کد کے اس کے ساتھ ساتھ باقی کی کھیپ کے بھی اسی دیانت داری سے مول بڑھا دیتے، آپا بولتی رہ جاتیں، مجال ہے کبھی مون نے کان دھر لیا ہو، آخر وہی ہار مانتیں وہی سمجھوتہ بھی کرتیں، یہی تو سب سے بری عادت تھی مون کی، وہ سمجھوتے کا کیپرد، منہ کا عادی نہیں تھا، خود بھی نہ جھکتا تھا، چاہے کتنا ہی نقصان کیوں نہ جھولی
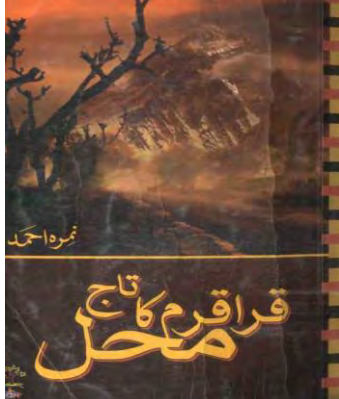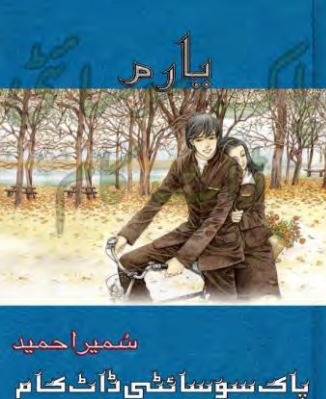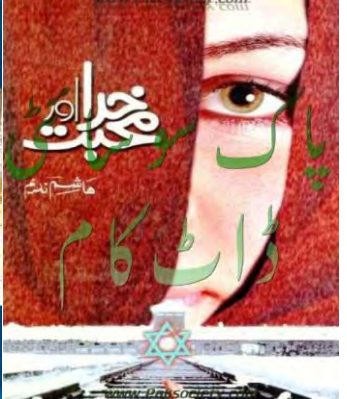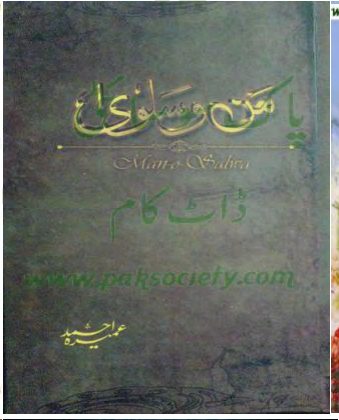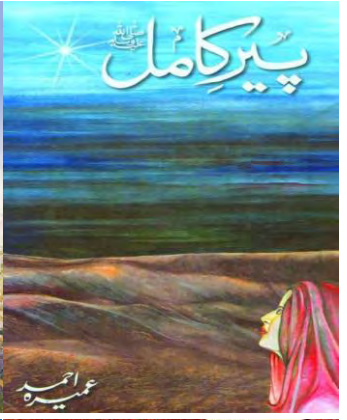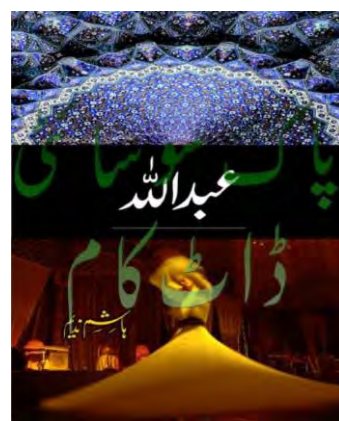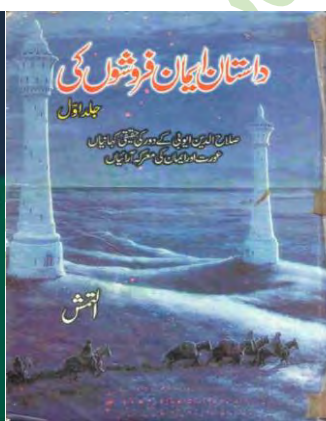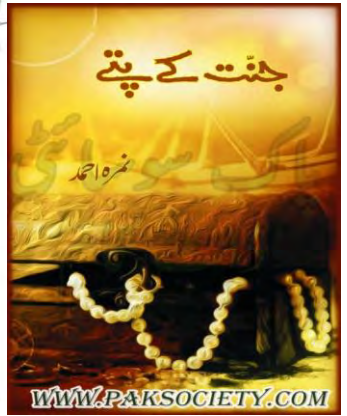
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

میں آن گرتا، ہاں یہ بھی طے تھا کہ وہ کبھی غلط بات غلط چیز کے لئے ضدی نہ ہوا، اس کی اکڑ اس کی جنگ ہمیشہ غلط چیز کے خلاف ہوتی، وہ حق کے لئے لڑتا حق کے لئے ڈٹتا تھا، اب وہ کڑھ کڑھ کے سوچا کرتیں، کیا شادی کا تقاضا شادی کا مطالبہ حق پر بنی تھا جوان کا شہزادہ راج دلارا، ماں جایا مان کر نہ دیتا تھا، جبکہ وہ تو خائف تھیں کتنی خائف تھیں ان کے معصوم سیدھے سادھے بھائی کو پھر سے کوئی چنڈال نہ پھانس لے پہلے کی طرح۔

بھلا کوئی خاندانی شریف مشرقی نیک لڑکی خودشادی کا مطالبہ لے کر گھر تک پہنچ سکتی تھی؟
ہرگز نہیں، ان جیسے خاندانی حسب نسب میں تو ایسا تصور بھی محال تھا، مگر مون کے معاملے میں لڑکیاں اتنی ہی اندھی ہوئی بیٹھی تھیں، خود اپنے رشتے لئے گھر تک پہنچ رہی تھیں، طلاق کے بعد سے یہ تیسرا چوتھا کیس تھا، جو خود انہوں نے نپٹایا تھا، ڈیل کر کے نکالا تھا، اف توبہ اس پہ لڑکیوں کی حالت، دیکھ کر ہی خوف آتا، کوئی اتنا مجبور بھی ہو سکتا ہے، یہ اندھی ہوس تھی یا پھر محبت کی بے بسی کی کوئی انتہا ایک تو ٹھیک ٹھاک فیملی سے تھی، یہاں تک کہ باپ بھی ساتھ تھا، لین لارڈ لگتے تھے، اکلوتی بیٹی کی فرمائش اسے بادشاہ سے فقیر بنا کر اس حد تک لے آئی تھی، کیسے ہاتھ جوڑتا تھا باپ ان کے سامنے، اپنی سب جائیداد تک دینے کو تیار، ان کا تو دماغ گھوم گیا، ان کا بھائی کوئی بکاؤ مال تھا، جسے دام بھر کے خرید لیا جاتا، من پسند کھلونا تھا جس کے لئے اولاد کا دل مچلا تو جھٹ پٹ خرید لیں، ان کا بھائی تو انمول تھا، جس کی قیمت ادا کی ہی نہ جا سکتی تھی، پر یہ بات ان لوگوں کو کیسے سمجھاتیں۔

ان کے دلارے کا حسین ترین چہرہ اتنی کشش کا باعث تھا، کہ اک دنیا دیوانی ہو گئی تھی، اس کا رعب حسن ایسا تھا کہ فوج میں بھرتی ہونے والے تو خیر لیفٹیننٹ سلیمان خان کے سلیوٹ کے جواب میں چیف آف آرمی اسٹاف نے جواباً مسکرا کر محبت سے خود اسے سلیوٹ کیا تھا، پر شفقت انداز میں ہاتھ ملایا اور کتنی حسرت سے خواہش ظاہر کی تھی، کاش ان کی اولاد ہوتی تو سلیمان خان جیسی ہوتی۔

ایسے بے حد حسن وجمال رکھنے والے بھائی کو جسے دیکھ کر جیتی تھیں وہ اور اس خوف سے اسے کبھی نگاہ بھر کے نہ دیکھا تھا، کہیں ان کی اپنی نظر نہ لگ جائے، وہ کسی ایسی ویسی عورت کے سپرد کیسے کر دیتیں جو صرف اس کے چہرے سے عشق کرتی ہو۔

آئے دن ہونے والے اس قسم کے واقعات نے انہیں الرٹ ہی نہیں خوف زدہ بھی کر ڈالا تھا، جبھی وہ مون کی جلد شادی کی خواہاں تھیں، اپنی مرضی کی خاندانی نیک شریف لڑکی کے حوالے کرنا چاہتی تھیں مون کو جو ان کے بھائی کے ساتھ ساتھ اس کی اولاد کو بھی پوری محبت اور دیانت داری سے سنبھالے، مگر مون تھا کہ اس موضوع کے چھڑتے ہی بدکنے لگتا، چڑ جاتا، غصہ کرتا تو آپا بس بے بس سے آنکھوں میں نمی بھرے اسے دیکھتی جاتیں، کیا کرتیں بھلا وہ؟
ناراض ہو کے بھی دیکھ چکیں، پیار محبت سے بھی رام کرنا چاہا، اونچ نیچ بھی سمجھا چکیں، ضرورت کا احساس بھی دلایا، مگر مون کا ہر بار ایک ہی جواب ہوتا، انکار میں، وہ تھک گئیں، ہار گئیں، بے بس ہو گئیں، تو خاموشی اوڑھ لی، قسمت کے اشارے کی منتظر ہو گئیں، دعاؤں پہ تکیہ اللہ پہ بھروسہ کر لیا، اب مون بچی کو بھی تو اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا نا، باپ تھا، وہ کیسے اسے اس جائز

مقابلے سے روکتیں، مگر یہ بھی جانتی تھیں کسی عورت کے وجود کے بغیر اس گھر میں مون اکیلا اتنی چھوٹی بچی کو سنبھال نہیں سکے گا، اس کی ضروریات کو جو ایک ماں یا ایک عورت ہی پورا کرسکتی ہے مون پورا نہیں کر پائے گا، چاہے جتنی مرضی محبت اور توجہ سے نواز دے، اب آپا بی کے گھر آجانے سے بھی مون کے مطمئن ہونے کے باوجود وہ مطمئن نہیں ہو پا رہی تھیں، جبھی دن میں کئی بار فون کرتیں حالات پوچھتیں خیریت جانا کرتیں، عجیب مشکل میں جان آپڑی تھی، نہ اپنے گھر میں قرار تھا، نہ ادھر رہ کے گزارا، فکر ہی فکر تھی، تشویش ایسی کہ حد سے بیان سے باہر۔

ان کا بس نہ چلتا ایسی کوئی جادو کی چھڑی گھمائیں کہ سب ان کے من پسند مرضی کے تابع ہو جائے، کوئی ایسی گیدڑ سنگھی مل جائے تو مون کو سنگھا کر انہیں رضا کے خلاف جانے نہ دیں، مگر ایسا جادو ایسا منتر انہیں آتا ہی نہ تھا، بے بسی کے سوا چارہ نہیں رہا، مایوسی کے انہی دنوں میں اک حیران کن واقعہ ہوا جو انہیں دکھ سے لبریز کر گیا، خون کے آنسو رلانے لگا، وہ بھی معمول کا اک دن تھا، اپنی فکروں تفکرات کے ساتھ وہ گھریلو مصروفیات میں مگن تھیں جب فون کی گھنٹی تسلسل سے بجتی چلی گئی تھی، کبھی کبھار تو یہ فون بھی انہیں بلائے جان لگا کرتا، اچھا بھلا بیٹھا انسان اس نا گہانی موئی گھنٹی سے دل کے عارضے میں مبتلا ہونے والا ہو جائے، وہ بھی اس مرتبہ گھنٹی کی آواز پہ ایسے ہی ڈر کر اچھل گئیں، گھبرائیں، دل کے عارضے میں مبتلا ہوتے ہوتے بچیں اور بڑبڑاتیں ٹیلی فون اسٹینڈ تک آئیں کہ فون تو ایسے بجے جاتا تھا گویا اٹھاتے ہی بین پڑے گی، نہ اٹھایا تو حشر اٹھائے گا ہی اٹھائے گا یہ بے جان کھلونا۔

''ہیلو!'' انہوں نے بڑے چڑے ہوئے خفا خفا اکتائے ہوئے انداز میں سلسلہ کلام جوڑا، خاندانی تھیں، اخلاقیات سے عاری نہیں تھیں کہ چھوٹتے ہی ایسی دل دہلانے والی بدتمیزی کے مرتکب پہ برس پڑتیں، کھری کھری سنانے لگتیں، سو ضبط لازم تھا جو ظاہر ہوا۔

''السلام علیکم آپا!'' بھیگی بھرائی ہوئی بوجھل رقت آمیز آواز میں سوال نہیں ہوا تھا، رشتے کا اقرار ہوا تھا جیسے، وہ تو ٹھٹک گئیں، بلکہ ٹھٹھر گئیں، دل کانپنے لگا، اک لمحہ بھی درکار نہیں ہوا تھا پہچان کا مرحلہ طے کرنے کو، اس آواز کو کیسے بھلا تیں، ان کے بابل کے آنگن میں جس کی ترنگ اور لہک اور ہنسی نے رنگ بکھیرے تھے، بھائی کی زندگی میں قوس و قزح بکھیر کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ کے پھول کھلائے تھے، اپنی کوکھ میں ان کے ہاں جانے کی امانت کو سنبھال کر سینت کر رکھا اور پوری دیانت داری سے اسی انمول خزانے کو اس نسل کی بقاء کے مرحلے تک خود تکلیف اٹھا کر لائی تھی، وہ ان کی محسن بھی تو تھی، ہاں محسن بھی بہت بڑی، انہیں سب بھول گیا سوائے اس احسان کے، اپنے بھائی سے روا رکھا گیا اس کا آخری سلوک تک۔

''آپا!''

وہ رو رہی تھی، بلک رہی تھی، بس فریادیں کر رہی تھی، ان کا بھر آیا ہوا دل رستا پھوڑا بن گیا، بہہ پڑا، خون سے رنگین ہوگیا، آنسو بے اختیار برس پڑے۔

''اب کیوں فون کیا ہے کرماں ماڑی، کیوں رو رہی ہے جنم جلی، نقصان تو ہو چلا، کشتیاں جلا کر راکھ کنارے بیٹھ رونی رہو، واپسی کے راستے سلامت نہیں رہے۔'' وہ خود زار و قطار رو پڑیں،

بنا کہے ہی اس کا درد جان گئی تھیں، اپنے بھائی کی قدر و قیمت سے اچھی طرح آگاہ تھیں، انہیں پا کر فخر سے غرور سے عاجز ہو جانے والی اسے گنوا کر کیسے جی سکتی تھی انہیں جی سکتی تھی، یہ انہیں بھی پورا یقین تھا، کچھ سننے کی ضرورت ہی نہ تھی، انہیں از خود سب معلوم تھا، سب پتا تھا کیا ہونا تھا، وہی ہو رہا تھا تو باقی صرف دکھ رہ جاتے تھے، پچھتاوے بچتے تھے، آہ و زیاں سازیاں تھی، اذیت سی اذیت تھی، ایسا نقصان بھی پہلے کسی کا نہ ہوا ہوگا، ایسی وحشت بھی پہلے کسی کا نصیب نہ ٹھہری ہوگی۔

''کچھ کریں آپا، پلیز کچھ کریں۔'' آہیں کراہیں سسکیاں، وہ ایسے بولتی تھی، گویا من کی مراد نہ ملی تو یونہی رو رو کے جان دے ڈالے گی، آپا یکدم خوف سے بھر گئیں۔

''خود کو سنبھالو، تمہیں خود کو سنبھالنا ہی ہوگا، اب کیا ہو سکتا ہے۔'' خود پہ قابو پا کر وہ اسے تسلی دلاسہ دینے میں مصروف ہوئیں، انہیں اس پاگل لڑکی سے دلی ہمدردی تھی، جوان کے بھائی پہ فدا ہوئی تھی تو دنیا کی ہر شے ہر انمول خزانے کو ٹھوکر مار کر اس کے پاس اس کی قربت میں چلی آئی تھی، بس ذرا چوک میں خطا کھا بیٹھی، اب انہیں اس سے ہمدردی بھی ہوئی۔

''ہو سکتا ہے، آپ چاہیں تو، آپا سلیمان کو سمجھائیں، صاحب سے بات کریں، کوئی نہ کوئی تو گنجائش نکل آئے گی، کوئی گنجائش نکالیں، وہ آپ کی سنتے ہیں، آپ کی بات نہیں ٹالتے، صاحب کو منائیں، اللہ کے واسطے منائیں، ورنہ میں مر جاؤں گی بس.......'' وہ ہوک بھرے فریاد کناں لہجے میں کرلائی تھی، ماتم کناں سا انداز لئے، آپا دھک سے رہ گئیں، یہ کیسا جان لیوا اور اک ہوا تھا، ان سے تو بھائی کی بربادی کا دکھ سنبھالا نہ جاتا تھا، اس نازک شہزادی جیسی لڑکی نے اپنا دکھڑا سنا کر انہیں بالکل ہی شل کر ڈالا، دکھ سے بوجھل کر دیا، وہ کچھ بولنے کے قابل نہ رہیں۔

''چپ کیوں ہو گئیں آپا، کچھ بولیں، کچھ بولیں مجھے آس کی کوئی ڈور تھما دیں، مجھے خوش خبری سنا دیں کہ زندگی جینے کا کوئی طریقہ ابھی باقی ہے، آپ کی چپ مایوسی کا ایسا اندھا کنواں ثابت ہو رہی ہے میرے لئے جس میں صرف موت کا سناٹا ہے، اس سناٹے سے بہت وحشت محسوس کرتی ہوں۔''

وہ بات سے پہلے بھی روتی تھی، بات پوری کر کے بھی روتی، درمیان میں بھی ہچکیاں بھرتی تھی، اس کی حالت قابل رحم تھی، آپا کو عجیب سی بے چارگی نے آن لیا، کچھ سوجھا ہی نہیں کیا کہیں، الفاظ ساتھ ہی نہیں چھوڑ گئے تھے، بے معنی بھی ہو گئے تھے جیسے، زندگی کے کچھ مرحلے کتنے حساس نازک اور گراں ہوتے ہیں، کتنے بے بس ہوتے ہیں، انہیں اس ایک لمحے میں پھر سے احساس ہوا تو بہت رونا آیا۔

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، وہ تین طلاقیں دے چکا ہے، اس کے بعد تو گنجائش ہی ختم ہو جاتی ہے، چپ نہ رہوں تو دکھ میں اضافہ ہی کروں نا تمہارے۔'' وہ آنسو پونچھتی ہوئیں تھکی ماندی آواز میں کہہ رہی تھیں، دوسری جانب سناٹا چھا گیا، گویا موت کا سناٹا، آپا کو عجیب سے دہل نے آن لیا تو اسے پکاریں۔

''وقت کے ساتھ صبر آ جائے گا، تیرے پاس مون کی سب سے پیاری امانت ہے، اس کی جیتی جاگتی نشانی، اس کا پرتو اسی کا عکس، اس سے دل بہلانے کی کوشش کر قرار پکڑ ہی لے گا، یہ جیا

خانہ بھی، سمجھو تو وہ بھی اس کا نعم البدل ہے۔" وہ آہ بھر کے بولی تھیں، دوسری سمت پھر خاموشی تھی، ان کا دل اس مہیب چپ سے مزید ہولا اور گھبرایا، دھیان بٹانے کو زور سے بول پڑیں۔

"ایزد کیسا ہے؟ باپ کو یاد تو کرتا ہوگا؟" مقصد دل بہلانا تھا، اپنا بھی اس کا بھی، مگر خاک کامیابی نہ ہوئی نہ دل بہلا پائیں، وہ پھر سے رونا شروع کر چکی تھی۔

"صاحب کا نعم البدل کون ہو سکتا ہے آپا، کوئی نہیں ہو سکتا، کم از کم میرے لئے نہیں، آپ یقین کر لیں میں ایزد کو دیکھتی تک نہیں، اسے چھوتی بھی نہیں، کیسے بتاؤں سب کو، کیسے سمجھاؤں، صاحب کے علاوہ کچھ طلب کچھ حاجت نہیں، وہ صرف وہ...... نہیں تو کچھ بھی نہیں۔" وہ دیوانوں کی طرح بول رہی تھی، آپا سہم سی گئیں، خوف زدہ ہو گئیں۔

"یہ ظلم نہ کرو پاگل لڑکی، حماقت پہ حماقت کرو گی تو بالکل برباد ہو جاؤ گی، بچے کو نظر انداز نہ کرو، مون کو ابھی بھی سمجھ نہیں پائی ہو؟ انتہا پہ جا کے فیصلے کرنا عادت ٹھہری اس کی، گنجائش تک باقی نہیں چھوڑتا۔"

"ظلم سب سے بڑا ظلم تو خود اپنے ساتھ کر بیٹھی ہوں آپا، اس سے بڑی حماقت اور کیا ہوگی، صاحب سے کہیں اک اور قدم اٹھائیں مجھے شوٹ کر دیں، کچھ ایسا تو ضرور کریں کہ اس اذیت سے نجات حاصل ہو، مرنے کے بعد بھی احسان مانوں گی۔" اس کی آواز سے وحشت و دیوانگی اک ساتھ جھلکنے لگی، آپا گھبرا کر پکاریں، اسے سمجھانا چاہتی تھیں مگر وہ یونہی آہ و فغاں کے دوران سلسلہ منقطع کر چکی تھی، آپا نے لاکھ دوبارہ رابطہ کرنا چاہا مگر سلسلہ مل کر نہ دیا، ان کے اندر بے نام سی وحشت اتر آئی، وہ پاگل آنکھوں والی لڑکی نئے سرے سے انہیں دکھ کے کس رشتے میں باندھ گئی تھی اپنے ساتھ۔

وہ تو اس سے ہمدردی کی بھی روادار نہ تھیں، اب اس کے لئے آنسو بہاتی تھیں، وہ ایسے ہی بیٹھی رہیں، سورج کی کرنیں پردوں کی اوٹ سے انہیں ان کی اداسی کو جھانکتی رہیں، پھر دھیرے دھیرے سہولت سے کمرے میں اتر کر آزادی سے ہر چیز کو چھونے لگیں، ان کے چہرے کو تھپکنے لگیں گویا دکھ کی اس کیفیت میں ڈھارس بندھا رہی ہوں، معاً قدر کا خیال آیا تو ہڑبڑا کر اٹھیں، مون تو اعتبار ہو آپا بی پہ تو لاکھ ہو، وہ آنکھیں بند کر کے اعتبار کی قائل نہ تھیں، باہر آئیں تو وہ سامنے ہی لان میں نظر آ گئی، واکر میں بیٹھی گلابی خوب پھولے فراک میں ہاتھ اور کلکاریاں مار کر خوش ہوتی ہوئی، آپا بی پاس ہی گھاس پہ بیٹھیں اسے سریلیک کھلا رہی تھیں، انداز پیار بھرا مشفقانہ تھا، ساتھ ساتھ توتلی زبان میں باتیں بھی کرتی تھیں، وہ ذرا سا مطمئن ہوئیں اور گہرا سانس بھر کے اطراف میں نگاہ ڈالی، موسم کسی قدر ابر آلود تھا، درختوں کی برہنہ تن شاخیں ننھی منی تر و تازہ کونپلوں سے ڈھکنے لگی تھیں، ہوا قدرے سرد اور خنک تھی، کیاریوں میں پھول کھلنے اور تتلیاں منڈلانے کا موسم قریب تھا، تب ہی کوئی بوند بادل سے ہاتھ چھڑا کر زمین کی طرف لپکی اور قدر کے گلابی گال پہ بکھر گئی، اس نے خوش ہو کر زور سے صرف کلکاری نہیں ماری ہاتھ بھی ہوا میں چلایا تھا کہ آپا بی کے ہاتھ سے اس کے منہ کی طرف جاتا چمچ چھوٹ گیا۔

"آپا بی، قدر کو اندر لے جائیں ٹھنڈ بڑھ رہی ہے۔"

مختلف فائلوں کے ساتھ مصروف مون سر اٹھائے بغیر بولا تھا، آپا بی نے قدرے کپڑے جہاں سر یلیک گرا تھا، رومال سے صاف کیا اور بچی کو احتیاط سے واکر سے نکال کر گود میں اٹھاتے رخ پھیرا تو ان سے نگاہ ملی تھی، انہوں نے جھٹ مودبانہ سلام کر دیا، وہ محض سر ہلا سکیں، مون نے آواز پہ سر اٹھایا، انہیں دیکھ کر رہی مسکراہٹ اچھالی اور فائل سمیٹ دی۔

"آیئے آپا...... بیٹھیں۔"

"نہیں روشنی کو دیکھنے آئی تھی، تمہارے بھائی جان کو فون کروں گی آ کر لے جائیں مجھے۔"

بظاہر نارمل انداز میں کہتیں وہ پلٹ کر اندر چلی گئیں، مون ٹھوڑی پہ ہتھیلی جمائے انگشت شہادت ہونٹوں پہ دھیرے دھیرے مارتا ہوا سوچ رہا تھا، اب آپا نے اس سے ایسی کون سی فرمائش کرنی ہے، کون سا مطالبہ منوانا ہے جو ایسے نروٹھے انداز میں بات کر کے اپنی ناراضگی ظاہر کی گئی ہیں، سوچ کا برعکس اس کی دلربا آنکھوں میں اترتا انہیں مزید دلکشی دلنوازی بخش رہا تھا اور دور کہیں دور سے، ٹیلی اسکوپ سے اسے دیکھتی آنکھوں میں نارسائی ہجر کا ملال گہرا مزید گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

(جاری ہے)

☆☆☆

ابن انشاء کی کتابیں

طنز و مزاح سفر نامے

- اردو کی آخری کتاب،
- آوارہ گرد کی ڈائری،
- دنیا گول ہے،
- ابن بطوطہ کے تعاقب میں،
- چلتے ہو تو چین کو چلیے،
- نگری نگری پھرا مسافر،

شعری مجموعے

- چاند نگر
- اس بستی کے اک کوچے میں
- دلِ وحشی

لاہور اکیڈمی

۲۰۵ سرکلر روڈ لاہور۔

"اچھا تو اب دکھا بھی دو جازی بھائی کی دلہن، جس کے قصیدے فون پر سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔" قاری کا ایک بار پھر دلہن نامہ شروع ہونے سے پہلے ہی اس نے اسے ٹوک دیا۔

"ابھی بلا کے لے آتی ہوں بھائی، آپ کی آنکھیں کھلی کی کھلی نہ رہ جائیں تو میرا نام بدل دینا، آپ ہوں یا کنول بھیا یا ارمان سب سے بازی لے گئے جازی بھائی۔" کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔

"کیا بات ہے بھئی جازی بھائی کی، ویسے بھابھی، بقول آپ سب کے کوئی در نایاب ڈھونڈا ہے جازی بھائی نے تو ایسا ہیرا ملا کہاں ان کو؟" چائے لے کر بھابھی سے اس نے پوچھا۔

"تم شاید مذاق سمجھ رہے ہو ہم سب کی بات کو مگر دنوں میں ہی تائی اماں نے کچھ ایسا کرشمہ دکھایا کہ برسوں سے روٹھے بھائی کو منا بھی لیا ساتھ ساتھ بھتیجی کا رشتہ بھی طلب کر لیا، وہ بھی کوئی عجیب ہی لوگ ہیں نہ جازی کو دیکھا نہ بھالا پکڑ کر اچھی بھلی لڑکی کو جازی کے پلے باندھ دیا، بارات کے ساتھ ہی گئے ہم سب، وہیں دلہن کی خوبصورتی اور معصومیت نے جہاں ہمیں حیرت میں ڈالا وہاں تائی اتراتے نہیں تھک رہی تھیں اور جازی کے سسر کو بھی بیٹی کو رخصت کرنے کا انتظار تھا شاید، شادی کے تیسرے روز ہی عدم کو روانہ ہو گئے، اب تو ان کو بھی گزرے دو ڈھائی ماہ ہونے کو ہیں۔" بھابھی نے اپنا چائے کا کپ تھام کر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئیں اور اسے ساری تفصیل بتا دی۔

"تم یہ بتاؤ تم نے اس دفعہ اتنے دن بلکہ اتنے ماہ کیوں لگا دیئے آنے میں، نہ شادی میں شرکت کی جازی کی اور نہ ہی صائم کے عقیقہ پر پہنچ

مکمل ناول

زندگی بن گئے ہو تم
ام ایمان قاضی
Downloaded From paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

سکے، اب ایسی بھی کیا مصروفیت، کتنا انتظار کیا سب نے تمہارا۔" بھابھی کے بہت دنوں بعد ہاتھ لگا تھا وہ تب ہی اس کی گوشمالی کرنے میں ذرا دیر نہیں کی۔

"ارے مائی ڈیئر بھابھی! یہ غم جاناں اور غم دوراں دونوں ہی خوب خوار کر دینے والے سلسلے ہیں، آپ کیا جانیں، آپ کے میاں جانی ٹھہرے کاروباری بندے اور کاروبار بھی چھوٹا ہی سہی اپنا ہو تو کیا ہی کہنے جب مرضی چلے جاؤ، نہ بھی دل کرے تو کوئی ٹینشن نہیں اور نوکری میں بات آ جاتی ہے نوکر کی تے نخرہ کی پھر نوکری بھی صحافی کی تو مت پوچھیں، اچھا چھوڑیں یہ باتیں تو چلتی رہیں گی، ہمارے شہزادے کو تو لے آئیں، کہاں ہے کافی دیر سے نظر ہی نہیں آیا۔" صوفے پر بیٹھے بیٹھے اس نے ٹیبل پر پیر پسارے۔

"سو رہا ہے جب تم آئے تھے، اب دیکھتی ہوں جا کے۔" بھابھی نے ٹیبل پر سے چائے کے خالی کپ اٹھاتے ہوئے کہا اور باہر نکل گئیں، ابھی عمر نے ریموٹ کی تلاش میں نظریں گھمائیں ہی تھیں کہ دروازے میں قاری کے ساتھ داخل ہوتی ہستی کو دیکھ کر ہفت آسمان گویا اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئے۔

"آؤ آؤ، یہی ہیں عمر بھائی جن کا روز ذکر سنتی ہو۔" قاری نے اسے جھجک کر رکتے دیکھ کر بازو سے پکڑ کر آگے کیا اور پھر عمر سے مخاطب ہو کر بولی۔

"یہ لیں جناب جاذی بھائی کی مسز، مسز دیا جاذب۔" ایک بار پھر قاری نے اس کی سماعتوں پر بم پھوڑا اور کچھ لمحے کے لئے اسے جامد کر دیا، اسے دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں دھندلی ہونے لگیں۔

"دیکھا بن گئے ناں بت، میں نے کہا تھا ناں۔" قاری نے تالی بجا کر کہا جبکہ اس خوبرو نوجوان کو بری طرح سے خود کو دیکھتے پا کر دیا خائف ہو گئی۔

"مم...... مجھے شاید پھپھو آواز دے رہی ہیں۔" قاری کا ہاتھ چھڑ کر وہ تیزی سے باہر چلی گئی۔

"کیا ہے بھائی، کیسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیا کو دیکھ رہے تھے آپ جیسے کبھی کوئی خوبصورت لڑکی نہ دیکھی ہو، وہ تو ویسے بھی اتنی شرمیلی ہے، گھبرا گئی بیچاری، مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگا آپ کا انداز۔" قاری نے ٹھنک کر کہا مگر کچھ لمحوں میں ہی بھائی کی طرف سے تشویش کا شکار بھی ہو گئی، چند لمحوں پہلے تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہنس بول رہا تھا، اب ایسے نڈھال جیسے میلوں سفر کر کے ابھی آیا ہو۔

"بھائی...... کیا ہوا؟" قاری نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کا کاندھا ہلا کر پوچھا، بھائی نے سرخ سرخ آنکھیں اٹھا کر اسے نا سمجھی سے دیکھا پھر کچھ بولنے کی کوشش میں لب پھڑ پھڑا کر رہ گیا، قاری نے پھر اپنا سوال دہرایا، عمر نے نفی میں اپنا سر ہلایا اور جھٹکے سے اٹھ کر وہاں سے چلا گیا، قاری سوچتی ہی رہ گئی کہ اچانک بھائی کو کیا ہو گا پھر اپنی امی کو کچن میں بتانے کے لئے بھاگی، اپنے کمرے کو اندر سے لاک کر کے وہ اپنے بستر پر ڈھے گیا۔

"میں گلی گلی کوچہ کوچہ اس چہرے کی تلاش میں سرگرداں رہا اور اس نے مجھے یہاں ملنا تھا اس حیثیت میں "یا میرے اللہ، اتنی بڑی اور کڑی آزمائش۔" اس نے گھنے بالوں میں اپنی انگلیاں پھنسائیں، سر درد سے پھٹنے کو تھا۔

"چھ ماہ...... چھ ماہ میں کتنے روپ میں

اسے دیکھا اپنے خیالوں میں، خوابوں میں اور جب سے اسے دیکھا تھا اور پھر کھو دیا تھا، اس کی دعاؤں میں کسی ورد کی طرح شامل ہو گئی تھی وہ۔"

☆☆☆

وہ اور حسن دونوں ایک ہی فیلڈ سے منسلک تھے، سو حسن ہی کے ریفرنس سے وہ ایک نجی چینل سے وابستہ ہو گیا اور جلد ہی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا، ماموں کے گھر میں ماموں ممانی، ان کے بیٹے حسن کے علاوہ سارہ تھی اس کی ماموں زاد، فاری کی ہی عمر کی، اسی جیسی شکل اور عادات میں مماثلت چلبلی، تھرڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی، وہ ہر ویک اینڈ نہیں تو پندرہ دن بعد گھر کا چکر لگایا کرتا تھا، مگر جن دنوں پروگرام کے دن ہوتے وہ بے حد مصروف ہوتا، سہیل بھائی کی شادی دو سال پہلے ہوئی تھی اب ایک بیٹا بھی تھا جو سارے گھر کی رونق تھا، امی نے جب اس کے لئے یہاں وہاں رشتے دیکھنے شروع کیے اس نے فوراً ٹوک دیا انہیں۔

"مجھے ابھی وقت دیں امی اپنا کیریئر بنانے کے لئے اور اس دوران اپنی پسند کی کوئی لڑکی ٹکرا گئی تو آپ کو بتا دوں گا۔"

"بھائی لڑکی نہ ہوئی کوئی گائے بھینس ہو گئی جو ٹکرائے گی آپ سے۔" فاری نے ٹکڑا لگایا۔

"تمہاری طرح تمہاری بھی ہر بات نرالی ہے عمر، کتنا کہا بھائی کے کاروبار میں شریک ہو جاؤ، کم از کم نظروں کے سامنے تو رہو گے، مگر نہ جی در در کی خاک چھاننے والی نوکری ڈھونڈ کے گھر بدر ہو گئے اور اب لڑکی بھی خود پسند کریں گے صاحبزادے، وہ بھی ویسی ہی ہو گی جیسی تمہاری پسند کی عموماً چیزیں ہوتی ہیں، بے رنگ، بے ڈھنگی اور بے تکی۔" امی تو جلی بیٹھی تھیں اب اس کی فرمائش سن کر اچھی خاصی کلاس لی اس کی۔

"اوہو آپ کو دکھائے اور بتائے بغیر تو شادی نہیں کروں گا ناں امی، لیکن شادی صرف ایک بار ہوتی ہے، بندے کو اپنی پسند سے ہی کرنی چاہیے، اب ہر کوئی سہیل بھائی جیسا قربانی دینے والا تو ہوتا نہیں۔" امی کو جواب دے کر اس نے بھابھی کو چھیڑنا چاہا، بھابھی نے شاکی نظروں سے سہیل بھائی کی طرف دیکھا۔

"او یار خدا کے لئے یہاں اپنی صحافی والی لگائی بجھائی والی صلاحیت کا استعمال مت کیا کرو، اور تم بھی کمال کرتی ہو اس کی عادت کا پتہ ہے تمہیں کسی بندے کو چھوڑتا ہے یہ زچ کرنے سے۔" سہیل بھائی کے تسلی کرانے پر بھابھی نے اس کی طرف دیکھا جو دانت نکالے کورنش بجا لا رہا تھا، پھر امی نے اس کی ضد دیکھ کر لڑکیاں خود دیکھنے کا پروگرام موقوف کر دیا تھا، سہیل بھائی سے چھوٹا ارمان تھا جو آرمی میں تھا اور آج کل اس کی پوسٹنگ کوئٹہ میں تھی، جس کے لئے امی کی نظر سارہ پر تھی اور ماموں سے بھی رسمی بات ہو چکی تھی بس سارہ کے بی ایس سی مکمل ہونے کا انتظار تھا ابھی چھ ماہ پہلے کی تو بات تھی یہ اس دن وہ ابھی گھر جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ حسن کی کال آئی تھی اسے کہ سارہ جس وین سے کالج جاتی تھی وہ آج خراب تھی جاتے ہوئے تو اسے حسن نے چھوڑ دیا تھا اب وہ چونکہ مصروف تھا سو اس کے ذمہ لگایا تھا کہ سارہ کی چھٹی کے ٹائم اسے پک کر لے، وہ فارغ ہی تھا تقریباً سو گاڑی کی چابی لے کر سارہ کو لینے پہنچ گیا، ابھی چھٹی ہونے میں کچھ دیر تھی غالباً وہ بھی دیگر گاڑیوں، رکشوں اور موٹر سائیکلز کے ساتھ پارکنگ میں ہی انتظار کرنے لگا، چھٹی کے ٹائم لڑکیوں کی بڑی تعداد کو گیٹ سے نکلتے دیکھ کر وہ چوکس ہو گیا۔

"اتنے رش میں جب سب ایک جیسے

یونیفارم میں ایک جیسی لگ رہی ہیں سارہ کو میں کیسے ڈھونڈوں اور اسے کیا پتہ کہ میں لینے آیا ہوں؟" اس سوچ کے ذہن میں آتے ہی اس نے جیب میں سے سیل نکال کر سارہ کا نمبر ملایا، دوسری جانب پاورڈ آف سن کر اس نے پھر سے حسن کو کال ملائی۔

"اوہ...... یہ تو تو ٹھیک کہہ رہا ہے، سارہ تو ویسے ہی لکیر کی فقیر ہے، صبح میں نے چھوڑا تھا سو جھانک جھانک میری ہی گاڑی کو ڈھونڈتی رہے گی اور بے وقوف کا نمبر بھی بند ہے، چل تو دس پندرہ منٹ تک مزید دیکھ، میں گھر کال کر کے امی کو اس کی کسی دوست سے کانٹیکٹ کرنے کا کہتا ہوں۔"

اور سارہ کے انتظار میں آہستہ آہستہ گاڑیوں اور سواریوں کا رش بھی چھٹ گیا اور کالج سے آخری لڑکی بھی باہر چلی گئی جب اسے ایک بار پھر حسن کی کال آئی کہ سارہ اپنی ایک دوست کے ساتھ ہے اور گھر پہنچنے والی ہے وہ واپس آ جائے، ایک طویل سانس لیتے ہوئے، اس نے سیل آف کیا اور گاڑی بیک ٹرن کرتے ہوئے اس کی نظر پہلی بار اس پر پڑی تھی، سفید یونیفارم میں ملبوس وہ اپنی ہی سوچوں میں گم فائل کو سینے سے لگائے ہوئے کالی چادر سے خود کو لپیٹے ہوئے تھی، پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے اس کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکے جب وہ اس کی گاڑی کے بے حد قریب سے گزری تھی پھر کچھ آگے جا کر اس نے ایک رکشے کو ہاتھ دے کر روکا اور لمحوں میں ہی اس کی نظر سے اوجھل ہو گئی، اپنی دلچسپی کے علاوہ ہر چیز کو لاپرواہی کی نظر سے دیکھنے والے عمر پر اس ایک نظر کا ہی اثر اتنا گہرا اور دیرپا ہونا تھا، یہ اندازہ اسے اس وقت ہرگز نہیں تھا ورنہ وہ اسے آسانی سے نہ جانے دیتا، اس کا پیچھا کر کے کوئی اتہ پتہ ہی معلوم کر لیتا، حالانکہ اس نے اس پر سرسری نظر ہی ڈالی تھی مگر وہ نظر اتنی قوی تھی کہ بعد میں جب جب اس کا خیال آیا وہ چشم تصور میں دیکھ سکتا تھا کہ اس کا رنگ بے حد گورا تھا جو اس دن تیز دھوپ کے باعث سرخ ہو رہا تھا، صبیح پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک کر اپنی قسمت پر نازاں تھے، جھکی پلکوں کے تمتماتے گالوں پر لرزنا پوری جزئیات سے یاد تھا تین دنوں میں جب اسے پوری طرح سے ادراک ہو گیا کہ وہ وقتی نظر صرف اس کے حسن سے متاثر ہو جانے والی نظر نہیں تھی بلکہ کچھ اور ہی تھا اگلے روز وہ ایک بار کالج گیٹ کے سامنے تھا مگر پورا ڈیڑھ گھنٹہ اس نے ایک ایک لڑکی کو دیکھتے گزار دیا، گوہر مقصود کو نظر آنا تھا نہ آیا، اگلے چار دن اس کی یہی روٹین رہی اور جیسے جیسے احساس ہوتا گیا کہ وہ اسے کھو چکا ہے اس کی بے چینی میں اضافہ ہو گیا تھا، آخر اس نے سارہ کی مدد لینے کی ٹھانی اور ساری صورتحال بتا کر اصرار کیا کہ وہ صرف ایک بار اسے ڈھونڈ دے تو پھر وہ اسے کھونے نہیں دے گا۔

"کمال کرتے ہیں عمر بھائی آپ، نہ اس کا نام پتہ ہے نہ کلاس نہ کوئی خصوصی نشانی اب دو ہزار لڑکیوں میں میں اسے کیسے تلاش کروں گی؟"

"کچھ کرو سارہ، کسی طرح سے ڈھونڈو اسے، بہت معصوم نظر آتی ہے وہ اور اتنی ہی خوبصورت، اس جیسا کوئی بھی نہیں ہے...... وہ......"

"بس کرو میاں دل آ جائے تو گدھی بھی حسین لگتی ہے، ایسی نشانیوں کے ساتھ سارہ تو کیا تم بھی قیامت تک اسے نہیں ڈھونڈ سکتے۔" حسن جو ایک طرف بیٹھا ان دونوں کی گفتگو کو بڑی دیر سے صبر سے سن رہا تھا بیزاری سے بولا۔

"تو بتاؤ میں اور کیا کروں حسن، جس وقت میں نے اسے دیکھا، اس وقت اگر اندازہ ہوتا کہ یہی لڑکی میرا آئیڈیل ہے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اس طرح میرے حواسوں پر سوار ہو جائے گی تو بخدا اسے وہیں روک کر نام و پتہ اور دیگر کوائف معلوم کر لیتا، چار دن مسلسل اس کی راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئی ہیں، اب تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے میں نے کوئی خواب دیکھا تھا یا میرے الوژن نے مجسم ہو کر اس کا روپ دھار کر مجھے اسیر کر لیا۔" اس کے انداز میں جس قدر بے بسی تھی اس سے حسن کو بھی اندازہ ہو گیا کہ وہ واقعی سنجیدہ تھا۔

"عمر بھائی ایک آئیڈیا ہے میرے پاس۔" دفعتاً سارہ نے جوش سے کہا، وہ دونوں چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

"وہ یہ کہ آپ کچھ دن یہ روٹین جاری رکھیں مطلب ہماری چھٹی کے وقت وہاں آنے کی، چار دن نہیں آئی تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ عمر بھر نہیں آئے گی، کوئی کام بھی تو ہو سکتا ہے یا کوئی مسئلہ، کسی دن تو نظر آ ہی جائے گی۔"

"یہی تو مسئلہ ہے سارہ ڈیئر! یہ دن تو پروگرام آن ایئر آنے کے تو سو میں فری تھا اب کل سے میں نے پھر سے بزی ہو جانا ہے تو بیس دن تو سر کھجانے کی فرصت نہیں ملے گی مجھے، کاش میں اسے اس وقت روک لیتا۔" ایسی حسرت تھی اس کے لہجے میں کہ حسن جھنجھلا کر اس کے پاس آن بیٹھا۔

"اچھا تو اب زیادہ ٹینشن مت لو اس بات کی، وہ کوئی دنیا کی آخری لڑکی نہیں تھی۔"

"میرے لئے پہلی اور آخری ہی تھی یار، تم نہیں سمجھو گے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے عمر بھائی کھانا تو کھا لیں۔" سارہ نے اسے کمرے کی طرف جاتے دیکھ کر روکا۔

"تم لوگ کھا لو سارہ، میرا موڈ نہیں ہو رہا۔" کہہ کر وہ رکا نہیں تھا، دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے، پھر آنے والے دنوں میں وہ جتنا بھی مصروف کیوں نہ ہوتا، وہ ایک گھنٹہ جو کالج کی چھٹی کا ہوتا اس کے لئے اسے پروگرام ادھورا چھوڑ کر کبھی ڈانٹ کھانی پڑتی، کبھی درخواست کرنی پڑتی مگر وہ جاتا ضرور تھا مگر اگلا ڈیڑھ ماہ اس کی اس کوشش میں خاطر خواہ کامیابی نہ لا سکا، وہ چہرہ جو ایک بار اپنی جھلک دکھا کر اسے بیقرار کر گیا تھا، نہ جانے کہاں جا کر چھپ گیا تھا، پھر انہی دنوں جب اسے اپنے پروگرام کے لئے آؤٹ آف سٹی جانا پڑا تھا اسے جازی بھائی کی شادی کی اطلاع ملی تھی اور گھر آنے پر شدید اصرار بھی ہوا تھا گھر والوں کی طرف سے مگر آج کل جو پراجیکٹ اسے ملا تھا اس میں وہ اگلے دو ماہ کے لئے بالکل بھی فارغ ہونے والا نہیں تھا سو فون پر تائی جان سے معذرت کر لی تھی، فاری نے اسے شادی کی تصاویر بھی بھیجی تھیں مگر دلہن کا منہ جھکا ہونے کے باعث اسے اس کے نقوش خاص نظر نہیں آ سکے تھے، پھر جب اس نے گھر والوں سے جازی بھائی کی دلہن کے خوبصورتی کے قصے تھے وہ حیران ہو ہو گیا تھا۔

"مگر یار فاری اتنی خوبصورت لڑکی کے ماں باپ اندھے تھے کیا جو جازی بھائی کو اپنی بیٹی پکڑا دی یا اس کا بھی کوئی پرزہ اپنے میاں کی طرح ڈھیلا ہو گا ورنہ کون صحیح الدماغ بندہ اپنی ٹھیک ٹھاک صحت مند اور خوبصورت لڑکی ایک فارغ العقل لڑکے کو دے سکتا ہے۔" ایک دفعہ فاری نے جب دلہن نامہ شروع کیا تھا اس نے مذاق میں کہا تھا۔

"ارے نہیں بھائی وہ بالکل ٹھیک ہے، ایکٹو اور خوبصورت اور تو اور بی ایس سی کی طالبہ بھی ہے، تائی نے چند ماہ پہلے اپنا ایک گمشدہ بھائی پتہ نہیں کیسے اور کہاں سے ڈھونڈ نکالا اور انہیں سے یہ گوہر نایاب اڑا لائیں، سنا ہے تائی بہت عرصہ سے اپنے بھائی سے ناراض تھیں اور اسی شرط پر اپنی ناراضگی ختم کی کہ وہ اپنی بیٹی کو ان کی بہو بنا دیں۔"

قاری کے انکشاف پر وہ سر ہلا کر رہ گیا پھر باتوں کا رخ دوسری طرف مڑ گیا تو وہ بھی یہ بات بھول بھال گیا، جیسے ہی فراغت نصیب ہوئی وہ فوراً ہی گھر پہنچا تھا جہاں پر یہ جان لیوا انکشاف اس کا منتظر تھا کہ جس کو دیکھ کر اس کے دل نے کہا تھا کہ یہی ہے جسے اس کی زندگی کا ہم سفر بننا ہے اور ابھی تو وہ اس کی کھوج کے سفر میں تھا اور اس کا یہ سفر آج اپنے گھر پر آ کر تمام ہوا تھا۔

☆☆☆

وہ کتنی ہی دیر سے دل کی دھڑکنوں کے اس شور کو دبانے میں مصروف تھی، جنہوں نے تب سے ہی اودھم مچا رکھا تھا جب سے قاری کے عمر بھائی سے ملی تھی بلکہ ملی کہاں تھی، صرف سلام ہی کیا تھا اور وہ جو نظر اس پر اٹھی تھی کیا تھا اس میں؟ جذبات کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر، وارفتگی، احساسات کی شدت، وہ گھبرا کر قاری کا ہاتھ چھڑا کر بھاگ آئی تھی، قسمت بھی عجیب کھیل کھیلتی ہے، جس ستائش اور جذبوں کو وہ اپنے ہم سفر کی آنکھوں میں دیکھنے کی چاہ لے کر اس گھر میں آئی تھی وہ سب کچھ اسے نظر بھی آیا تو کہاں، ایک ایسے شخص کے پاس جو اس کا نامحرم تھا۔

"ہاؤ۔" کی زوردار آواز نے اسے اتنا ڈرایا کہ اس کی چیخ نکل گئی۔

"آہا، دلہن ڈر گئی، میں نے دلہن کو ڈرا دیا۔" چھ فٹ کا وہ وجود عجیب سے انداز میں قہقہے لگاتا عجیب تر لگ رہا تھا بے ساختہ دیا کی آنکھیں بھر آئیں، ہر بار اس شخص کو دیکھ کر وہ خود ترسی کی انتہا کو پہنچ جاتی۔

"دلہن آؤ باہر آؤ ٹرین ٹرین کھیلیں۔" اب وہ لمبا چوڑا جاذب اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچ رہا تھا اور باہر لے جانے پر بضد تھا۔

"ارے ہے بہو، اب ایسی بھی کیا اکڑ بچہ گھنٹے سے منتیں کر رہا ہے اور تم ہو کہ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھے بیٹھی ہو، ارے دنیا میں جس روح نے آنا ہے واپس تو جانا ہے اس نے، مرنے والا تمہارا باپ تھا تو میرا بھی تو بھائی تھا، میں نے اللہ کی رضا جان کر صبر کر لیا، تم بھی کر لو، نویلی بیاہتا ہو اس گھر کی اور حالت دیکھو اپنی نہ بار نہ سنگھار نہ زیور نہ چوڑیاں، سہاگن ہو خیر سے اللہ جوڑی سلامت رکھے۔" تائی جو کہ دیا کی پھپھی تھیں نے اچانک سے کمرے میں آ کر اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"سہاگن۔" دل ہی دل میں اس لفظ کو دہراتے دیا نے اپنے شوہر کے رتبے پر فائز چھبیس سال کے اس شخص پر زخمی نظر ڈالی جس کے تنومند خوبصورت وجود سے اس کا دماغ بہت پیچھے تھا۔

"اماں دیکھو تو دلہن کھیلتی ہی نہیں نہ ہنستی ہے نہ بولتی ہے۔" منہ بسور کر جازی نے اپنی ماں کا کندھا ہلایا، وہ تو بیٹے کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تڑپ گئیں۔

"ارے بھئی تمہارے ابا مرحوم کو بتا دیا تھا اور تمہیں بھی کہ ہماری ایک ہی منتوں مرادوں والی اولاد ہے، ذرا سا سیدھا سادہ اور بھولا بھالا ہے مگر جان سے عزیز ہے مجھے، آج تک اس کی کوئی فرمائش رد نہیں کی میں نے اور تم ہو کہ

میرے بچے کی آنکھوں میں آنسو لائے رکھتی ہو ہر وقت، کیسے بھلا ماں دلہن دلہن کر کے پیچھے پیچھے پلو پکڑے رہتا ہے، اسی کے لئے اور اسی کے حوالے سے آئی ہو تم اس گھر میں، اس حقیقت کو جتنی جلدی قبول کر لو گی اتنا ہی اچھا ہو گا تمہارے حق میں۔'' وہ جانتی تھیں کہ اس کی خاموشی محض اس کے ابا کے مرنے کی شاخسانہ نہیں تھی بلکہ وہ آج تک اس حقیقت کو قبول ہی نہیں کر پائی تھی کہ اس کی اپنی سگی پھپھو اتنا بڑا دھوکا کر سکتی ہیں اس کے ساتھ۔

تائی بھی اپنی زیادتی سمجھتی اور جانتی تھیں کبھی پیار سے تو کبھی غصے سے سمجھاتی رہتیں کہ اب اس بھری دنیا میں جاذب اور ان کے سوا اس کا کوئی نہیں ہے سو اسے جلد ہی ان رشتوں کو دلی طور پر قبول کر لینا چاہیے۔

''اماں! مجھے چوری بنا دو ناں بھوک لگی ہے۔'' جاذب اب اماں کا پلو پکڑے کھڑا تھا۔

''ہاں میرا چاند چل تو اپنی دلہن کو اپنے کھلونے دکھا میں اپنے لعل کے لئے چوری بنا کے آتی ہوں۔'' تائی تو مخصوص اشارہ کر کے چلی گئیں کہ ان کے حکم کی تعمیل کی جائے، لمحوں میں ہی جازی نے ادھر ادھر سے اپنے کھلونے برآمد کیے اور دیا کے آگے ڈھیر کر دیئے۔

''یہ گاڑی، یہ بس یہ پستول، ٹھاہ ٹھاہ ایسے چلتا ہے۔'' وہ ایک ایک چیز کی تعریف کرتے ہوئے اس کا استعمال بھی بتا رہا تھا، دیا نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے بمشکل اپنی توجہ اس کی جانب مرکوز کی۔

شروع شروع میں تو اسے جازی سے بے حد خوف آتا تھا جیسے ہی اس کی ذہنی حالت کا پتہ چلا تھا وہ اکیلی اس کے ساتھ بیٹھنے سے گھبراتی تھی۔

''پھپھو...... وہ...... مجھے اس سے ڈر لگتا ہے، یہ مجھے مار نہ دے۔'' پہلی بار وہ جاذب کی حرکتوں سے گھبرا کے پھپھو کے کمرے میں آئی تھی، وہ تو بھڑک گئیں۔

''کیا مطلب مارے گا، تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے لڑکی، یہ میرا بچہ تھوڑا سا بھولا اور سادہ ضرور ہے مگر کوئی جنگلی یا پاگل تو نہیں ہے، غضب خدا کا، چلو میرے ساتھ اپنے کمرے میں۔'' وہ واپس اس کا بازو پکڑ کر اسے اس کے کمرے میں چھوڑ آئی تھیں، سلیمہ تائی نے چوری بنا کر اس کے سامنے رکھی۔

''لو اور کھلاؤ اسے، جب تک شادی نہیں ہوئی تھی اس کی تب تک تو ٹھیک تھا اب یہ تمہارا شوہر ہے تمہاری ذمہ داری ہے اور ہاں، جب اسے کچھ کھلاؤ پلاؤ تو کہانیاں سنایا کرو چھوٹی چھوٹی تب ہی شوق سے کچھ کھاتا ہے۔'' تائی نے ہدایت دیں اور خود سامنے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''شاباش کھلاؤ اسے۔'' انہوں نے حکم دیا۔

''دلہن مجھے شہزادی والی کہانی سناؤ، وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔'' جازی آلتی پالتی مار کر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور اشتیاق سے بولا۔

''آپ یہ کھالیں، میں آپ کو کہانی بعد میں سناؤں گی ابھی یاد نہیں ہے کوئی۔'' اس نے چوری والا پیالہ نزدیک کھسکایا اور آہستہ سے بولی۔

''نہیں نہیں پہلے کہانی سناؤ۔'' وہ بچوں کی طرح ٹھنکا۔

''اچھا سنو ایک شہزادی تھی بہت خوبصورت بہت معصوم، دنیا کے فریب سے بے خبر۔'' اس نے چوری کا نوالہ جاذب کے منہ میں دیتے ہوئے کہانی شروع کی، تائی نے دونوں کو مصروف دیکھا تو مطمئن ہو کر وہاں سے اٹھ گئیں۔

''بس دلہن میں نے کھا لیا اور تم لوری سناؤ

میں سوتا ہوں۔"

"وہ اماں سناتی ہے ناں چندا ماما والی۔" وہ پورا اونچا لمبا مرد وہیں پڑ کر بے تکلفی سے نہ صرف لیٹ گیا، اس کا ہاتھ اٹھا کر اپنے سینے پر دھرا بلکہ ساتھ ہی فرمائش بھی داغ دی۔

"مجھے لوری نہیں آتی۔" دیا نے اکتا کر اپنا ہاتھ کھینچا۔

"تمہیں مجھیں سناؤ، اماں والی نہیں آتی تو اور سناؤ مجھے لوری کے بغیر نیند نہیں آتی۔" اتنے دنوں میں دیا یہ جان ہی چکی تھی کہ وہ بے حد ضدی تھا، اپنی بات پوری نہ ہونے پر منہ پھاڑ کر روتا اور خوب توڑ پھوڑ کرتا۔

"اچھا چلو تم آنکھیں بند کرو میں سناتی ہوں۔" اپنی ناگواری کو دباتے اس نے سر پر دوپٹہ ٹھیک کیا اور ایک حمد جو اسے بے حد پسند تھی پڑھنی شروع کی۔

اس کی نیند واقعی بچوں والی تھی لمحوں میں بے خبر ہو جانے والی تھوڑی دیر میں ہی اس کے ہلکے ہلکے خراٹے گونجنے لگے، دیا نے چوری والا پیالہ اٹھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا، پائنتی پر رکھی چادر کو کھول کر جاذب کی ٹانگوں پر پھیلایا اور خود وہاں آ کر بیٹھ گئی جہاں ابھی کچھ دیر قبل اس کی پھپھی اور اب تو ساس بھی تھیں تشریف فرما تھیں۔

☆☆☆

زیادہ پرانی بات تو نہیں تھی جب وہ ابا کے ساتھ بے حد پر سکون اور مطمئن زندگی گزار رہی تھی، اماں تو اس کے بچپن میں ہی کسی بیماری کا شکار ہو کر گزر گئی تھیں، ابا ایک سرکاری محکمے میں کلرک تھے گزر بسر بہت اچھی نہ سہی بری بھی نہ تھی، ابا کی ریٹائرمنٹ کے بعد وہ بے حد کمزور ہو گئے تھے اور ہلکا ہلکا بخار بھی رہنے لگا تھا پہلے تو محلے کے ڈاکٹر سے دوائی وغیرہ لیتے رہے مگر افاقہ نہ ہونے پر بڑے ہسپتال دکھانے پر بہت سے ٹیسٹ ہوئے بہت پیسہ بھی خرچ ہوا تب ان پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ وہ کینسر جیسے ہولناک مرض کا شکار ہو چکے تھے جو کہ آخری اسٹیج پر تھا، اپنی بیماری کے غم سے زیادہ یہ فکر لاحق ہوئی کہ ان کے بعد ان کی دیا کا کیا ہو گا اور دور نزدیک کوئی رشتہ دار نہیں تھا، جس پر بھروسہ کر سکتے پھر انہیں برسوں سے روٹھی اس بہن کا خیال آیا جس کی بات ان کے ہونے والے سالے سے طے تھی مطلب وٹہ سٹہ کا رشتہ تھا مگر ان کو دیا کی ماں پسند آ گئی تھیں جو کہ ان کے دوست کی بہن تھیں اس سے شادی کے بعد ان لوگوں نے بھی سلیمہ کا رشتہ لینے سے انکار کر دیا تھا، سلیمہ کے دل میں بھائی کے لیے دراڑ پڑ چکی تھی کیونکہ اجمل جو کہ ان کا سالا بنتا اگر جو وہ شادی کرتے، کو دل دے بیٹھی تھیں، خیر ماں باپ نے سلیمہ کی شادی ایک اچھا رشتہ دیکھ کر کر دی، ماں باپ جب تک زندہ رہے سلیمہ میکے آتیں مگر بھائی بھابھی سے کلام نہ کرتیں کیونکہ ان کے میاں اچھے خاصے سخت طبیعت کے تھے تو اس چیز کو بھی وہ بھائی کے کھاتے میں ڈالتیں صرف یہی نہیں اپنی زندگی میں ہونے والی ہر اونچ نیچ کا ذمہ دار وہ اپنے بھائی کو گردانتی تھیں کہ نہ وہ دیا کی ماں سے پسند کا بیاہ رچاتے نہ انہیں اپنی محبت سے دستبردار ہونا پڑتا پھر اماں ابا کے یکے بعد دیگرے گزر جانے کے بعد سلیمہ کا بھائی کے ہاں آنا جانا بالکل ختم ہو گیا اور بعد میں جب ایک دو بار ان کے بھائی عید برات کے موقع پر گئے بھی تو انہیں منہ کی کھانی پڑی تھی کہ سلیمہ نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا تھا، اس کے بعد ایک طویل عرصہ تھا جو بھائی بہن کی اسی لاتعلقی میں گزرا، شادی کے پانچ سال بعد دیا کی پیدائش پر بھائی ایک بار پھر بہن کو منانے چل

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

پڑے تھے، مگر وہ بھی ایسی ضد کی پکی تھی کہ اس کی ناراضی ختم ہونے میں نہ آئی اور بھائی کو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ سلیمہ اس عرصہ میں ایک بیٹے کی ماں بن چکی تھی، پھر دیا کی ماں کی وفات کی خبر بھی بھائی نے سلیمہ تک پہنچائی تھی، اس کے نہ آنے پر بھائی کا دل ایسا کٹا ہوا تھا کہ اس نے بھی اپنے دل کو پتھر کر لیا تھا، پھر کتنا وقت ایسے ہی گزر گیا مگر جب دیا کے ابا کو کینسر جیسے موذی مرض کا انکشاف ہوا تو انہوں نے ایک بار پھر بہن کو طویل عرصہ بعد یاد کیا تھا اور خط لکھ کر کہا تھا کہ ان کی زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں وہ آخری بار ان سے ملنا چاہتے ہیں اور اس روز دیا کی حیرانی کی حد نہ رہی جب وہ کالج سے گھر واپس آئی تھی اور اپنے گھر میں ابا کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کرتی ایک عورت کو دیکھا جس نے اسے دیکھتے ہی اپنے ساتھ لپٹا کر چٹا چٹ پیار کرنا شروع کر دیا تھا، پھر ابا ہی نے بتایا تھا کہ وہ اس کی پھپھو سلیمہ تھیں، ابا سے غائبانہ اور سرسری ذکر سن رکھا تھا اس نے پھپھی کا مگر آج زندگی میں پہلی بار وہ ان سے مل رہی تھی، ابا اس دن اپنی بیماری اور اپنی تکلیف کو بھول کر بہت خوش تھے، پھر اس دن پھپھو کے جانے کے بعد ابا نے دیا کو اپنے پاس بلایا تھا۔

''بیٹھو میرے بچے، ایسی باتیں بیٹیوں سے مائیں کرتی ہیں مگر اب تو میں ہی تمہاری ماں ہوں اور میں ہی باپ۔'' ابا یہ کہہ کر کچھ دیر کو خاموش ہو گئے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔

''بیٹا! میں نے تمہارے حوالے سے بہت سے خواب دیکھے تھے مگر زندگی میں انسان کا ہر خواب نہیں پورا ہوتا، میرا اللہ مجھ سے راضی ہے تب ہی برسوں سے روٹھی بہن کو تو ملایا سو ملایا اس پاک ذات نے، گھر بیٹھے مجھے تمہاری فکر سے آزاد کر دیا مجھے۔'' دیا نے استفہامیہ نظروں سے ابا کو دیکھا جیسے ان کی بات کا مقصد جاننا چاہ رہی ہو۔

''تمہارا کیا ہوگا میرے بعد، یہ سوچ مجھے نہ مرنے دیتی ہے نہ جینے۔'' دیا کے آنسو نکل آئے تھے۔

''ابا...... ایسا مت کہیں، آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔''

''جاذب نام ہے تمہاری پھپھو کے بیٹے کا، اکلوتا بچہ ہے، بہت دکھ دیکھے ہیں سلیمہ نے، جاذب چھوٹا تھا تو بیوہ ہو گئی بیچاری، ساری زندگی ایسے ہی گزار دی اپنے بچے کے لئے اب برسوں بعد میری بہن نے مجھ سے کلام کیا ہے اور اپنے اکلوتے بچے کے لئے ہاتھ پھیلایا ہے میں نے تم سے پوچھے بغیر ہاں کر دی بیٹا۔'' ابا بولتے بولتے رک گئے۔

''میں نے ٹھیک کیا ناں بیٹا، سلیمہ بتا رہی تھی کہ اپنے پروں میں چھپا کے پالا ہے اس نے اپنے بچے کو، دنیا کے مکر و فریب سے انجان سیدھا سادہ بچہ ہے، خوش رکھے گا تمہیں انشاء اللہ، میں نے سلیمہ کو اگلے ماہ کی تاریخ دے دی ہے شادی کی، میں اپنی زندگی میں ہی تمہارے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔'' ابا نے دیا کے سر پر ہاتھ رکھ کر نرم لہجے میں کہا تو وہ بے ساختہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو پڑی۔

''میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی ابا، آپ کا خیال کون رکھے گا اور آپ کی دوائیاں وقت پر کون آپ کو یاد کروائے گا۔'' ابا مسکرا دیئے اس کی باتوں پر۔

''پگلی! بیٹیاں تو بادشاہوں کی بھی گھر نہیں بیٹھی رہیں، تمہاری شادی کر کے دیکھنا جب تم اپنے میاں کے ساتھ مجھ سے ملنے آؤ گی تو کیسا بھلا چنگا پاؤ گی مجھے۔'' ابا نے کہا تو وہ اس نے

سوں سوں کرتے سر جھکا لیا، پھپھو نے ایک بھلا کیا تھا کہ جہیز کے نام پر ایک پائی بھی لینے سے انکار کر دیا تھا اور اگلے چکر پر اس کے لئے خوبصورت ملبوسات، ایک انگوٹھی اور میچنگ کے لوازمات کے ساتھ جاذب کی تصویر بھی لیتی آئیں، دیا تو کتنی دیر اس خوبرو شخص کی تصویر کو دیکھتی رہ گئی اور لمحوں ہی میں کئی روپہلے خواب اس کی آنکھوں کی زینت بن گئے۔

"جاذب کو ساتھ لے آتیں سلیمہ؟" ابا نے استفسار کیا۔

"آنا تھا بھائی اس نے مگر عین وقت پر اپنے چچازاد کے ساتھ کہیں جانا پڑ گیا اسے، اب تو انشاء اللہ شادی پر آئے گا۔" سلیمہ نے اطمینان سے کہا پھر دیکھتے ہی دیکھتے مہینہ کیسے گزرا پتہ ہی نہیں چلا اور جس دن دیا اپنا سرٹیفکیٹ لینے کالج گئی تھی وہی دن تھا جب عمر نے اسے دیکھا تھا اور وہی اس کا کالج میں آخری دن تھا، سلیمہ نے کہا تھا کہ وہ اگر چاہے گی تو اپنی تعلیم شادی کے بعد جاری رکھ سکتی ہے۔

☆☆☆

جاذب جب پیدا ہوا تو ایک نارمل بچے جیسے تھا مگر جاذب گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بات آشکار ہو گئی کہ وہ جسمانی طور پر تو صحت مند تھا مگر اس کا ذہن اس کی جسمانی نشوونما سے بہت پیچھے تھا، سلیمہ شروع سے ہی ضعیف الاعتقاد تھیں سو ڈاکٹرز کی بجائے پیروں فقیروں کے آستانوں پر زیادہ وقت گزرنے لگا ان کا، شروع سے احساس کمتری کا شکار سلیمہ بھی اپنی سسرال میں گھل مل کر نہ رہیں پھر جب اپنی جیٹھانی کے صحت مند بچوں کا مقابلہ اپنے جاذب سے کرتیں عجیب سا احساس عود آتا جو ان کو گھر والوں سے دور اور خود کے طے کردہ اصولوں اور مفروضات کے مزید قریب کر دیتا، رہی سہی کسر بیوگی نے پوری کر دی تھی، حالانکہ جیٹھ کے بھائی کے مرنے کے بعد درمیان کی دیوار گرا دی تھی، یوں دونوں گھر بظاہر ایک تھے مگر سلیمہ اپنے جس خول میں قید تھیں اس سے کبھی باہر نہ آ سکیں، ان کی جیٹھانی بھی اچھی عورت تھیں وہ بھی آ جاتیں، بچے بھی جاذب کے ساتھ آ کر کھیلتے کبھی اسے اپنے ساتھ لے جاتے مگر سلیمہ بہت کم خود ان کے ہاں جاتی، ان کے جیٹھ نے اپنے بھائی کی دو دکانوں کو کرائے پہ دے کر ان کا کرایہ سلیمہ کے لئے مختص کر دیا اور خود بھی گاہے بگاہے امداد کر دیا کرتے تھے، پھر ایک بار وہ اپنی بیوی کو لئے سلیمہ کے پاس آئے تھے کہ جاذب پاگل نہیں ہے صرف اپنی عمر سے چند سال پیچھے ہے تو انہوں نے ایک ادارے میں اس کا نام داخل کرانے کی تجویز رکھی جو ایسے ہی بچوں کی تدریس کے لئے تھا مگر سلیمہ نے اس تجویز کو یکسر مسترد کر دیا۔

"میں اپنے بچے کو اپنی آنکھوں سے دور نہیں رکھ سکتی بھائی، یہ کوئی عام بچہ تو ہے نہیں، ہر پل اور ہر کام اسے ماں کی ضرورت ہوتی ہے وہاں سکول کون اس کا خیال رکھے گا۔" انہوں نے گیارہ سالہ جاذب کو پکڑ کر خود سے چمٹا لیا جیسے اسے زبردستی وہ لوگ ساتھ لے جانے کے لئے آئے ہوں۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں بھابھی آپ؟ جاذب ہمارا بھی بچہ ہے، میں چاہتا ہوں یہ بھی عام نارمل بچوں کی طرح زندگی گزارے، آپ کی اس قسم کی توجہ ٹھیک نہیں ہے، میں نے ایک دو ڈاکٹروں سے بھی بات کی ہے، مسلسل علاج سے یہ اپنے ہم عمر بچوں جیسا تو نہیں ہو سکتا بہرحال بہتر ضرور ہو جائے گا، مگر اس کے لئے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔" وہ ان کو قائل کرنے کی

کوشش کر رہے تھے۔

"نہیں نہیں، یہ کسی ڈاکٹر کو نہیں دکھاؤں گی اسے، ایک دفعہ لے گئے تھے حاذق کے ابو ڈاکٹر کے پاس، اس نے کوئی ایسی دوائی دی تھی کہ تین دن میں کوئی دو گھنٹے بیدار رہا میرا بچہ باقی وقت سوتا ہی رہا میں نے تب سے توبہ کر لی تھی ان موئی انگریزی دواؤں سے۔" سلیمہ نے فوراً ہی انکار کر دیا تھا اور اس کے بعد سلیمہ کے رویے نے ہی جاذب کو بچہ بننے میں اور مدد دی تھی وہ اپنے ہر کام کے لئے ماں کی طرف دیکھنے کا عادی ہو گیا اور اس میں خود اعتمادی کا عنصر اگر تھا بھی تو سلیمہ کے اس رویے کے بعد صفر ہو گیا، پھر جاذب کی بات طے کر کے اس نے بڑے فخریہ انداز میں سب کو اطلاع دی تھی اور جاذب کو دو گھنٹے بیٹھ کر سمجھایا تھا کہ دلہن کے گھر چپ بیٹھا رہے ورنہ وہ دلہن نہیں دیں گے اور نہ صرف یہ بلکہ اسے بار بار اپنا نام لکھنے کی مشق بھی کروائی رہی تھی، نام جاذب کو اپنے ابا کی زندگی سے ہی لکھنا آتا تھا اور شادی کے دن تک سلیمہ کی پڑھائی پٹی اس حد تک رنگ لائی کہ اگر سلیمہ کھانے کا بھی پوچھتیں تو جاذب کہتا کہ قبول ہے، قبول ہے، قبول ہے، اور پوچھتا کہاں دستخط کرنے ہیں اور آخر کار وہ دیا کو بیاہ کر لے آئی تھیں، جاذب نے انہیں مایوس نہیں کیا تھا، تمام وقت سنجیدہ ہو کر بیٹھا رہا تھا، پھر جیسے جیسے سلیمہ نے سمجھایا تھا اس نے وہ تمام افعال بڑی بے نیازی سے سرانجام دیئے تھے، دیا جس کو اپنے گھر آ کر کچھ کچھ صورتحال کا اندازہ ہوا تھا کچھ دن تو اسی صدمے میں ہی گزرے کہ اتنا بڑا دھوکہ اور فریب کوئی اپنا کیسے کر سکتا ہے اور جس دن اس نے ابا کو بتانے کا ارادہ کیا اسی روز ابا کی بے حد طبیعت کی خرابی کی اطلاع ملی تھی، ابا شاید اس کے رخصت ہونے کے انتظار میں تھے اور اپنی دیا کا دکھ جانے بنا ہی دیا کو آخری بار دیکھنے کی حسرت لئے منوں مٹی تلے اتر گئے تھے۔

☆☆☆

خدیجہ حیرت سے منہ کھولے بس اپنے چہیتے کے فرمودات سن رہی تھیں۔

"خدا کے لئے، خدا کے لئے عمر چپ ہو جاؤ ورنہ قیامت آ جائے گی بیٹا۔" حیرت کے اس جھٹکے سے بمشکل نکلنے کے بعد وہ اس کے پاس آ بیٹھیں۔

"تمہاری تائی تو ویسے بھی ہمیشہ ہم سے دور دور رہیں، ایک دفعہ کسی ہمسائی سے انہوں نے کہا کہ یہ بیٹوں کی ماں ہونے پر اکڑتی ہے، میرے اگر بیٹے ہوتے تو مجھ میں بھی یہی مان ہوتا، اب ان کو پتہ چل گیا کہ ایسی بات میرے بچوں میں سے کسی نے منہ سے نکالی ہے تو، بس چپ کر جاؤ تم، ویسے بھی جاذب پاگل نہیں ہے، جو اس کا نکاح جائز نہیں ہے اپنی عمر سے چند سال پیچھے ہے بس سمجھ بوجھ رکھتا ہے، پہچان رکھتا ہے۔" وہ اسے سمجھاتے سمجھاتے روہانسی ہو گئیں، وہ چاہتی تھیں کہ اس نے جو بات زبان سے نکالی ہے اسے ایسے سمجھا دیں کہ وہ دوبارہ ایسی بات نہ کرے جب سے آیا تھا گھر پہلے دو دن تو گھر میں بلکہ کمرے میں قید گزارے تھے آج کمرے سے باہر آیا تھا تو نکلتے ہی اس نے کہا تھا کہ جاذب ایک عقل سے عاری انسان ہے سو اس کا نکاح جائز نہیں ہے، تائی سلیمہ یقیناً دھوکا کر کے ایک معصوم لڑکی کو بیاہ لائی ہیں مگر وہ جلد ہی ایک عالم سے رابطہ کرنا چاہتا ہے تاکہ دیا کو اس نام نہاد بندھن سے چھٹکارا دلا سکے، خدیجہ تو حق دق رہ گئیں، عمر کو سچ بولنے اور اس پر ڈٹے رہنے کی عادت تھی مگر وہ عادت اب ان کے گلے پڑنے والی تھی یہ نہیں جانتی تھیں۔

''آپ مجھے جو کہیں یہ بات آپ بھی جانتی ہیں اور میں بھی کہ جازی ایک ایب نارمل انسان ہے اور بھلے وہ ایک ستائیس سالہ نوجوان ہے مگر اس کے جسم میں ایک سات سال کے بچے کا دماغ ہے اور وہ رشتوں کی نزاکت اور تقاضوں کو نہیں سمجھتا، آپ کی بیٹی کے ساتھ ایسا ہوا ہوتا تو آپ چپ رہتیں کیا؟'' وہ جذباتی ہو گیا۔

''تم بھول رہے ہو میری جان کہ دیا کے ابا بھی سلیمہ کے بھائی تھے اور انہوں نے بخوشی اپنی بیٹی کی شادی جاذب سے کی ہے، تم بھول جاؤ یہ بات اور خدا کے لئے دوبارہ منہ سے مت نکالنا۔'' خدیجہ کے کہنے پر وہ اس بار قائل ہوا یا نہیں سر جھکائے چپ چاپ بیٹھا رہا تھا۔

☆☆☆

دیا نے قسمت سے سمجھوتا کیا تھا یا نہیں مگر یہ کہ جاذب کو اپنے ساتھ کھیلنے والا ایک ساتھی ضرور مل گیا تھا، سلیمہ ایک روٹین کی طرح اسے کپڑے نکال دیتیں وہ پہن لیتی، وہ چاہتیں کہ وہ ہر وقت بنی سنوری رہے، ہاں یہ تھا کہ انہوں نے دیا سے کہا تھا کہ وہ صرف جاذب کا خیال رکھے باقی کام کاج وہ خود سنبھال لیں گی اور واقعی میں دیا کسی کام کو کرنے کی کوشش بھی کرتی تو اسے جاذب کے ساتھ مصروف کر دیتیں، دیا کو لگتا کہ وہ سہاگن بننے سے پہلے ہی ماں بن گئی تھی مگر ایک ستائیس سالہ بچے کی۔

''دلہن۔'' جازی نے کمرے میں جھانک کر اپنی سوچوں میں گم بیٹھی دیا کو پکارا۔

''آج تم نے سرخی کیوں نہیں لگائی؟''

''ویسے ہی دل نہیں کر رہا۔'' وہ بے زاری سے بولی۔

''چلو آج میں تمہیں میک اپ کروں۔'' اس نے کہتے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل میں سے لپ اسٹکس نکال نکال کر کھول کے دیکھنا شروع کیں، آخر ایک لپ اسٹک کو کھول کر کچھ لمحے غور سے دیکھنے پر اسے وہ پسند آ گئی۔

''دلہن اب تم چپ کر کے بیٹھی رہو بس۔'' اس نے اس کا چہرہ پکڑ کر زور سے اپنی طرف گھمایا اور جیسے جیسے دیا کو دیکھا کرتا تھا اپنی سمجھ کے مطابق اپنا ہنر آزمانا شروع کیا، مگر جب جاذب نے خود کی کارکردگی سے مطمئن ہو کر اسے چھوڑا اور خود تالیاں بجاتے ہوئے خود کو داد دینے لگا تو دیا کی نظریں جیسے ہی آئینے میں نظر آتے اپنے عکس پر پڑیں اس کی بے ساختہ ہنسی نکل گئی ساتھ ہی کئی دن کی جمع ہوتی ہوئی کثافت کو بھی اس نے زائل ہوتا محسوس کیا۔

''ارے دلہن! یہ کیا ستیاناس مار لیا اتنے خوبصورت چہرے کا۔'' سلیمہ پھپھو نے اندر آ کر بے ساختہ کہا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

''اماں! دیکھو تو دلہن کو میں نے کتنا پیارا تیار کیا ہے، اب میں دلہن کو تیار کروں گا روز۔'' جاذب نے خوش ہو کر کہا۔

''اچھا دلہن، تم اب منہ ہاتھ دھو لو پھر آ کر شام کے لئے کپڑے نکالو اپنے، خدیجہ بھابھی کے گھر دعوت ہے آج، وہ تو دو دفعہ پہلے بھی بلاوہ دے چکے ہیں مگر پہلے بھائی کی بیماری اور پھر ان کی وفات نے کچھ سوچنے اور کرنے کی مہلت ہی کہاں دی، آج صبح فوزی ایک بار پھر بھابھی خدیجہ کا پیغام لے کر آئی تھی۔'' انہوں نے اس کی الماری کھول کر کپڑوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا، ویسے بھی دیا کو بہو بنا کر انہوں نے اس طرف سے تو بھابھی خدیجہ کو مات دے دی تھی کہ ان کی کوئی بہو تو خوب صورتی میں ان کی بہو کے ہم پلہ نہ تھی نہ نبیل بھائی کی بیوی نہ ارمن کی منگیتر سارہ، حالانکہ خدیجہ بیگم کے ذہن میں ایسی کوئی

مقابلہ بازی تھی ہی نہیں مگر کیا کیا جائے کہ سلیمہ کا شمار ان ناشکرے لوگوں میں تھا جو ان نعمتوں کی قدر نہیں کرتے جو انہیں قدرت ودیعت کرتی ہے بلکہ ہمیشہ ناشکرے پن کی انتہا کرتے ہوئے ہمیشہ خدا سے شکووں کے انبار لگائے رکھتے ہیں کہ یہ نہیں دیا، وہ نہیں دیا، ایسے میں ہر وہ نعمت جو ان کے پاس نہیں ہوتی دوسروں کے پاس دیکھ کر حسد میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔

"دیکھیں تو بچی! میری دلہن۔" دعوت میں جاذب اس کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر سب کو خوش ہو کر دکھا رہا تھا جیسے وہ اس کی دریافت ہو۔

"ہاں بچے بہت پیاری ہے تمہاری دلہن، اللہ نصیب اچھا کرے۔" خدیجہ بھابھی نے دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا، عمر محض ہنکارا بھر کر رہ گیا، خدیجہ نے قسم نہ دی ہوتی تو وہ ضرور کچھ بولتا، سو کچھ دیر محفل پر بیٹھنے کے بعد جب ضبط حد سے بڑھا تو وہ اٹھ گیا، جاتے جاتے اس پر ایک بے اختیاری نظر پڑی تھی جو قاری کی کسی بات پر افسردہ سی مسکرا رہی تھی، پتہ نہیں کیوں جاذب سے بے انتہا حسد محسوس ہوا اسے ورنہ جاذب ان کے گھر کا خاصا لاڈلا بچہ تھا، جس طرح ان کے والد اپنی زندگی میں اس کے لاڈ اٹھاتے تھے ویسے ہی ان کی وفات کے بعد اس کی اہمیت کم نہ ہوئی تھی مگر پہلی دفعہ تھا جب عمر گھر آنے کے باوجود نہ تو جاذب سے ملنے گیا تھا اور نہ اسے بلوا بھیجا تھا، بلکہ ایک دفعہ کمیل بھیا نے قاری کو کہا تھا کہ جاذی کو بلا لائے وہ آئسکریم لائے ہیں مگر خدیجہ نے انہیں بھی ٹوک دیا تھا۔

"نہیں قاری مت جاؤ تم وہ اب گھر بار والا ہے اسے بچے کی طرح سے ٹریٹ کرنا چھوڑ دیا جائے۔"

"لو اب بچوں کو بچوں کی طرح ٹریٹ نہ کیا جائے گا، خود سوچیں کمیل بھیا میں آفاق کو کہوں کہ اخبار پڑھ کر سنائے تو کتنا مضحکہ خیز لگے گا۔" عمر جو پاس ہی بیٹھا اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

"امی عمر ٹھیک کہہ رہا ہے، سب سمیت تائی کو بھی پتہ ہے کہ جاذی کو آئسکریم کتنی پسند ہے اور میں ہمیشہ لے کر آتا ہوں اس کے لئے، کوئی نئی بات تو نہیں ہے یہ، بلکہ امی ایک اور بات بھی ہے۔" انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اپنی آواز آہستہ کی۔

"آپ کو نہیں لگتا کہ تائی کو جاذب کی شادی نہیں کرنی چاہیے تھی پہلے تو میں سمجھا تھا کہ جاذب کے جیسی ہی کوئی لڑکی ڈھونڈی ہے تائی نے مگر اب دیا کو دیکھ کر اندازہ ہوا ہے کہ یہ ظلم ہے اس بچی پر۔"

"لو ایک نہ شد دو شد۔" خدیجہ تلملائیں۔

"ارے کیا کچھ نہیں ہو رہا یہاں اور تم لوگ پتہ نہیں کس دنیا میں رہ رہے ہو، اچھا ہے بچی کو گھر بار کا کر دیا ورنہ باپ کے بعد کیا ہوتا بچاری کا۔"

"ہونہہ گھر بار کا نہیں کیا اپنے پاگل بیٹے کے لئے عمر بھر کے لئے ایک آیا خرید لے آئی ہیں محترمہ۔" عمر نے تلخی سے کہا۔

"اچھا بس اب میں یہ ذکر دوبارہ نہ سنوں اس گھر میں۔"

"کس چیز کی کمی ہے بھابھی سلیمہ کے گھر گڑیا کی طرح رکھا ہوا ہے اسے۔"

"ہاں مگر امی آپ کی طرح وہ بھی بھول گئی ہیں کہ وہ گڑیا نہیں ہے جسے وہ اپنے گڈے کے لئے بیاہ لائی ہیں، میں تو سوچ رہا ہوں کہ دیا سے بات کرتا ہوں اگر وہ راضی ہے تو میں عدالت لے جا کر تائی کا سارا کچا چٹھا کھول کر اسے ان لوگوں سے چھٹکارا دلوا دوں۔" عمر کا پر سوچ انداز

میں کہنا تھا کہ تائی دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

"سہیل تم کیوں کچھ نہیں کہتے ہو اسے؟ کیوں بڑھاپے میں میرے سر میں خاک ڈالنے کو ہے، اپنے قریبی رشتے داروں کے انتہائی گھریلو اور پیچیدہ معاملات میں دخل اندازی اور وہ بھی ایسی بے تکی دخل اندازی کر کے کیوں اپنے باپ دادا کے نام کو دھبہ لگانا چاہتا ہے۔" روتے روتے وہ سہیل بھائی سے اس کی شکایت کرنے لگیں، عمر کوئی بات سنے بغیر جھٹکے سے وہاں سے اٹھ گیا۔

☆☆☆

دیا نے سلیمہ پھپھو سے کہہ کر جاذب کے لئے ابتدائی جماعتوں کی کچھ کتابیں منگوائی تھیں، اس نے دیکھا تھا کہ سلیمہ پھپھو نے جاذب کے کھیلنے کے لئے دنیا جہان کے کھلونے اکٹھے کر رکھے تھے مگر اس کی تعمیری تربیت کے لئے گھر میں کوئی ایک چیز نہ تھی، بچے تو کچی مٹی کی سی فطرت رکھتے ہیں، تربیت کے جس سانچے میں ڈھالو اسی کا روپ اختیار کر لیتے ہیں، جاذب بھی جب تک تایا ابا زندہ رہے اس کے ساتھ پڑھائی میں بہت دماغ کھپاتے تھے اگرچہ پانچ سال کا ہونے کے باوجود اس کا دماغ سال ڈیڑھ سال کے بچے کے جتنا تھا اور کچھ سیکھنے کے لئے تیار نہیں تھا مگر سال چھ ماہ کی مسلسل محنت کے بعد جاذب کے ابا اس کو اس کا اپنا اور اپنے ابا کا نام لکھنا سکھا چکے تھے اور جب کچھ اس کے دماغ نے لکھنے پڑھنے کی تحریک پکڑی تھی اس کے ابا اس کے لئے کتابیں لے آئے تھے سہیل عمر اور ارمان کے ساتھ جاذب کو بھی پڑھاتے تھے اگرچہ وہ ان کے ذہنی اور تعلیمی معیار سے بہت پیچھے تھا مگر تایا ابا کی خواہش تھی کہ وہ خود کسی قابل ہو سکے، مگر ان کی اچانک موت نے ہر چیز کو تلپٹ کر دیا تھا، اب بہت عرصہ بعد جاذب نے رنگ برنگی کتابیں، کلرز، پنسلز دیکھیں تو بہت خوش ہوا، سلیمہ پھپھو نے دونوں کو مصروف دیکھا تو بہت دن سے بازار کے جو کام رکے ہوئے تھے کرنے چل دیں، عمر جس نے آج واپس جانا تھا، تائی سلیمہ کو رکشے پر سوار ہوتے دیکھ کر لمحوں میں کوئی فیصلہ کیا اور اگلے دس منٹ میں وہ اپنے گھر کے پچھلے دروازے سے تائی سلیمہ کے گھر میں موجود تھا، دیا حسب معمول اس کو دیکھ کر گھبرا گئی تھی، پتہ نہیں کیوں اس کو دیکھ کر کیوں احساس زیاں شدید ہو کر پچھتاؤں میں تبدیل ہو جاتا تھا اور ایسا کیوں ہوتا تھا یہ اسے اب پتہ چل رہا تھا جب عمر نے وقت کو بے حد قیمتی جان کر اس نے اسے دیکھ کر اپنی زندگی اور دل میں جگہ دینے اور بعد میں کئی ماہ اس کی تلاش کی روداد کس قدر بے بسی کے عالم میں بیان کر دی، مگر پھر اسی جوش سے ایک نظر کتابوں کو خوشی سے ورق ورق پلٹتے جاذب پر نگاہ کی اور فیصلہ کن انداز میں گویا ہوا۔

"مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا یقین کرو دیا، تم مجھے تمام عمر نہ ملتیں میں وہ بھی اپنی قسمت کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لیتا مگر اتنی بڑی زیادتی پر وہ بھی اس ہستی کے ساتھ جو آپ کے دل کے بے حد قریب ہو خاموش رہنا ممکن نہیں ہے، تمہیں صرف ایک بیان پر دستخط کرنے دینے ہیں، عدالت کی ایک ہی پیشی پر فیصلہ تمہارے حق میں ہوگا جب یہ بات سامنے آئے گی کہ تم اور تمہارے والد جاذب کی ذہنی حالت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے ورنہ تم لوگ ہرگز اس رشتہ پر ہامی نہ بھرتے۔"

"نہیں نہیں عمر صاحب، خدا کے لئے چپ ہو جائیں، جو کچھ بھی ہوا میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں اور اپنی قسمت سے سمجھوتہ کر چکی

ہوں یہ سوچ کر کہ میرے مرحوم والد کی آخری خواہش کا نتیجہ ہے، مجھے کسی قسم کے کاغذ پہ نہ تو دستخط کرنے ہیں نہ بیان دینا ہے۔" پہلے تو آنکھوں میں بے تحاشا حیرت لئے اسے تکتی رہی تھی مگر اس کی تجویز نے اسے بوکھلا دیا، وہ ہرگز اتنی بہادر نہیں تھی کہ اس قسم کے فیصلے کے لئے عدالتوں، کچہریوں کے چکر لگاتی جو اسے بے گھر، بے نام کر دیتے، وہ بے حد خوفزدہ ہو گئی تھی۔

"ایک تو میں عورتوں کی اس مشہور زمانہ بزدلی سے بڑا تنگ ہوں ہر بات پہ ایسے ری ایکٹ کرتی ہیں جیسے قتل کرنے کو کہہ دیا گیا ہو۔" وہ جھنجلا گیا۔

"او اللہ کی بندی، میں تمہارے ساتھ ہوں گا ہر قدم تمہارے اس زیادتی سے چھٹکارا دلوانے سے لے کر تمہیں اپنانے تک، میرا یقین کر و دیا، اپنے آپ کو ضائع مت کرو، میں قسم کھاتا ہوں کہ اگر تمہارے والد بھی زندہ ہوتے اور انہیں حقیقت کا ادراک ہو چکا ہوتا تو وہ بھی میرا ساتھ دیتے۔" وہ ہاتھ آئے وقت کو گنوانا نہیں چاہتا تھا، ایک دفعہ اگر دیا قائل ہو جاتی تو وہ اس کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔

"کچھ بھی کہیں آپ عمر صاحب، حقیقت یہی ہے کہ میرے ابا مجھے میری پھپھو کے زیر دست چھوڑ کر گئے ہیں اب میں دنیا میں موجود اپنے واحد خونی رشتے کو کھونے کے حق میں نہیں ہوں، آپ اب جائیں پھپھو آئیں گی تو انہیں شاید اچھا نہ لگے، چلو جاذب جو میں نے آپ کو ابھی سبق دیا تھا وہ سنائیں۔" اسے جواب دے کر وہ اس کی طرف قصداً رخ موڑ کر جاذب کے ہاتھ میں پکڑی بک کو خوامخواہ کھولنے لگی، اگرچہ جو راستہ وہ دکھا رہا تھا دل ہمک کر اس راستے پر اس کے ہمراہ چلنے کے راگ الاپ رہا تھا جو تھا تو خوشنما مگر اسے اس راستے پر جانے کے لئے بہت کٹھنائیاں تھیں جنہیں یاد کرنے کی ہمت وہ خود میں نہیں پاتی تھی۔

"ٹھیک ہے جن لوگوں کو خود اپنی زندگی آزار بنانے کا شوق ہوتا ہے ان کے لئے دوسرا کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔"

"ہاں مگر یہ بھی پتہ ہونا چاہیے کہ زندگی بہت لمبی ہوتی ہے اور اسے برتنے کے لئے مضبوط اور دل چاہے سہارے درکار ہوتے ہیں ورنہ زندگی بوجھ لگنے لگتی ہے اور جب ایسی ہی کوئی بات ہو تو مجھے آواز دینا، میں آج کی طرح کل بھی تمہارا منتظر رہوں گا۔" دیا نے اپنے بالکل پیچھے ہی اس کی آواز سنی، وہ ساکت رہ گئی، آنکھوں کے چشمے ابل پڑے، مگر وہ اس پل اپنی کوئی کمزوری اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی سو ویسے ہی رخ موڑے کھڑی رہی، عمر نے چند لمحے انتظار کیا اور کسی تھکے ہوئے مسافر کی مانند وہاں سے چلا گیا۔

"دلہن کیا ہوا؟ تم کیوں رو رہی ہو؟ عمر بھیا گندے ہیں، میں ان کو پستول کے ساتھ ماروں گا، ان کے اوپر ٹرین چڑھا دوں گا، بس اب چپ کر جاؤ۔" اسے پھوٹ پھوٹ کر روتا دیکھ کر جاذب اسے اپنی سمجھ کے مطابق چپ کروانے لگا۔

☆☆☆

گھر سے وہ بالکل الجھا ہوا واپس آیا تھا، بہت سے کام اس کی توجہ کے منتظر تھے مگر اس بار کام میں اس کا ارتکاز ویسا نہیں تھا جیسا کہ عموماً ہوتا تھا ہر چیز پس پشت ڈال کر پوری لگن سے پروگرام کرتا تھا ابھی دنوں میں اس کی شہرت کے ڈنکے بج رہے تھے اور اس کا ہر پروگرام بے حد

ہٹ جاتا تھا، بہت دنوں کی فراغت کے بعد وہ گھر پر تھا، حسب معمول سارہ اور حسن کی نوک جھونک جاری تھی مگر پہلے کی طرح وہ اس ماحول کا حصہ نہیں تھا، پتہ نہیں کن سوچوں میں گم تھا جب سارہ نے اس کا بازو پکڑ کر ہلایا۔

''کیا بوریت پھیلائی ہوئی ہے عمر بھائی، کتنے دنوں سے نہ آپ ہماری کسی محفل میں شامل ہوئے، نہ کہیں آؤٹنگ پر لے گئے، پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے آپ کو۔''

''آں ہاں گڑیا، کچھ نہیں بس اس بار پروگرام کا ٹاپک تھوڑا ڈفرنٹ تھا تو کافی محنت کرنی پڑی یار، تھک گیا ہوں بہت اور تو کوئی بات نہیں ہے، پروگرام بناؤ شام کو ہی آؤٹنگ پہ چلتے ہیں۔'' وہ زبردستی بشاشت سے خود کو ماحول کا حصہ بناتے ہوئے بولا۔

''یس...... یہ ہوئی ناں بات، حسن بھائی بتائیں ناں کہاں چلیں؟۔''

''آج بہت دنوں بعد عمر بھائی کی حاتم طائی والی روح بیدار ہوئی ہے اس کے سو جانے سے پہلے فیصلہ ہو جانا چاہیے۔'' سارہ پرجوش سی بولی، جبکہ اتنی دیر میں عمر گھر سے آنے والا فون ریسیو کر چکا تھا، اس دن جو وہ گھر سے امی کی باتوں سے ناراض ہو کر نکلا تھا تو پھر پلٹ کر رابطہ نہیں کیا تھا نہ ہی گھر والوں نے ایسی کوئی خاص زحمت کی تھی، بلکہ خدیجہ بیگم تو چاہتی تھیں کہ اس وقت وہ گھر سے دور ہی چلا جائے تو زیادہ بہتر ہے ان کے خیال میں گھر میں فارغ بیٹھ کر اس کے ذہن میں ایسے انوکھے خیالات جنم لیتے تھے جو دوسروں کے ہوش اڑا دینے کی صلاحیت رکھتے تھے، آج پورے ایک ماہ اور تیرہ دن کے بعد فاری کے نمبر سے کال آئی تھی، اس نے کسی قدر ناراضی سے کال ریسیو کی مگر دوسری طرف سے فاری نے جو اطلاع اسے دی تھی وہ سن کر اسے ناراضی کا ہوش نہیں رہا تھا، وہ اضطراری انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''وہ کیسے اور کب ہوا؟ جنازہ کب ہے؟''

اس کی اس قسم کی باتوں سے سارہ نے بوکھلا کر حسن کو دیکھا، وہ بھی گھبرا کر عمر کے نزدیک آ گیا۔

''میرے کزن جاذب کی کسی زہریلی چیز کھانے سے ڈیتھ ہو گئی ہے مجھے فوراً نکلنا ہے سارہ، تم ماموں اور ممانی کو اطلاع کر دو۔'' کال ڈراپ کر کے عمر نے جلدی جلدی ان دونوں کو کہا اور خود حسن کو کچھ ضروری ڈاکومنٹس پروگرام منیجر تک پہنچانے کا کہہ کر خود کمرے سے باہر نکل گیا، ماموں، ممانی بھی عمر کے ساتھ آئے تھے، جنازے میں شرکت کے لئے، تائی غش پہ غش کھا رہی تھیں، جبکہ وہ کونے میں کسی بت کی مانند ایستادہ تھی، فاری نے اسے بتایا کہ جاذب کو ٹمپریچر تھا، تائی سلیمہ نے اسے دوائی دے کر اسے سلا دیا تھا مگر جب تائی اور دیا سوئی ہوئی تھیں جاذب نے خود اٹھ کر اپنی مرضی سے کوئی گولیاں بڑی مقدار میں کھالی تھیں اور سو گیا تھا، اگر بروقت پتہ چل جاتا تو معدہ واش کر کے اس کی جان بچائی جا سکتی تھی مگر وہ مغرب تک سویا رہا تھا اور مغرب کے بعد اسے خون کی الٹیاں شروع ہو گئی ہیں، پھپھو سلیمہ نے گھبرا کر سہیل بھائی کو بلایا تھا، وہ جاذب کو ہسپتال لے کر گئے تھے مگر وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس نے دم توڑ دیا تھا، وہ تو بعد میں پتہ چلا تھا کہ گولیوں کی پوری ڈبی خالی تھی جو سلیمہ خالہ بی پی کے لئے استعمال کرتی تھیں، خدیجہ بیگم اور فاری مسلسل تائی سلیمہ کے گھر تھیں وہ ابھی تک اپنے حواسوں میں نہیں تھیں، ہوش میں آتے ہی کبھی خود کو کوسنے اور پیٹنے لگتیں کہ ان کی لاپرواہی نے ان کا بیٹا ان سے چھین لیا تھا، کبھی وہ دیا کو کوستیں کہ وہ کیسی بیوی ہے کہ اس کا خاوند دنیا سے

تکلیف سے تڑپتا چلا گیا اور بے خبری کی نیند سوتی رہ گئی تھی، خدیجہ بیگم انہیں سمجھا سمجھا کر بے حال ہو جاتیں، پھر تو انہیں انجکشن دے کر سلانا پڑتا، خوشیوں کی چھاؤں بھرے دن ہوں یا تپتی راتیں، وقت بہر طور کسی نہ کسی حال میں گزر ہی جاتا ہے، پھپھو سلیمہ کو صبر آیا تھا یا نہیں تاہم وہ حواسوں میں ضرور لوٹ آئی تھیں، عمر بھی واپس جاب پر آ گیا تھا، پھر جاذب کی موت کو ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔

☆☆☆

ارمان کے چھٹی پر آتے ہی اس کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے جو کہ سارہ کے ساتھ ہونا طے پائی تھی، عمر نے شادی سے تین دن پہلے آنا تھا، تائی سلیمہ کو تو جاذب کی موت سے جو چپ لگی تھی اب تک ویسے ہی تھا۔

وہ سارا دن جاذب کے کھلونے، اس کے کپڑے دیکھ دیکھ کر روتی رہتیں، قاری کی فرمائش پر خدیجہ بیگم نے ڈھولکی رکھوا دی تھی، قاری تقریباً روز ہی دیا کو لے جانے کے لئے آتی کسی دن تو پھپھو سلیمہ عجیب عجیب سی باتیں شروع کر کے واویلا شروع کر دیتیں، کسی دن منہ سر لپیٹے پڑی ہوتیں اور قاری دیا کو لے جانے کی بات پر جز بز ہو کر کے رہ جاتیں تب [illegible] بھی اس کا ہاتھ پکڑ کر لے جانے میں دیر [illegible] ح بھی قاری اسے بلانے آئی ہوئی تھی۔

"واہ میرے مالک! مجھے ایک ہی جینے کا سہارا دیا اور تو نے وہ بھی واپس لے لیا، لوگ ہیں کہ تین تین کا جشن منا کر دل دکھا رہے ہیں۔" نکلتے نکلتے ان دونوں کے کانوں میں تائی کا فقرہ ٹکرایا۔

"وہ جاذب کے بعد ایسے ہو گئی ہیں پھپھو پتہ نہیں چلتا کہ کیا بول رہی ہیں۔" دیا خواہ مخواہ میں صفائی دینے والے انداز میں شرمندہ سی ہو بولی۔

"ارے تم کیوں شرمندہ ہو رہی ہو، تمہاری پھپھو سے تمہارا واسطہ تو اب کچھ ماہ ہوئے پڑا ہے ہم تو کئی برسوں سے ان کی عادات اور فطرت سے واقف ہیں، وہ جاذب بھائی سے پہلے بھی ایسی ہی تھیں، پتہ نہیں کیسی نفسیاتی گرہ ہے انکے اندر کہ کبھی اللہ کی رضا پر راضی نہ ہوئیں ہمیشہ خود کو ملی نعمتیں انہیں کم نظر آئیں اور دوسروں کی زیادہ، تایا بھی ان کی اس عادت سے بہت چڑتے تھے اور بہت سمجھاتے تھے کہ اللہ ناراض ہوتا ہے ایسی ناشکری سے، امی سے تو شروع دن سے پتہ نہیں کیسی رقابت رکھی انہوں نے جو آج تک برقرار ہے، حالانکہ ہماری امی خود ہر معاملے میں ان کی طرف بڑھتی ہیں، بہت محبت اور مروت کا مظاہرہ کیا انہوں نے ہمیشہ مگر تائی سلیمہ کی طرف سے ایک سرد مہری کا سامنا ملا، عمر بھائی کا تو فرمان ہے کہ یہ ایک قسم کی احساس کمتری کی قسم ہے جو وہ کبھی اللہ سے تو کبھی رشتہ داروں سے ہر وقت شکوے کی صورت ظاہر کرتی ہیں، ہم تو اب عادی ہو گئے ان کے اس طرز عمل کے۔" قاری نے بتایا تو دیا تائی کی اس الجھی ہوئی شخصیت کے بارے میں سن کر حیران رہ گئی، خدیجہ بیگم کے گھر دیا کو ایک نارمل زندگی کے سارے رنگ نظر آتے تھے وہاں آ کر وہ بہت حد تک بہل جاتی تھی، مایوں والے دن اس نے الماری کھول کر اپنے پہننے والے کپڑوں کا جائزہ لیا وہ سارے بے حد بھاری کام والے اور تیز رنگوں والے تھے، ابھی انہیں یہ سب ڈھنگ سے برتنا ہی کہاں نصیب ہوا تھا، کہ قسمت نے اس موڑ پر لا کھڑا کیا تھا جس کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا، حسرت سے اس نے الماری بند کر کے سوٹ کیس

میں سے کاٹن کا ایک ہلکے رنگوں والا سوٹ منتخب کیا، تبدیل کر کے بالوں کی سادی چٹیا بنا کر فقط آنکھوں میں کاجل ڈالا اور تیاری ختم۔

"چلیں پھپھو! فاری دو بار بلانے آ چکی ہے۔" اس نے ڈرتے ڈرتے پھپھو کو مخاطب کیا جو پتہ نہیں کس سوچ میں گم تھیں۔

"مجھے تو لگتا ہے تم بھی اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی بھی تو ایسے بن سنور کر شادی میں جانے کو اتاولی ہو رہی ہو۔" دیا بوکھلا گئی۔

"نہیں پھپھو...... وہ...... میں۔" اس سے کوئی بات نہ بن سکی۔

"تم نے جنم نہیں دیا ناں، اس لئے اس درد کو کیسے محسوس کر سکتی ہو جو مجھے ہر پل یہاں ہوتا ہے، جاؤ تم، میں کوشش کروں گی رسم کے وقت آنے کی۔" وہ دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

"پھپھو! آپ نے نہیں جانا تو میں نہیں جاتی۔" وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"نہیں جاؤ تم، جس تن لاگے وہی جانتا ہے، میرے اندر لگی آگ تو مرتے دم تک میرے ساتھ جائے گی، جاؤ تم، اٹھو جاؤ۔" ان کے اصرار پر وہ بے دلی سے خدیجہ بیگم کی طرف آ گئی، لائٹنگ کا جائزہ لیتے عمر کی آنکھیں اسے دیکھ کر جگمگانے لگی تھیں، دیا خود بھی گھبرا گئی، بہت دن بعد اس سے سامنا ہوا تھا، اس نے بے اختیار سر پر سے ڈھلکا دوپٹہ درست کیا اور اس سے پہلے کہ وہ اسے مخاطب کرتا وہ چھپاک سے سامنے والے کمرے میں گھس گئی۔

"مانا کہ تم سے خوبصورتی میں ہمارا مقابلہ نہیں مگر تم شاید بھول گئی ہو کہ آج ہمارے ہاں فنکشن ہے اور گھر کے فنکشن پر بجنا سنورنا عورت کا حق ہوتا ہے۔" فاری نے پہلے تو اسے آڑے ہاتھوں لیا پھر لگے ہاتھوں اس کو ہلکی پنک لپ اسٹک لگا کر چار چار پنک چوڑیاں دونوں ہاتھوں میں ڈال کر ارجنٹ مہندی بھی ایک ہاتھ کی زینت بنا دی تھی، وہ نہیں نہیں کرتی رہ گئی۔

"میں بھی تمہاری حیثیت سے واقف ہوں مگر گھر کا ہی فنکشن ہے جہاں صرف چند ایک لڑکیاں ہوں گی، تمہارا کون سا میں نے دلہنوں والا ہار سنگھار کیا ہے جو ایسے گھبرا رہی ہو۔" فاری نے اسے ڈانٹا، پھر واقعی فنکشن میں فاری اور اس کی دوستوں نے وہ رونق لگائی کہ کچھ دیر پہلے جو کیفیت جو گھر سے آتے ہوئے تھی یکسر زائل ہو گئی تھی، پھر تائی سلیمہ بھی رسم کے وقت آ گئی تھیں اور رسم ختم ہوتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"اٹھو چلو گھر چلیں۔" تائی سلیمہ نے اس کے کان میں کہا۔

"تائی دیا کو ابھی رہنے دیں، میں چھوڑ جاؤں گی خود۔" فاری جو تھوڑی دور بیٹھی تھی نے شاید ان کے تاثرات سے بھانپ لیا تھا کہ وہ اسے گھر چلنے کو کہہ رہی ہیں سو دور سے ہی بولی۔

"لوگ بھول جائیں مگر تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ تم کنواری یا سہاگن نہیں ہو، بیوہ ہو جن کا ایسے چونچلوں پر کوئی حق نہیں ہے، اب گھر چلو۔" پھپھو سلیمہ نے اس کا بازو تھام کر ایسے ٹھنڈے لہجے میں آہستہ سے کہا کہ دیا سمجھ نہ سکی کہ ان کی بات کی ٹھنڈک نے اسے سرد کیا تھا یا لہجے کی گئی نے اسے تکلیف پہنچائی تھی، وہ میکانکی انداز میں اٹھ کر ان سے پہلے ہی گھر آ گئی فاری سے ملے بغیر ہی ویسے بھی سب ارمان کو گھیرے میں لئے ہنسی مذاق میں مصروف تھے سو ان کے جانے کو کسی نے محسوس ہی نہیں کیا سوائے عمر کے جس کا دھیان جب سے دیا آئی تھی، اس کی جانب تھا، رات تو بہر طور کسی طرح گزر ہی گئی تھی مگر صبح

ہوتے ہی تائی سلیمہ نے اس کے کمرے میں دھاوا بول دیا تھا۔

''میں نے سوچا تھا پڑھی لکھی ہو خود ہی ہر بات کی اہمیت اور تقاضوں کو مجھ ان پڑھ سے بڑھ کر سمجھتی ہوگی مگر ان گزرے دنوں میں میں نے دیکھا کہ یا تو تم سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن رہی ہو یا اگر انجان ہو تو تمہیں کسی نے بتایا نہیں، کسی بیوہ کا پہننا اوڑھنا، اٹھنا بیٹھنا، اور بول چال کا طریقہ ایسا ہو کہ اسے اپنی حیثیت کسی کو بتانی ہی نہ پڑے، ارے پہلے کے دور میں تو عورتیں مرد کے مرنے کے بعد زندگی کی ہر خوشی حرام کر لیتی تھیں خود پر اور تم ہو کہ ابھی میاں کو گزرے ایک سال ہوا اور کلائی کلائی بھر کے چوڑیاں چڑھا لیں، مہندی تو سہاگن کی نشانی ہے، تم شاید میرے جازی کو بھول گئی ہو، سرخی، کیا ایک پل کو تمہیں میرے جازی کا خیال نہیں آیا۔'' وہ رونے لگیں۔

''پھپھو...... وہ قاری۔''

''قاری تو کل کی بچی ہے اس کو کیا پتہ دوسرے وہ اور طرح کے لوگ ہیں آزاد خیال قسم کے، میں نے تمہیں صرف وہاں جانے کی اجازت دی ہے ان کے رنگ میں رنگنے کی نہیں، بہرحال آج کے بعد میں تمہیں کسی بھی تیز رنگ میں ملبوس ہرگز نہ دیکھوں، مجھ سے ہی سبق سیکھ لینا چاہیے تھا تمہیں، مجھے دیکھا بھی تم نے مہندی رنگے ہاتھوں یا کھنکتی چوڑیوں کے ساتھ، ٹھیک ہے کہ تمہاری عمر سے کچھ بڑی ہی تھی جب بیوگی کی چادر اوڑھی مگر کسی بھی دنیا کے رنگ کا داغ اس پر لگنے نہیں دیا، امید ہے میری باتوں کو تم سمجھ گئی ہوگی۔'' پھر یہی نہیں کیا پھپھو نے بلکہ اس کے سامنے اس کی الماری کھول کر اس کے سارے چھوٹے ان چھوئے جھلملاتے کپڑوں سمیت اس کا سوٹ کیس نکال کر اس میں رکھے اور لاک لگا کر سوٹ کیس کو بیڈ کے نیچے دھکیل دیا، دیا جھلملاتی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھتی رہی، بارات میں اس نے شرکت کرنے کی زحمت نہیں کی تھی نہ ہی پھپھو سلیمہ نے اسے جانے کو کہا، بلکہ ذرا کے ذرا جا کر فنکشن میں ہو آئیں رات گئے جب ساتھ والے گھر سے دلہن لے آنے کے بعد کی مخصوص گہما گہمی کی آوازیں آنے لگیں، پھپھو اس سب سے بے نیاز آج دیا کے کپڑے سلائی کرنے میں لگی تھیں، پتہ نہیں کہاں سے دو تین ہلکے رنگوں والے کپڑے برآمد کر کے خود ہی کاٹ اور سینے لگیں، دیا گھر کا کام کاج سمیٹ کر بولائی بولائی سی پھرتی رہی، وہ لوگوں کا بھلا کام ہی کتنا تھا، جازب تھا تو گھر میں رونق لگائے رکھتا تھا اب تو عجیب سی گھٹن کا سا احساس تھا جس نے دیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

''ایسے بھلا کب اتنی لمبی عمر گزرے گی، میں پھپھو سے کہوں گی مجھے آگے پڑھنے کی اجازت دے دیں، کچھ تو دھیان بٹنے کا سامان ہوگا، ورنہ تو ایسے ماحول اور حالات میں، میں کیسے جی سکوں گی۔'' اپنے کمرے سے برآمدے تک کے بے مقصد چکر لگاتے وہ کئی باتیں سوچ گئی۔

اگلے دن تک چار ڈھیلے ڈھالے کرتے نما لباس پھپھو سلیمہ نے لا کر اس کے ہاتھ میں تھما دیئے اور پتہ نہیں کیا خیال ذہن میں آیا کہ انہی کپڑوں میں سے ایک لباس پہن کر دیا کو اپنے ساتھ ولیمے میں چلنے کا حکم دیا۔

''آپ ہو آئیں پھپھو میرا جانا کوئی اتنا ضروری نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

''میں نے مشورہ نہیں لیا بس کہا ہے کہ چلو میرے ساتھ۔''

ہوٹل میں ولیمہ کا فنکشن تھا مگر جب سب ہال میں دلہن دولہا سمیت جمع تھے، پھپھو سلیمہ اس کا ہاتھ پکڑ کر وہاں آئیں، پھپھو کو تو نہیں مگر دیا کو ایسے اجڑے حال میں دیکھ کر سب ساکت رہ گئے، خصوصاً عمر کو لگا اس کا دل جیسے دھڑکنیں چھوڑنے کو ہوں، خدیجہ بیگم ہی سب سے پہلے سنبھلیں اور ان کے استقبال کو آگے بڑھیں۔

"ارے آئیں بھابھی! آپ کا بہت انتظار رہا آج، روانہ ہونے سے پہلے کئی بار فاری کو ایک بار عمر کو بھیجا مگر دروازہ ہی بند ملا، دستک کا جواب ہی نہیں دیا، پھر فون بھی بند تھا آپ کا۔"

"ہاں طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی، دوائی کھائی تو نیند نے آن لیا۔" انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تائی! آپ دیا کو بھیج دیتیں، میں نے بہت انتظار کیا اس کا، کل بھی آج بھی، اس نے وعدہ کیا تھا کہ یہ بارات پر ہمارے ساتھ چلے گی۔" فاری بھنکی۔

"اس کا ان کاموں سے اب کوئی واسطہ نہیں رہا ہے تم بچی نہیں ہو جو سمجھ نہ سکو، اس لئے ایسی ضد نہ کیا کرو، اس سے جو پوری نہ کر سکے یہ۔" فاری کچھ کہنے لگی تھی جب خدیجہ بیگم نے آنکھ کا اشارہ کیا وہ چپ ہو گئی، عمر تو تائی کی فضول بات پر خون کا گھونٹ بھر کے رہ گیا مگر امی کا خیال کر کے بمشکل ضبط کیا اس نے اس دوران ارمان سارہ کا ہاتھ پکڑ کر خود ہی تائی سلیمہ والے صوفے کی طرف آ گیا۔

"یہ دیکھیں تائی اماں، یہ ہے سارہ ارمان، میری دلہن، بتائیے کیسی لگی؟" سارہ نے ماتھے تک ہاتھ لیجا کر سلام کیا، تائی اماں نے ارمان کی پیشانی چوم کر سارہ کے سر پر ہاتھ پھیرا، کئی یادیں آنسو کے ساتھ مل کر منظر پہ آنے کو بے تاب ہوئیں آخر کو جازب ارمان سے تین ماہ ہی بڑا تھا، مگر فوراً ہی خود کو سنبھال کر بٹوے میں سے نوٹ نکال کر دونوں کو سلامی دینے کے ساتھ خوشیوں کی دعا دی اور پھر فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئیں ساتھ میں دیا کو بھی اشارہ کیا وہ بھی ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہو گی، یہاں آ کر تائی اماں کو اپنی ذات کچھ زیادہ ہی خسارے میں لگنے لگی تھی اور یہ آج کی بات نہیں تھی، پہلے دن کا معاملہ تھا جب سے وہ دلہن بن کر اس گھر میں آئیں تھیں کچھ ہی عرصہ خوش باش رہ سکیں، خدیجہ کے بیاہ کر آنے کے بعد پتہ نہیں کس قسم کے احساس کمتری کی لپیٹ میں آئی تھیں کہ آج تک نکل ہی نہیں پائی تھی پھر آنے والے حالات خدیجہ کے خاوند کے کاروبار میں ترقی، جازب کے ابا کو مسلسل ہوتے والے نقصانات خدیجہ کے ہاں بچوں کی پیدائش اور ان کے ہاں شادی کے بہت عرصہ بعد ایک ایب نارمل بچے کی پیدائش اور آخر میں جازب کے ابا کی وفات نے ان کے خود ساختہ احساس کو فروغ ہی دیا تھا، انہوں نے از خود خدیجہ سے نفرت شروع کر دی تھی، جو آج بھی دل کے کسی کونے میں سر جھکائے پڑی تھی اور وقت بے وقت جاگ اٹھتی تھی۔

☆☆☆

"یہ کیا کہہ رہے ہو عمر؟ ابھی جا کے میں مطمئن ہوئی تھی کہ تم نے عقل کا دامن تھام لیا اور اب تم نیا فضیحہ نکال کے بیٹھ گئے، جازی کی موت کو عرصہ ہی کتنا ہوا ہے ابھی اور تم کیوں ایک ہی لڑکی کے پیچھے پڑے ہو، کبھی تمہیں اسے اس کے شوہر سے چھٹکارا دلانے کی سوجھتی ہے اور اب تم اس سے شادی کرنے کی بات لے کر بیٹھ گئے ہو، تمہارے لئے لڑکیوں کا کال نہیں پڑ گیا ہے جو میں اٹھ کر ایک بیوہ کو بہو بنانے چل پڑوں، خدا کو

مانو عمر اور مجھے تنگ کرنے کے یہ نت نئے طریقے اپنانا چھوڑ دو۔"

ارمان کی شادی کے چوتھے روز جب نئے دلہن دلہا مکلاوے کی رسم کے لئے گئے تھے، عمر نے بھی کل واپس نکلنا تھا جب اس نے موقع پا کر خدیجہ بیگم کو اپنے کمرے میں اکیلے پا کر اپنا مدعا ان تک پہنچایا، وہ تو اس کی بات سن کر بیٹھ گئیں۔

"میرے لئے تو کال پڑ گیا ہے امی کیونکہ دیا ہی وہ لڑکی ہے جو مجھے پہلی نظر میں پسند آ گئی تھی۔"

"شرم کرو شرم، تمہارے بھائی کی بیوی ہے وہ ویسے تو بڑی باتیں کرنا آتی ہیں تمہیں اب بھائی کی عزت پر نظر ڈالتے ہوئے ذرا خیال نہ آیا تمہیں، میں بھی کہوں کیوں ایک انجان لڑکی سے اتنی ہمدردی کا اتنا بخار چڑھا ہے کہ۔"

"ایک منٹ، ایک منٹ رکیں ایک بات سن کر کسی کو کردار کے صحیح یا غلط ہونے کا سرٹیفکیٹ مت تھمائیں آپ پہلے پوری بات سن لیں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر امی کو روکا اور ان کے بالکل قریب بیٹھ کر ان کے گرد بازو حمائل کر کے آہستہ آہستہ بتا دیا کہ دیا کو کیسے اور کب دیکھا تھا یہ اور بات کہ امی نے فوراً ہی اس کے بازو جھٹک دیئے اور پرے ہو بیٹھیں یہ ایک قسم کی ناراضی کا اظہار تھا۔

"اور آپ یقین کریں کہ جازب بھائی کے نکاح میں کوئی اور لڑکی بھی ہوتی تو بھی میں ایسے ہی ری ایکٹ کرتا، آپ میری فطرت نہیں جانتی کہ مظلوموں کو ان کے حقوق دلوانے کا میرا شوق تو مجھے اس پیشے سے منسلک کرا گیا ہے۔"

"ہاں اور جازب کی بیوہ سے شادی بھی کرنا چاہتے اگر وہ تمہاری پسندیدہ لڑکی نہ ہوتی۔" خدیجہ بیگم نے چمک کر کہا۔

"میں خود شادی کی بات کبھی نہ کرتا اگر وہ دیا نہ ہوتی، ہاں تھوڑا وقت گزرنے پر کسی دوسری جگہ جازب کی بیوہ کو بیاہ دینے کا زور ضرور دیتا تائی سلیمہ پر، کیونکہ زیادتی مجھے کسی بھی صورت پسند نہیں ہے، تائی سلیمہ نے بیوگی کا ایک لمبا عرصہ گزار دیا امی، ان کے پاس معاشی بے حالی کا تصور نہیں تھا، وہ ادھیڑ عمری میں بیوہ ہوئیں جہاں جازب کی صورت ان کے پاس جینے کا سہارا موجود تھا، جب کہ دیا کے پاس ایسی کوئی وجہ نہیں ہے اور ہمارا مذہب بھی بیوہ کی شادی پر زور دینے کی بات کرتا ہے۔" وہ صحافی تھا اور اس سے زیادہ قائل کرنے کا ہنر کسے کے پاس ہو سکتا تھا۔

"تمہاری سب باتیں ٹھیک ہیں مگر ابھی اتنا وقت نہیں ہوا کہ میں منہ اٹھا کر تمہاری تائی سے رشتہ لینے چل پڑوں وہ بھی اس صورت جب تم بھی جانتے ہو کہ وہ ایک نارمل خاتون نہیں ہیں۔"

"اسی لئے تو، اسی لئے تو کہتا ہوں امی آپ کو فوراً جانا چاہیے، آپ نے دیکھا تائی سلیمہ نے کیسے دیا کا حلیہ بنا دیا جیسے میں نے پرانے زمانے کی ایک انڈین مووی دیکھی تھی، جس میں ایک عورت کو اس کے خاوند کے مرنے کے ساتھ ہی ستی کر دیا جاتا ہے، ابھی تو انہوں نے اس کا حلیہ بدلا ہے، خدانخواستہ کچھ عرصہ گزرنے تک اپنی سوچ کو اس پر حاوی کر دیا تو اسے بھی اپنی طرح ایب نارمل کر دیں گی۔" پورے دو گھنٹے کی محنت کے بعد ہی وہ امی کو قائل کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا، قاری کو پتہ چلا تو وہ تو خوشی کے مارے اچھل پڑی۔

"ارے عمر بھائی زندہ باد یقین کریں دیا مجھے اتنی اچھی لگتی ہے کہ میں ہمیشہ اس کو دیکھ کر سوچتی تھی کہ کاش دیا میری بھابھی ہوتی۔"

"اچھا اچھا زیادہ شور مت ڈالو۔ مجھے تو بھابھی سلیمہ کے ردعمل سے خوف آ رہا ہے، وہ تو

سیدھی باتوں کا بھی الٹا مطلب نکالتی ہیں پتہ نہیں کیا کچھ سننے کو ملے گا ان سے۔" امی کو تائی سلیمہ کا ردعمل ڈرا رہا تھا اور وہی ہوا عمر تو خود روانہ ہو گیا اور اس مشن امپاسیبل کے لئے خدیجہ بیگم کو مشکل میں ڈال گیا جنہوں نے کئی دن تو اسی سوچ بچار میں گزار دیئے کہ کس طرح اور کیسے بات کریں گی، مگر عمر کو وہاں جا کر بھی چین نہیں تھا دن میں کئی بار کال کر کے پوچھتا کہ وہ گئیں تھیں یا نہیں پھر نہ سنتے ہی ایک طویل لیکچر دیتا کہ ایسے بات کریں، یہ کہیں وہ کہیں، آخر ایک دن دل کڑا کر کے خدیجہ بیگم قاری کو لے کر تائی سلیمہ کے گھر چلی ہی گئیں اور واقعی برآمدے میں پلر سے ٹیک لگائے دور خلاؤں میں دیکھتی دیا کو دیکھ کر ان کا دل کٹ کر رہ گیا، کیا عمر تھی اس کی، قاری سے ایک آدھ سال چھوٹی ہی تھی وہ اور زندگی کے تلخ ترین ادوار دیکھ لئے تھے اس نے جبکہ ان کی قاری ابھی تک اپنے لاڈ اٹھوا رہی تھی، جھرجھری لے کر وہ جیسے کسی خیال سے باہر آئیں سلیمہ برآمدے میں ہی بڑے تخت پر لیٹی تھیں انہیں دیکھ کر اٹھ بیٹھیں، رسمی سلام دعا کے بعد دیا نے چائے بنا کر سب کو دی پھر قاری کو لے کر اپنے کمرے میں آ گئی، اور ابھی قاری دیا کو ارمان کی شادی کا احوال بتانا شروع ہی ہوئی تھی کہ تائی کی تیز آواز پر دونوں چونک گئیں۔

"خاندان کا ہر فرد اپنے بزرگوں کی روایات کا امین ہوتا ہے خدیجہ، اور تم شاید یہ بات نہیں جانتی کہ ہمارے خاندان میں عورت چاہے جس عمر میں بھی بیوہ ہو اس کا آئندہ زندگی میں دوسری شادی کرنا حرام تصور کیا جاتا ہے اور یہ روایت کئی نسلوں سے ہی ہمارے خاندان میں چلی آ رہی ہے۔"

"مگر سلیمہ بھابھی! یہ مذہب یا شریعت کا حکم نہیں ہے جس سے روگردانی ممکن نہ ہو، غلط روایات جو انسان پر زندگی تنگ کر دیں ان کو توڑ دینا ہی عقلمندی ہوتا ہے اور......"

"بس بس خدیجہ...... مجھے یہ سبق مت پڑھاؤ، رواجوں کو نبھانے کی بات چھوڑ بھی دوں تب بھی تب بھی نہیں، تمہارے پاس بھرا پرا خاندان ہے، ایک آدھ بندہ ادھر ادھر چلا جائے تو کمی محسوس نہیں ہوتی، میرے پاس کیا بچا ہے؟ میرے جازب کی ایک نشانی، اور وہ بھی دنیا مجھ سے چھین لینے کو تیار کھڑی ہے۔" وہ رونے لگیں، خدیجہ بیگم نے دل ہی دل میں اس بے تکی بات پر لاحول پڑھی اور طویل سانس لے کر دل ہی دل میں عمر کو کوسا، سمجھنے سمجھانے اور دلائل دینے کی بات وہاں ہوتی ہے جہاں کوئی بات سننے اور سمجھنے پر راضی ہو پھر یہاں سلیمہ تھیں ہمیشہ اپنے مفروضات خود گھڑ کر اسی کے مطابق زندگی گزارنے والی اور دوسروں کو بھی اسی کے تناظر میں دیکھنے والی۔

"دیا ایک جیتی جاگتی جوان بچی ہے سلیمہ بھابھی، زندگی کی خوشیوں پر اس کا بھی اتنا حق ہے جتنا کسی اور کا اور ہمیں کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ ہم کسی کو زندگی میں سے اپنا حصہ وصول کرنے سے روک سکیں، وہ کھلونا نہیں ہے نہ ہی جازب کی اولاد جس کو پال پوس کر آپ اپنا بڑھاپے کا سہارا بنا کر رکھیں گی، ایسا کر کے نہ تو گناہ کمائیں نہ کسی مظلوم کی آہ لیں، بس اتنی درخواست ہے آپ سے۔" سلیمہ بھابھی کی سسکیاں تھمتے ہی خدیجہ بیگم نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میرا جواب اب بھی وہی ہے خدیجہ، سو بار آؤ مگر اس مقصد کے لئے میں تمہارا یہاں آنا ہرگز پسند نہیں کروں گی۔" سلیمہ تائی نے اپنے

مخصوص ہٹ دھرم انداز میں کہا، خدیجہ بیگم نے اب کی بار کوئی جواب نہیں دیا اور قاری کو آواز دی، قاری نے کھڑکی کے پاس چپ چاپ سب کچھ سنتی دیا کا ہاتھ دبایا وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ قاری کی طرف مڑی۔

"جاؤ قاری، آنٹی سے کہنا کہ دوبارہ سے ایسی بات کر کے مجھے یا پھپھو کو پریشان نہ کریں۔"

"مگر۔" قاری نے کچھ کہنا چاہا مگر دیا نے انگلی اس کے لبوں پر رکھ کر شی کہا۔

"جاؤ آنٹی بلا رہی ہیں۔" اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے کے دروازے کے پاس لا چھوڑا، پھر ان دونوں کے جاتے ہی وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی سلیمہ تائی کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"دیکھا اس عورت کا حسد دیا، اس سے برداشت ہی نہیں ہوا جب سے تمہیں جازی کی دلہن کے روپ میں دیکھا تھا، اب میرے پاس بچے واحد میرے رشتے کو چھین لینا چاہتی ہے، دیا تم میرے ساتھ ایسا مت کرنا میری زندگی میں، میں تمہیں جازی کے حوالے سے ہی دیکھنا چاہتی ہوں، ہاں میرے مرنے کے بعد تم آزاد ہو جو چاہے کر لینا، مگر ایسے نہیں۔" وہ ہذیانی انداز میں روتے روتے اس سے پتہ نہیں کیسی یقین دہانی چاہنے لگیں، دیا نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلانے شروع کیے۔

"میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جا رہی پھپھو کہیں بھی، آپ جیسا کہیں گی میں ویسا ہی کروں گی، میرا یقین کریں اور روئیں مت، آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔" وہ خود بھی رو پڑی ان کی حالت دیکھ کر۔

"میری بچی، میری دیا، میرے جازی کی نشانی۔" پھپھو سلیمہ نے اس کو گلے سے لگا کر اس کی پیشانی چوم لی، پھر اگلے روز ہی پھپھو سلیمہ نے دیا کو ساتھ لیا اور مسز احمد کے گھر لے گئیں جو ان کے محلے میں ہی رہتی تھیں اور مقامی کالج میں وائس پرنسپل کے عہدے پر فائز تھیں، دیا کا بتا کر درخواست کی کہ وہ اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتی ہے، انہوں نے دونوں کا اچھی طرح خیر مقدم کیا اور کہا کہ وہ کل ہی اپنے ڈاکومنٹس لے آئے وہ اس کا کالج میں ایڈمیشن کرانے کی ہر ممکن مدد کریں گی نہ صرف یہ بلکہ اسٹڈیز میں بھی کسی قسم کی مشکل ہو تو وہ دیا کے کام آ کر دلی خوشی محسوس کریں گی پھر تین دن کے اندر اندر اس کا ایڈمیشن ہو گیا اور مسز احمد کے ساتھ والی کیری میں ہی وہ کالج آنا جانا شروع ہو گئی، کالج دوبارہ سے جوائن کر کے اسے لگا تھا جیسے اس نے نیا جنم لیا ہو، نہ صرف یہ پھپھو اس کے لئے چھوٹا سا ٹی وی بھی خرید لائیں۔

"ارے پھپھو، اس کی ضرورت ہی نہیں تھی، میرا پڑھائی کا پہلے ہی بہت حرج ہو چکا ہے مجھے اب امتحان دینے کے لئے ڈبل محنت کی ضرورت ہے میرے پاس ٹائم ہی نہیں ہوگا اور نہ ہی مجھے ٹی وی وغیرہ کا شوق ہے، ابا کے گھر بھی میں نے کبھی ٹی وی نہیں دیکھا تھا، بس ابا ہی نیوز وغیرہ دیکھا کرتے تھے۔" پہلی دفعہ اس نے پھپھو سلیمہ سے اتنی لمبی بات کی تھی۔

"آپ میرے لئے یہ سب نہ بھی کرتیں پھپھو تب بھی میں آپ کو چھوڑ کے نہیں جاتا تھا کیونکہ میرے ابا نے مجھے آخری وصیت میری بجائے آپ کے بارے میں کی تھی۔" چند لمحے چپ رہنے کے بعد اس نے آہستہ سے پھپھو سے کہا تو وہ ساکت ہی تو رہ گئیں۔

"تو کیا وہ جان گئی تھی کہ وہ اس کے گرد اس

کی دلچسپیوں اور خواہشوں کی تعبیر کا ایک خوشنما پنجرہ بنا دینا چاہتی تھیں جس سے باہر وہ نکلنے تو کیا دیکھنے کا بھی نہ سوچ سکے۔'' پھر دیا کو پودوں سے دلچسپی ہے وہ جان کر بہت سارے رنگ برنگے موسمی پھولوں کے گملے لے آئیں، صرف یہی نہیں کونے والی خالی جگہ کو تین دن کی مسلسل محنت کے بعد تیار کر کے ایک کیاری کی شکل دے کر اس میں کئی طرح کے بیج لا کر ڈال دیئے اور آسٹریلین طوطوں کی تین رنگ برنگی جوڑیوں سے سجا پنجرہ بھی لے آئیں، پڑھائی سے جتنا وقت بچتا دیا طوطوں کی ناز برداریوں میں گزار دیتی، پودوں سے باتیں کرتی، پرندوں سے کھیلتی، یوں اب چند ماہ پہلے والی دیا سے بالکل دیا پھپھو کے سامنے تھی، اس کے سامنے اشیاء اور مصروفیات کے ڈھیر لگا دینے کے بعد وہ سمجھتی تھیں کہ شاید وہ اس کے جذبات کو سلا دینے میں کامیاب ہو جائیں گی اور یہ تو وقت ہی جانتا تھا کہ وہ اپنی اس کوشش میں کتنی کامیاب ہونے والی تھیں۔

☆☆☆

''وہ ایک پاگل اور نفسیاتی عورت ہیں اور تم لوگ ان کا جواب سن کر واپس چلے آئے تمہیں دیا سے بات کرنی چاہیے تھی، ایک تو اس سے رابطے کی کوئی سبیل نہیں ہے، قاری تم میری اس سے بات کرا دو کسی طرح، اسے بلاؤ یہاں، خود جاؤ وہاں کسی بھی طرح، میں نے اس سے بات کرنی ہے، اب جو کرنا ہے میں نے خود کرنا ہے، تم لوگوں پر چھوڑ کر نتیجہ دیکھ لیا۔'' وہ فون پر قاری پر ناراض ہو رہا تھا، اس سے پہلے امی سے بھی کئی بار سارا احوال لے کر انہیں کئی مشورے دے چکا تھا، آپ کو ایسے کہنا چاہیے تھا، ایسے نہیں، پھر قاری کی باری آئی تھی۔

''بھائی میں کوشش کروں گی، دیا سے موقع پا کر آپ کی بات کرا سکوں لیکن میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ تائی سلیمہ اگر نہیں چاہیں گی تو دیا بھی بھی نہیں مانے گی، آپ کو اگر راضی کرنا ہے تو تائی کو کریں، دیا نے کالج بھی جانا شروع کر دیا ہے بھائی اور......'' اب وہ دیا نامہ اس کے گوش گزار کر رہی تھی اس دن کے بعد قاری دیا کے پاس صرف ایک دفعہ ہی جا سکی تھی، پھر ایک روز قاری کو موقع مل گیا تھا دیا سے عمر کی بات کرانے کا، پھپھو سلیمہ گھر سے باہر گئی تھیں، دیا پڑھائی میں مصروف تھی، قاری کو دیکھ کر خوش ہو گئی۔

''آج پورے آٹھ دن کے بعد چکر لگایا ہے تم نے۔'' اس نے شکوہ کیا اور ہاتھ پکڑ کر قاری کو اپنے پاس بٹھا لیا۔

''تم نے تو دروازے توڑ دیئے ہمارے گھر آ آ کر۔'' جواباً قاری نے منہ پھلا کر کہا۔

''اور ویسے بھی دیا اس رشتے والی بات کے بعد تائی سلیمہ میری آمد کو کچھ خاص پسند نہیں کرتیں، ایک دو دفعہ جب میں آئی ہوں وہ ہمارے اردگرد ہی پھرتی رہیں کہ ہم دونوں کو اکٹھے بیٹھنے کا موقع نہ مل سکے، بس اس دن کے بعد دل کچھ ایسا کھٹا ہوا کہ چاہنے کے باوجود آ ہی نہیں سکی۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا، دیا پھیکا سا مسکرا دی۔

''میں خود بھی اس لئے نہیں آتی اب، اس بات کے بعد وہ میری طرف سے عدم تحفظ کا شکار ہو گئی ہیں حالانکہ میں ان کو دکھ دے کر کسی بھی ایسی بات کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔'' اس کی بات سنتی قاری نے جلدی سے پاس رکھے پرس میں سے موبائل نکال پھرتی سے نمبر ملایا۔

''ہاں بھائی بہت مشکل سے دیا اکیلی ہاتھ آئی ہے آپ کو جو بات کرنی ہے کر لیں، میں چائے بنالوں۔'' اس نے کہہ کر سیل دیا

پکڑا دیا اور خود باہر آ گئی، کچھ سوچ کر دیا نے موبائل کان سے لگا لیا، انسان تھی وہ بھی اور وہ بھی امنگوں اور جذبوں بھرے دل والی لڑکی اور مخاطب بھی کسی سے ہونا تھا وہ شخص جو زندگی میں پہلی بار اس کے خوابیدہ جذبوں کو جگانے کا سبب بنا تھا، آنکھوں میں بے ساختہ نمی سی چمکی تھی۔

"میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا دیا کہ جو لڑکی صرف پہلی نظر میں بغیر میری اجازت کے میرے دل میں بے نیازی سے چلی آئی تھی اسے زندگی میں لانے کے لئے مجھے اتنا خوار ہونا پڑے گا۔" اس کی اتنی دوٹوک بات دیا سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

"پہلے تو جاذب کے ساتھ جڑے ہونے کا احساس تھا جو آپ کو کوئی انتہائی فیصلہ کرنے سے روک رہا تھا۔" وہ مضطرب سا گویا ہوا۔

"اب ایسی کوئی وجہ باقی نہیں رہی دیا، مت اپنی زندگی تباہ کریں، آپ یقین کریں ایک بار آپ قدم اٹھائیں تو کسی تائی سلیمہ خود ہی کچھ دن ناراض رہ کر مان جائیں گی نہیں تو وہ جب تک زندہ رہیں گی آپ کو ایسے جذباتی ہتھکنڈے استعمال کر کے غیر شرعی اور غیر فطری زندگی گزارنے پر مجبور کیے رکھیں گی۔" عمر کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا۔

"آپ کی سب باتیں ٹھیک ہیں عمر صاحب، اور میں آپ کے جذبے کی بھی قدر کرتی ہوں کہ آج کے نفسا نفسی کے اس دور میں جب اپنا اپنے کو دکھ دے رہا ہے، آپ میرے لئے میری خوشیوں کے لئے سوچ رہے ہیں، بھلے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہی، لیکن میں آپ کو بہت واضح الفاظ میں بتا رہی ہوں کہ جب تک پھپھو راضی نہیں ہوں گی میں ایسا کوئی رشتہ بنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی جس کی بنیاد میں ان کی بد دعائیں شامل ہوں جبکہ وہ دنیا میں بچا میرا واحد خونی رشتہ ہیں اور میرے ابا نے رخصتی کے وقت جو بات کہی تھی وہ میرے بارے میں نہیں بلکہ اپنی بہن کے بارے میں تھی کہ میں پھپھو کو ہمیشہ خوش رکھوں، انہیں کبھی کوئی تکلیف نہ دوں وہ بہت دکھی ہیں۔" دیا سانس لینے کو رکی۔

"آپ یقین کریں عمر صاحب، مجھ پر وہ کوئی ظلم نہیں کر رہیں نہ ہی جذباتی ہتھکنڈے استعمال کیے مجھ پر، بس میں ان کو ناراض رہ کر کبھی خوش نہیں رہ پاؤں گی یہ مجھے پتا ہے اور اپنے بیٹے کی دائمی جدائی کا روگ دل کو لگا لینے والی پھپھو میرا ایسا کوئی فیصلہ برداشت نہیں کر پائیں گی، میں اپنی وجہ سے کسی کی موت کا سبب نہیں بننا چاہتی۔" عمر نے اس کی بات بہت تحمل سے سنی پھر گویا ہوا۔

"آپ جانتی ہیں یا نہیں لیکن میں آپ کو بار بار بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ وہ ایک نارمل خاتون نہیں ہیں ورنہ ایسی کوئی قدغن نہ لگاتیں آپ پر اور ایک ابنارمل شخص کے غلط فیصلے کے لئے آپ اپنی اور میری زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتیں۔"

"چلیں ایسے ہے تو ایسے ہی سہی عمر صاحب، میرا جواب اب بھی وہی ہے، مجھ سے بار بار رابطہ کر کے مجھے پریشان مت کیجئے گا، میں اپنی زندگی سے خوش نہ سہی، مطمئن ضرور ہوں، اپنا خیال رکھیے گا اللہ حافظ۔" اس مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے تیزی سے اپنی بات مکمل کی اور کال ڈراپ کر کے سیل بیڈ پر اچھال دیا پھر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی، دوسری طرف عمر غصے سے سیل کو گھور کر رہ گیا، آج اگر دیا اس کے سامنے یہ سب کہتی تو دو تھپڑ تو ضرور کھا چکی ہوتی اپنی فضول اور بے تکی ضد پر اس

سے۔

"پاگل، پھپھو کی احمق بھتیجی۔" وہ بڑبڑایا۔

امی نے الگ اس کا جینا محال کر رکھا تھا بار بار کالز کر کے کہ بس انہوں نے بہت اس کی بات مان کر دیکھ لی اور اب وہ اس کے لئے لڑکیاں دیکھنے کا سلسلہ شروع کر چکی ہیں، جو بھی کوئی لڑکی پسند آئی وہ اب مزید دیر نہیں کریں گی کیونکہ اپنی جیٹھانی کی ضدی اور عجیب فطرت کو بھی جانتی تھیں کہ ان کی ناں اب ہاں میں بدلنے والی نہیں تھی۔

"اچھا مجھے صرف تھوڑا سا وقت دیں بس، پھر جیسا آپ کہیں گی ویسا ہی ہو گا۔" اس نے دھیما پڑتے کہا تھا۔

"کیوں کیا کر لو گے کچھ وقت میں عادتیں بدلی جا سکتی ہیں، سوچ بھی تبدیل کی جا سکتی ہے، مگر فطرت کو کوئی بھی تبدیل نہیں کر سکتا، اب تمہاری تائی نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے، میں دسویں بار گئی ہوں ان کے پاس اپنی انا کو پس پشت ڈال کر، اپنی بے عزتی فراموش کر کے، صرف تمہاری خوشی کی خاطر، مگر ہوا کیا؟ ہر بار ہی پہلے سے زیادہ بری طرح بے عزت کر کے نکالی گئی ہیں اور پچھلی دفعہ تو اس لڑکی دیا نے بھی ہاتھ جوڑ دیئے میرے آگے کہنے لگی۔"

"آنٹی پلیز مت آیا کریں آپ یہاں ہمیں تکلیف دینے، پوری دنیا میں آپ کے بیٹے کو ایک بیوہ ہی نظر آئی ہے شادی کے لئے، یہ صرف پھپھو کی نہیں بلکہ میری مرضی بھی ہے، میں نے اب بھی شادی نہیں کرنی، بتاؤ پھر کیا رہ گیا پیچھے۔" امی چمک کر بولیں تب وہ چپ رہ گیا تھا، مگر اگلی بات خدیجہ بیگم سے تھوڑا وقت... کر انہیں تیخ پا کر دیا تھا سو وہ اس سے ناراض تھیں، عمر نے بھی بہت زیادہ مصروفیت کا بہانہ کر کے گھر کا رخ نہیں کیا تھا، پتا تھا کہ ایک بار گھر گیا تو سب کا جذباتی دباؤ اسے اپنے دل کے خلاف فیصلہ کرنے پر مجبور نہ کر دے، ویسے بھی سارہ کی شادی کے بعد حسن کی بھی شادی ہو چکی تھی اور اس کی بیوی کے گھر آ جانے کے بعد اس، اس نے اپنی رہائش بدل لی تھی اور اپنے آپ کو اپنے کام میں بے حد مصروف کر لیا تھا، آٹھ ماہ بعد ارمان نے کال کر کے اسے سخت سست سنائی تھیں اور ساتھ ہی اپنے ہاں بیٹا پیدا ہونے کی نوید دی تھی، عمر نے اسی روز ہی گھر کے لئے رخت سفر باندھ لیا۔

☆☆☆

"پھپھو آج میں بہت خوش ہوں، ابا ہوتے تو بہت خوش ہوتے، انہیں بہت شوق تھا کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں، اب دیکھئے گا میں یونیورسٹی میں داخلہ لوں گی اور مسز احمد سے بھی ریکویسٹ کی ہے میں نے کہ میرے لئے کچھ ٹیوشنز کا بندوبست کر دیں تاکہ میں اپنی پڑھائی کا خرچ خود برداشت کر سکوں۔"

ابھی کل ہی تو اس کا بی ایس کا رزلٹ آیا تھا اور پھپھو سلیمہ نے زندگی میں پہلی بار اسے اتنی لمبی بات کرتے دیکھا اور سچی خوشی کے رنگ اس کے چہرے پر بکھرے دیکھے، وہ مسکرا دیں۔

"نہیں تم بس پڑھو اور خوب پڑھو، ٹیوشنز جیسی مشقت کرنے کی میں تمہیں اجازت ہرگز نہیں دوں گی، تمہارے پھپھا کی تین دکانوں کا کرایہ آتا ہے، پھر ان کی پینشن ہے اور کھانے والے ہم دو ہی، شام کو مسز احمد کو مٹھائی ہی دے کر آؤں گی آخر انہی کے تعاون کی وجہ سے ممکن ہو سکا ہے سب۔" پھپھو نے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلیں ٹھیک ہے، میں ذرا اپنے دوستوں کو

اپنی اس خوشی میں شریک کر لوں۔" وہ کہتی اٹھ کھڑی ہوئی اور پھپھو جانتی تھیں کہ اس کے دوستوں نے باہر حجرے میں اس کے انتظار میں شور ڈال رکھا تھا۔

☆☆☆

ہر کسی نے ہی اپنے اپنے حساب سے اسے خوب سنائیں اور خدیجہ بیگم نے تو ابھی تک اپنی ناراضی برقرار رکھی تھی اور اس سے کلام تک نہیں کیا تھا، فاری بھی خفا خفا سی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے جو آپ کی مرضی، جیسا چاہیں کریں مگر مجھ سے بولیں تو سہی دیکھیں تو سہی مجھے اور کتنے ماہ ہو گئے آپ کی گود میں سکون کی نیند سوئے ہوئے۔" خدیجہ بیگم کے ناراض چہرے کو دیکھتے وہ اٹھ کر سب کے درمیان میں بیٹھی ماں کے قریب آ کر ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا اور اس کے منہ سے یہ بات سننے کی دیر تھی کہ سب کے چہرے کھل اٹھے، خدیجہ بیگم نے بھی جھک کر پیشانی چومی اور اس کے گھنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے دونوں بہوؤں سے اس کے لئے لڑکی فائنل کرنے کا مشورہ کرنے لگیں جو ان آٹھ نو، ماہ میں اس کے لئے ان سب نے دیکھ رکھی تھیں، وہ چپ چاپ آنکھیں موندے بس یہ سب سنے گیا، اب کہنے کے لئے بچا بھی کچھ نہیں تھا۔

"میں بہت خفا ہوں بھائی آپ سے۔" رات کو اسے تنہا پاتے ہی فاری نے گھیر لیا۔

"وہ کیوں بھئی، اب اس غریب سے کیا قصور سرزرد ہو گیا؟" اس کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔

"اگر ماں ہی جانا تھا تو یہ سب کھڑاگ ڈالنے کی ضرورت ہی کیا تھی، میری واحد دوست کو بھی مجھ سے جدا کر دیا، کتنی اچھی تھی دیا، کہتی تھی میری کوئی بہن نہیں ہے فاری اور تمہاری شکل میں اللہ نے مجھے دو رشتے دے دیئے ایک بہن کا، ایک دوست کا، آپ کی وجہ سے اس نے اپنے منہ سے مجھے اپنے گھر آنے سے روک دیا، یا تو آپ یہ سارا معاملہ اٹھاتے ہی ناں یا اگر بات شروع کی تھی تو اسے پایہ تکمیل تک پہنچاتے مگر آپ نے تو بیچ راہ میں ہی ہار مان لی۔" منہ پھلائے پھلائے اس نے اپنی خفگی کی وجہ بیان کی۔

"میں نہیں تھکا تھا فاری نہ میرے جذبوں میں کمی آئی تھی، مگر بعض اوقات آپ کو وہ سب نہیں ملتا جو آپ چاہتے ہیں، کبھی رشتے آپ کی کمزوری بن جاتے ہیں، تو کبھی حالات آڑے آ جاتے ہیں، دیا ہی مان جاتی تو میں ساری دنیا سے لڑ جاتا مگر ایسے کسی بنیاد کے بغیر میں اپنی ماں کو ناراض نہیں کر سکتا۔" وہ بے حد سنجیدگی سے بولا۔

"اور مجھے امید ہے کہ میری شادی کے بعد تمہاری دوست اور تمہاری تائی کے سب خدشات رفع ہوتے ہی تمہاری دوستی بحال ہو جائے گی۔" اب کے اس نے ہلکا پھلکا لہجہ اختیار کیا۔

☆☆☆

کچھ دن سے پھپھو کی طبیعت کچھ خراب تھی، ویسے تو جازب کے بعد سے ہی ان کو بلڈ پریشر کی بیماری نے مستقل ساتھی بنا لیا تھا مگر آج کل بی پی بے حد بڑھا ہوا تھا، ابھی کل ہی تو وہ دیا کے ساتھ جا کر ڈاکٹر کو دکھا آئی تھیں، دوائیوں کے ڈھیر کے ہمراہ حسب معمول ڈاکٹر نے ہدایات کا پلندہ بھی انہیں تھمایا تھا کہ انہیں خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے اور ہر قسم کی ٹینشن سے دور رکھا جائے، دیا ان کو باقاعدگی سے دوائی دیتی تھی، ان کا بے حد خیال بھی رکھتی تھی نہ تو خوشی دے سکتی تھی نہ ہی پریشانی سے دور رکھ سکتی تھی، وہ اب بھی جازب کو یاد کر کے گھنٹوں روتی تھیں، سو ان کی طبیعت کا

خیال کر کے ہی دیا نے آج یونیورسٹی سے چھٹی کی تھی، دن کو تو پھپھو کی طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی مگر رات کو دیا جب پڑھائی سے فارغ ہوئی تو اپنے کمرے سے ان کے کمرے میں آ گئی تب انہیں بہت بے چین دیکھا تھا، دیا نے جتنی دیر پڑھنا ہوتا اپنے کمرے میں رہتی پھر رات کو پھپھو کے کمرے میں آ جایا کرتی تھی، تین بجے تک پھپھو کی حالت بے حد خراب ہو گئی اتنی کہ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھیں، دیا کے ہاتھ پیر پھول گئے جاذب کی زندگی میں گھر میں پی ٹی سی ایل تھا مگر اس کی موت کے بعد پھپھو نے پتہ نہیں کس خدشے کے تحت وہ کٹوا دیا تھا، پھر ایک خیال آنے پر وہ خدیجہ بیگم کے گھر کے درمیانی دروازے کی طرف دوڑی جو پہلے تو آمد و رفت کے لئے استعمال ہوتا تھا مگر عمر والی بات کے بعد پھپھو سلیمہ نے اس میں تالا ڈال کر اس کو بند کر دیا تھا، لاؤنج کا بیرونی دروازہ اندر سے بند تھا، زور زور سے بجانے پر سب سے پہلے دروازے پر آنے والا شخص عمر ہی تھا جس کی نیندیں ویسے بھی کب سے اس سے روٹھ چکی تھیں اور وہ کروٹ پر کروٹ بدلتا سوچوں کے گرداب میں ڈوب اور ابھر رہا تھا جب دستک کی آواز سنی تھی، دیا نے اسے دیکھ کر مختصراً ساری صورتحال بتائی، عمر نے امی کے کمرے میں جا کر انہیں جگا کر بتایا پھر وہ تینوں خدیجہ بیگم سمیت فاری کو بتا کر پھپھو کی طرف آ گئے وہ ہنوز بے ہوش تھیں، عمر ایک بار پھر دوڑ کر اپنے گھر آیا گاڑی نکال کر گلی میں لایا پھر تائی سلیمہ کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالا، امی اور دیا بھی ضد کر کے ساتھ ہی چل دیں تھیں، ہاسپٹل میں ان کی حالت دیکھ کر انہیں ایمرجنسی میں لے جایا گیا ڈیڑھ گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد ان کو ہوش آیا تھا مگر ڈاکٹرز کی طرف سے ملنے والی اطلاع کچھ خاص خوش کن نہیں تھی، تائی سلیمہ کو ہارٹ اٹیک کا ایک ہلکا سا اٹیک ہوا تھا جو ان کا بلڈ پریشر بڑھ جانے کے سبب تھا، اگلے دن وہ ہوش میں تھیں مگر ابھی بھی ان کی حالت خطرے سے باہر نہیں تھی، خدیجہ بیگم کا پورا خاندان بیٹوں، بہوؤں سمیت پہنچ چکا تھا، دیا بے حد خوفزدہ حالت میں بھی ایک فرد کو دیکھتی تو کبھی دوسرے کو، فی الوقت اس کے پیش نظر صرف پھپھو کی صحت یابی تھی، فاری کا جذباتی سہارا ملتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی، پھر جس وقت پھپھو کی حالت ذرا خطرے سے باہر ہوئی انہیں وارڈ میں شفٹ کیا گیا، ان سے ملنے آنے والا پہلا فرد دیا تھی ایک ہی دن میں پھپھو سلیمہ بے حد کمزور اور نڈھال نظر آ رہی تھیں۔

''پھپھو! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے آپ اب بالکل ٹھیک ہیں، جلدی سے ٹھیک ہو جائیں پھر اپنے گھر چلیں گے۔'' اپنے آنسو ضبط کرتے اس نے ان کے کمزور ڈرپ لگے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا۔

دو آنسو پھپھو سلیمہ کی آنکھوں سے بہہ کر ان کی کنپٹیوں کی طرف بہہ گئے مگر وہ کچھ بولیں نہیں اور خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اگلے دو دن بعد پھپھو کو ڈسچارج کر دیا گیا، باقی سب لوگ تو ان تین دنوں میں آتے جاتے رہے تھے مگر دیا اور خدیجہ بیگم ان کے پاس سے ایک پل کو بھی نہیں ہٹے تھے اور عمر تو تھا ہی وہیں، واپسی پر بھی عمر کے ساتھ ہی وہ گھر واپس آ رہے تھے، خدیجہ بیگم عمر کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر تھیں جبکہ سلیمہ اور دیا پچھلی سیٹ پر۔

''خدیجہ!'' دفعتاً پھپھو کی نڈھال آواز پر وہ سب چونک گئے۔

''جی بھابھی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟''

خدیجہ بیگم نے مڑ کر ان کو دیکھا۔

"بیٹیاں بہت پیاری ہوتی ہیں اور ان کے رشتوں کے لئے بہت دیکھ بھال سے کام لینا پڑتا ہے اور بیٹیوں کی ماؤں کو بھی گھر بیٹھے رشتے کوئی نہیں دیتا، اس کے لئے جوتیاں گھسانی پڑتی ہیں۔" ان کی اکیلے بے وقت اور بے موقع بات پہ خدیجہ بیگم حیران رہ گئیں۔

"اور جی بھابھی ٹھیک کہتی ہیں آپ۔" اسی لمحے عمر نے بیک مرر میں سے سر جھکائے بیٹھی دیا پر ایک چور نظر ڈالی، نظر کا ارتکاز محسوس کرتے ہی دیا نے نظر اٹھا کر دیکھا اور پھر گھبرا کر دوبارہ نظر جھکا لی کہ جذبوں کی شدت آج بھی ان آنکھوں سے ویسے ہی عیاں تھی۔

"تمہیں دو باتیں کیا کہہ دیں کہ تم نے دوبارہ ذکر ہی نہیں چھیڑا، ارے ایسے رشتے تھوڑی ہو جاتے ہیں بچوں کے، دیا اب میری بہو نہیں، بیٹی ہے اور میں مرنے سے پہلے اسے اپنی زندگی میں خوش باش اور مطمئن دیکھنا چاہتی ہوں، آپ دوبارہ جب چاہیں میرے گھر اس مقصد کے لئے آ سکتی ہیں۔" اپنے کمزور ہاتھوں پر نظریں جماتے جس پل تائی لرزتی آواز میں یہ بات کہی عمر کے ہاتھ سے اسٹیرنگ ایک لمحے کو بے قابو ہوا اور گاڑی لہرائی، دیا اور خدیجہ بیگم پر بھی گویا شادی مرگ طاری ہو گیا۔

"جی جی بھابھی، ضرور...... ضرور آئیں گے، ہمارے لئے اس سے بڑھ کر بھلا خوشی کی بات کیا ہوگی اور دیا صرف آپ کی بیٹی نہیں ہماری بھی بیٹی ہے۔" خدیجہ بیگم نے خوشی سے بے قابو ہو کر کہا، عمر نے ایک بار پھر اس دشمن جاں کو دیکھا جس کا چہرہ بے حد سرخ ہو رہا تھا اور پلکیں ایسے تھیں جیسے ان پر بوجھ لاد دیا گیا ہو۔

☆☆☆

"ارے پھپھو! اندر کیا کر رہی ہیں باہر آئیں دیکھیں تو موسم کیسا زبردست ہو رہا ہے۔" دیا کی کھلکھلاتی آواز نے انہیں سوچوں کے بھنور سے کھینچ کر نکالا۔ بے حد خوبصورت دھنک رنگ صورت میں بنی سنوری دیا کسی تتلی کی مانند یہاں وہاں اڑتی پھر رہی تھی، سچی خوشی اور بہترین رفاقت کے رنگ اس کے حسین چہرے کو مزید حسین بنا رہے تھے، اس روز خدیجہ بیگم کو کہنے کی دیر تھی کہ وہ اسی روز اپنے پورے خاندان کے ہمراہ دست دراز کیے ان کے گھر پر موجود تھیں، پھر تائی سلیمہ کے ہاں کرتے ہی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے تھے پھر دیا نے ہی عمر سے بے حد گھبراتے اور شرماتے ہوئے درخواست کی تھی کہ وہ پھپھو کو اکیلے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی اور اگلی بات خود ہی عمر نے مکمل کی تھی کہ وہ خود بھی یہی چاہتا ہے کہ تائی کو دیا کے ساتھ رکھے مگر تائی سلیمہ نہیں مانی تھیں تب عمر نے ان سے کہا تھا کہ وہ اسے اپنے جازب کی جگہ سمجھ کر اپنے گھر میں رہنے دیں، یہ سن کر پھپھو سلیمہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں اور عمر کو گلے سے لگا کر اس کی پیشانی چوم لی تھی، یوں دیا رخصت ہو کر خدیجہ بیگم کے گھر نہیں آئی تھی بلکہ خدیجہ بیگم نے یہاں بھی اپنا ظرف وسیع کرتے ہوئے عمر کو تائی کے گھر رہنے کی اجازت دے دی یوں شادی کے بعد پندرہ دن دیا کے ساتھ گزار کر عمر کل ہی جاب پر واپس گیا تھا، وہ سب تائی سلیمہ کی اس کایا پلٹ کو ان کی اچانک طبیعت کی خرابی سمجھے تھے مگر حقیقت تو صرف وہی جانتی تھیں کہ کیا تھی، انہیں پھر سے وہ وقت یاد آیا جس نے ان کے فیصلے میں دراڑیں ڈالی تھیں، اس دن ان کی طبیعت بے حد بے چین تھی دیا اپنے کمرے میں پڑھ رہی تھی جب زیادہ طبیعت گھبرائی تو وہ خود ہی اٹھ کر دیا کے کمرے کی

طرف آ گئیں کہ اسے بلا لائیں کہ بہت رات ہو گئی ہے وہ آ کر سو جائے، مگر کمرے کا دروازہ کھولتے ہی انہیں دیا کی ہنسی کی آواز سنائی دی وہ ٹھٹک گئیں اور دروازہ تھوڑا ہی کھلا رہنے دیا، جھانکنے پر ان کی سانس گویا گلے میں ہی اٹک گئی تھی، دیا نے اپنا عروسی لباس زیب تن کر رکھا تھا، تمام زیورات کو اپنے وجود کی زینت بنا کر میک اپ سے بھی خود کو سنوارا ہوا تھا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی خود فراموشی کے عالم میں پتہ نہیں کس سے گفتگو کر رہی تھی، کبھی مسکرانے لگتی تو کبھی شرمانے تائی سلیمہ سے زیادہ دیکھا نہ گیا وہ دروازہ آہستہ سے بند کر کے واپس اپنے کمرے میں آ کر گہرے گہرے سانس لینے لگیں، جذبوں پر بھی بھلا بند باندھے جا سکتے ہیں یا فطرت کو بھی دبایا جا سکا ہے، انہوں نے یہ دونوں کام کرنے کی کوشش کی تھی، پھر کافی دیر بعد جب دیا آئی تو معمول کے لباس اور معمول کے انداز میں تھی انہوں نے آنکھیں موند کر خود کو سوتا ظاہر کیا اور پھر اگلا سارا دن وہ معمول کے انداز میں رہی، صبح اٹھ کر نماز پڑھ کر ناشتہ بنایا، پھپھو کو ناشتہ دے کر دوائی دی اور خود یونیورسٹی چلی گئی، رات آنے تک پھپھو سلیمہ بغور اس کا مشاہدہ کرتی رہیں اور مخصوص ٹائم پر اٹھ کر ایک بار پھر دیا کے کمرے کی طرف دبے پاؤں آئیں، آج بھی کم وبیش وہی منظر تھا مگر آج دیا عروسی لباس کی بجائے ایک گہرے رنگ کے لباس میں ملبوس تھی تیز میک اپ کے ساتھ اس کے گھنے بال کھلے ہوئے کمر پر بکھرے پڑے تھے، آج ڈریسنگ ٹیبل کی بجائے وہ صوفے پر بیٹھی ایسے گفتگو کر رہی تھی جیسے اس کے سامنے کوئی موجود ہو۔

''کیا ایسے کر کے وہ اپنی تشنہ آرزوؤں کی تکمیل کر رہی ہے، کیا غیر فطری زندگی گزارنے پر مجبور کر کے میں اسے نفسیاتی مریضہ بنا رہی ہوں۔'' واپسی کے سفر میں ان گنت سوال خونی اژدھوں کی مانند لپک لپک کر اپنی سرخ زبانیں پھپھو کو دکھا رہے تھے۔

چوتھے دن انہوں نے عمر کا نام اس کے لبوں سے سنا تھا، حسب معمول بے حد تیاری کے ساتھ وہ عمر کو اپنے ہجر کے قصے سنا رہی تھی اس سے زیادہ پھپھو برداشت نہ کر سکیں اور اگلے ہی دن بے حد بیمار پڑ گئی تھیں۔

''یہ لیں جناب گرما گرم چائے اور ہلکے مصالحے والے پکوڑے۔'' دیا نے چائے اور پکوڑے لا کر ٹیبل پر رکھے، پھپھو سلیمہ اپنے خیالوں سے باہر آ گئیں۔

''جیتی رہو، خوش رہو، سدا سہاگن رہو۔'' انہوں نے دعائیں دینے میں بخل سے کام نہیں لیا، دیا شرما کر سر جھکا گئی، قاری آ گئی تھی اب دونوں کی برآمدے میں ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں، پھپھو سلیمہ نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے چائے کا کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ انہوں نے صحیح وقت پر ایک صحیح فیصلہ کر کے نہ صرف عمر اور دیا کی ذہنی نیا پار لگائی تھی بلکہ اپنے لئے بھی اجر کا سامان کر لیا تھا، سامنے لگی جاذب کی تصویر کو دیکھ کر وہ نم آنکھوں سے مسکرا دیں، انہیں لگا وہ بھی ان کے اس اقدام سے مسکرا رہا ہو۔

☆☆☆

حصارِ محبت
شبانہ عرفان

"تھوڑی دیر بعد آپریشن تھیٹر کا دروازہ جھٹکے سے کھلے گا اور ڈاکٹر صاحب کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح باہر آجائیں گے، چند لمحے توقف کے بعد وہ ہم سب کی جانب دیکھ کر گہری سانس لیں گے، انہیں اپنی طرف متوجہ پا کر ہم کمان سے نکلے تیروں اور بڑی پھپھو توپ سے نکلے گولے کی طرح ان کے قریب پہنچ جائیں گی، اس لمحے ہسپتال کی راہداری میں قبرستان کی سی خاموشی ہوگی، سب لوگ ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے ہوں گے اور دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو چکی ہوں گی، ڈاکٹر صاحب بغور ہماری جانب دیکھ کر دھیمے لہجے میں کہیں گے، معافی چاہتا ہوں، ہم نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی، مگر خدا کو یہی منظور تھا، سچ تو یہ ہے کہ مریضہ شاید جینا ہی نہیں چاہتی تھی، آخری لمحے بھی اس کے لبوں پر نمیبولال کا کوئی نا قابل تشریح گانا تھا۔"

ولید کا تبصرہ ابھی مکمل نہیں ہو پایا تھا کہ عقب میں بیٹھی دادی جان نے اس کی کمر پر ایک دھموکا رسید کیا اور غصیلے لہجے میں بولیں۔

"کیوں بلاوجہ اول فول بکے چلا جا رہا ہے، تیری بہن کے ہاتھ میں کانچ کا ٹکڑا لگا ہے، دماغ پر چوٹ نہیں جو یوں بھیانک منظر کشی کر کے سب کے زخموں پر نمک چھڑک رہا ہے، ارے بہت ڈھیٹ ہے وہ کچھ نہیں ہوگا اسے، دیکھنا ابھی دندناتی ہوئی باہر آ دھمکے گی۔"

"خدا کے لئے دادی جان ایسے تو نہ کہیں، رانیہ نے جان بوجھ کر تو چوٹ نہیں لگوائی، آپ کے حکم پر پانی لینے کچن میں گئی تھی وہاں گلاس ٹوٹ گیا، اب اس بے چاری کی بدقسمتی کہ خود ہی فرش پہ بکھرے کانچ کے ٹکڑے سمیٹنے بیٹھ گئی اور پھر ایک تیز دھار ٹکڑا اس کے نازک سے ہاتھ میں گھس گیا۔" قریب بیٹھی حمنہ نے بہن کی حمایت کرنا چاہی تو دادی جان مزید چمک اٹھیں۔

"تب ہی تو کہتی ہوں ہمارا دور اچھا ہوتا تھا جب گھر میں پیتل کے گلاس ہوا کرتے تھے، دھوتے دھوتے ہاتھ ٹوٹ جائیں مگر گلاس نہ ٹوٹے، یاد نہیں اماں مرحومہ کے جہیز کا وہ گلاس جو تیرے دادا نے گھر آئے چور کو کھینچ کر مارا تھا، پکڑے جانے پر چور کا کہنا تھا کہ ساری زندگی ہونے والی پولیس کی چھترول ایک طرف اور یہ پیتل کا گلاس ایک طرف۔"

دادی جان نے بہن کے لئے پریشان حمنہ کو ڈپٹ کر اپنے جہیز میں شامل پیتل کے برتنوں کی خصوصیات بیان کرنا چاہیں تو پھپھو نیلم نے بھی دبے لفظوں میں ان سے خاموش رہنے کی التجا کی۔

"بس بھی کریں اماں! کیا اب بچیوں کی جان لیں گی، ایک گلاس ہی تو ٹوٹا ہے اور وہ بھی بے چاری کو لہولہان کر گیا، آپ کو رانیہ کی بالکل پرواہ نہیں ہے اور اس دو ٹکے کے گلاس کے لئے بولے چلی جا رہی ہیں۔"

بحث ابھی جاری تھی کہ آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان ڈاکٹر نے نرس کے ہمراہ باہر نکلتے ہی چونک کر ان سب کی جانب دیکھا۔

"آپ لوگ کون ہیں اور کیوں شور مچا رہے ہیں آپریشن تھیٹر کے سامنے۔"

"ارے میاں معالج، ہم یہاں دھرنا دینے نہیں آئے، ہماری بچی کا آپریشن ہو رہا ہے اندر۔"

"وہ جس کے دل کا والو بند ہے۔" ڈاکٹر نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"تیرے منہ میں خاک، کہاں سے ڈاکٹری پڑھ لی تو نے جو ہاتھ کے بجائے دل کھول کر رکھ دیا میری بچی کا، ہائے میں لٹ گئی برباد ہو گئی، ان

قصائیوں نے میری بچی کے دل گردے الگ الگ کر دیے۔"

دادی اماں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پیٹ ڈالا، ماتم ابھی جاری تھا کو عقب سے رانیہ کی نحیف سی آواز سنائی دی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں دادی، دل کا آپریشن تو ساتھ والے آپریشن تھیٹر میں ہو رہا ہے۔" وہ پٹیوں میں لپٹا اپنا نازک سا ہاتھ انہیں دکھاتے ہوئے بولی، صورت حال واضح ہوتے ہی ڈاکٹر کو بھی جیسے ہوش سا آ گیا۔

"اوہ، تو یہ جلوس آپ کو لینے آیا ہے؟"

"جی معافی چاہتی ہوں، دراصل یہ سب لوگ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔" رانیہ نے معذرت کرنا چاہی۔

"اور شاید آپ کی محبت میں کسی کا خون بھی کر سکتے ہیں۔" ڈاکٹر نے دانت پیستے ہوئے جوابی حملہ کیا تو دادی جان نے بھی نیزہ پھینک کر نیام سے تلوار نکال لی۔

"دیکھو میاں صاحبزادے! اب تم ہماری شرافت کے جواب میں آپے سے باہر ہوتے چلے جا رہے ہو، جب ہماری بچی نے تم سے معافی مانگ لی تو پھر کیوں آنکھیں دکھا رہے ہو، یعنی کیا کہتے ہیں کہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے، مطلب غلطی بھی تمہاری اور آنکھیں بھی ہمیں دکھاؤ گے۔"

"میری غلطی...... آپ کہنا کیا چاہتی ہیں محترمہ بزرگ خاتون، میں نے ہی آپ کی پوتی کے ہاتھ کا آپریشن کر کے کانچ کے ٹکڑے نکالے ہیں اور آپ مجھے ہی قصوروار ٹھہرا رہی ہیں، کمال ہے بھئی کیسا زمانہ آ گیا ہے یعنی مروتاً بھی شکریہ کا لفظ نہیں ٹپکا کسی ایک کے منہ سے۔" اس نے آخری جملہ خود پر ضبط رکھنے کی کوشش میں زیر لب کہا تھا۔

"ارے یہی تو کہہ رہی ہوں کہ جب جراحی ہاتھ کی ہوئی ہے تو پھر باہر آ کر دل کے آپریشن کا واویلا کیوں مچا دیا۔"

"کیونکہ اتنے لوگ صرف دل کے مریض کے لئے ہی بوریا بستر سمیٹ کر یہاں آ سکتے ہیں، ہاتھ پر لگنے والی چوٹ کے لئے نہیں۔"

"برابر کی چوٹ ہے، کم ڈاکٹر صاحب بھی نہیں، یقیناً اپنے محلے میں بوبو کے نام سے مشہور ہوں گے۔"

"کیا بولا تم نے گول گے؟" ڈاکٹر نے پلٹ کر گول مٹول ولید کو گھورا تو وہ سہم کر پھپھو کے عقب میں جا چھپا۔

"جانے دیجئے ڈاکٹر صاحب! یہ سب غلط فہمی کے باعث ہوا، بہت شکریہ کہ آپ نے رانیہ کے ہاتھ کا آپریشن کیا، کیسی ہے اب ہماری رانیہ؟"

"ان سب میں آپ ہی مجھے کچھ معقول اور تہذیب یافتہ معاشرے کی پر امن شہری دکھائی دے رہی ہیں، اس لئے بتاتا چلوں کہ زخم کافی گہرا تھا، کانچ اندر تک چلا گیا، بہرحال اب یہ ٹھیک ہے، نسخے کے مطابق دوا لیتی رہیں اور بینڈیج بھی ضروری ہے، ہاں البتہ نسخے پر یہ جملہ لکھنا اور ہائی لائٹ کرنا شاید میں بھول گیا ہوں کہ جب بھی یہ پٹی کروانے ہسپتال آئیں تو اپنا حفاظتی دستہ گھر ہی چھوڑ آئیں، صرف آپ ان کے ہمراہ آ سکتی ہیں، یہی ہدایت میں گیٹ پر موجود سیکورٹی گارڈ کو بھی دینے والا ہوں کہ آئندہ کوئی بھی غیر متعلقہ ہجوم مجھے آپریشن تھیٹر کے سامنے دکھائی نہیں دینا چاہیے۔"

اپنی بات مکمل کر کے ڈاکٹر دانش نے ان سب کے چہروں پر آخری نظر دوڑائی اور نخوت

سے ''ہوں'' کہتا ہوا لفٹ میں جا گھسا۔

''ویسے کچھ کچھ بے عزتی سی نہیں ہو گئی ہماری۔''

''ارے کہاں کی بے عزتی، ہم نے اپنی بات پر قائم رہ کر اس چھوکرے کے چودہ طبق روشن کر دیے ہیں، پھر شکست کیسی۔''

دادی جان نے ولید کے سر پر دست شفقت رکھتے ہوئے اپنی فتح کا اعلان کیا اور سب لوگ گھر روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

بس ایسی ہی تھی یہ نٹ کھٹ سی فیملی، رانیہ، حمنہ اور ثمرہ تین بیٹیاں تھیں ناصر علی کی جب کہ سب سے چھوٹا بیٹا ولید تھا، ناصر علی کی شادی فاخرہ بیگم سے ہوئی تھی جو ان کی خالہ زاد تھیں، ناصر علی اس رشتے سے خوش نہیں تھے، انہوں نے والدین کے اصرار پر فاخرہ بیگم سے شادی تو کر لی مگر نبھا نہ کر سکے، تیرہ برس قبل ولید کی پیدائش کے بعد جب انہوں نے بزنس کے سلسلے میں فرانس کا رخ کیا تو وہیں ایک گوری کی زلفوں کے اسیر ہو کر شادی بھی کر لی۔

اپنی دوسری شادی کی خبر ناصر علی نے کسی سے نہیں چھپائی تھی، چنانچہ ان کے والد نے اس بات کا سخت نوٹس لیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ناصر علی نے اپنے وطن اور خاندان کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ دیا اور مستقل طور پر فرانس میں سکونت اختیار کر لی، گھر، بیوی اور بچوں سے ان کا تعلق صرف ماہانہ موصول ہونے والی ایک معقول رقم تک محدود ہو گیا تھا۔

دادا جان کا اپنا بھی ٹھیک ٹھاک کاروبار تھا مگر انہوں نے کبھی ناصر علی کو رقم بھیجنے سے منع نہیں کیا تھا، ان کا موقف یہ تھا کہ اس رقم پر ناصر علی کی اولاد کا مکمل حق ہے وہ کسی پر احسان نہیں کر رہا، چنانچہ دادا جان نے باہر سے آنے والی رقم بینک میں بچوں کے نام پر جمع کروانا شروع کر دی تاکہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر ان کے خاندان کو مالی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

یہ دادا جان کی دور اندیشی تھی کہ ان کی وفات کے بعد جب ان کا کاروبار سنبھالنے والا بھی کوئی نہ رہا تو گھر والوں کو کسی قسم کے معاشی بحران کا سامنا نہ کرنا پڑا، ناصر علی اپنے والد کی وفات کے موقع پر واپس تو نہ آ سکے مگر اس سانحے کے ٹھیک تین ماہ بعد ان کا تابوت پاکستان پہنچ گیا۔

اطلاع کے مطابق ناصر علی ان دنوں کسی گہرے ڈپریشن میں مبتلا تھے اور یہی ڈپریشن ایک روز کار ایکسیڈنٹ کا باعث بنا۔

شوہر کی وفات کے بعد فاخرہ بیگم نے بالکل ہی چپ سادھ لی، انہوں نے اپنے بچوں کو مرغی کی طرح اپنے پروں تلے سمیٹ لیا تھا، صرف فاخرہ بیگم ہی نہیں دادی جان نے بھی زندگی کی ہر مشکل میں ان کا جی جان سے ساتھ دیا تھا، ویسے بھی انہیں پوچھنے والا تھا ہی کون، تین بیٹیاں تھیں جن میں سے دو اپنے شوہروں کے ساتھ بیرون ملک مقیم تھیں اور کبھی کبھار فون کر کے اپنی موجودگی کا احساس دلایا کرتی تھیں، جب کہ تیسری بیٹی نیلم کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ انہی کے ساتھ زندگی گزار رہی تھی۔

☆☆☆

شوہر کی وفات کے بعد فاخرہ بیگم نے دادی جان کی کوششوں سے معقول رشتہ ڈھونڈ کر بڑی بیٹی ثمرہ کی شادی کر دی تھی اور اب سارا خاندان رانیہ کو اس بات پر راضی کرنے کے لئے پاپڑ بیل رہا تھا کہ وہ آئے دن آنے والے معقول رشتوں میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ سنا کر دادی

جان کی دوسری مشکل بھی آسان کر دی، مگر رانیہ کو تو جیسے شادی کے نام سے ہی چڑ تھی۔

جب بھی دادی جان یا فاخرہ بیگم کسی رشتے کا ذکر چھیڑتیں، رانیہ کا موڈ اگلے کئی روز تک خراب رہتا تھا، خاندان میں اس کا ہم عمر کوئی لڑکا موجود نہیں تھا لہٰذا دادی جان نے کئی رشتے کروانے والی عورتوں کو یہ ٹاسک دے کر شہر بھر کے گلی کوچوں میں پھیلا دیا تھا، وہ جلد از جلد رانیہ کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر حمنہ کی جانب متوجہ ہونا چاہتی تھیں مگر ضدی رانیہ کسی طور انہیں ہاتھ نہیں تھما رہی تھی، وہ فی الحال اپنی پڑھائی مکمل کر کے سکون سے ملازمت کرنا چاہتی تھی، لیکچرر شپ اس کی زندگی کا وہ حسین سپنا تھا جو دادی اماں کے لیکچرز کے سامنے آئی سی یو میں دکھائی دے رہا تھا۔

☆☆☆

اس روز ہفتہ وار چھٹی تھی لیکن ناشتے کی میز پر دادی جان نے صبح سویرے ہی رانیہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"میں کہتی ہوں، کیا برائی ہے نذیر میں؟"

"نذیر نہیں نذیر فرام لندن، یہی نام لے رہی تھیں نا رانیہ کی ہونے والی ساس۔" قریب بیٹھی حمنہ نے اسے چٹکی بھرتے ہوئے دادی جان کی بات میں اضافہ کرنا چاہا تو انہوں نے وہیں سے گولا داغ دیا۔

"تو اپنی چونچ بند رکھ لڑکی، بہت زبان چلنے لگی ہے تیری، کوئی بات نہیں اس رانیہ کے بعد تیری ہی منڈی مروڑنا ہے مجھے، یوں لگتا ہے زمانے بھر کی لڑکیاں ہمارے ہی گھر میں پیدا ہو گئیں ہیں، پالتے جاؤ بیاہتے جاؤ، پالتے جاؤ بیاہتے جاؤ، پہلے اپنی بیاہیں، پھر تین تم آ ٹپکیں۔"

"یوں تو مت کہیں دادی جان، ہم آپ پر کوئی بوجھ تو نہیں ہیں، کیا ہوا جو آج ہمارے ابو نہیں ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ اس پاک ذات نے کبھی ہمیں کسی مالی پریشانی میں مبتلا نہیں کیا۔" ثمرہ نے دبے لفظوں میں ہلکا سا احتجاج کیا تو خلاف توقع دادی جان کا دل پسیج گیا۔

"ہاں تو میں کیا کم پیار کرتی ہوں تم تینوں سے، اری نادان لڑکیو! میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم سب میری زندگی میں ہی اپنے اپنے گھروں کی ہو جاؤ، میں مر گئی تو کون بر تلاش کرے گا تمہارے لئے، فاخرہ تو ویسے ہی اللہ میاں کی گائے ہے، اتنے سالوں میں کبھی میں نے اسے اونچا بولتے نہیں سنا، البتہ اسے اونچا سننے کی شکایت شادی کے پہلے روز سے رہی ہے، سچ کہوں تو تمہاری ماں نے سوائے صبر کرنے کے کچھ سیکھا ہی نہیں زندگی میں، افسوس کہ جتنی اچھی فطرت پائی اتنی ہی بری قسمت، پہلے اپنے شوہر کی توجہ کی منتظر رہی، اس کی ڈانٹ ڈپٹ سہتی رہی، مار کھاتی رہی اور اس کے جانے کے بعد تم سب کو اپنا مان کر چپ سادھ لی، میں جب بھی اس کے روٹھے ہوئے نصیب کے بارے میں سوچتی ہوں تو قصور مجھے اپنے بیٹے کا ہی دکھائی دیتا ہے، کبھی کبھی تو میں خود کو بھی اس کا مجرم تصور کرنے لگتی ہوں، کیا ضرورت تھی مجھے اپنے بیٹے کو زبردستی اس شادی کے لئے مجبور کرنے کی، بہت ظلم کیا ہے میں نے تمہاری ماں پر۔" یہ کہہ کر دادی جان نے دوپٹے کے پلو سے اپنی پرنم آنکھیں صاف کیں، ان کے نحیف وجود سے اپنے لئے محبت کا چشمہ پھوٹتا دیکھ کر ان تینوں کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ سمٹ کر دادی کے ساتھ آ لگیں۔

اسی لمحے فاخرہ بیگم بھی چائے کی ٹرے سنبھالے ان کے پاس آ بیٹھیں، وہ حسب معمول

چپ تھیں لیکن آنکھیں اس بات کی چغلی کھا رہی تھیں کہ بچن میں سنائی دینے والی ساس کی باتوں نے انہیں کچھ پل کے ماضی کی دلدل میں دھکیل دیا تھا، مگر پھر انہوں نے اس جذباتی لمحے کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور بولیں۔

''اسی لئے تو تمہاری دادی جان اور میں چاہتی ہوں کہ رانیہ، نذیر سے شادی کے لئے ہاں کر دے۔''

''نذیر نہیں، نذیر فرام لندن۔''

حمنہ نے پھر سے لقمہ دیا، مگر اس مرتبہ کسی نے اس کے جملے پر توجہ نہ دی، چند لمحے گہری خاموشی طاری رہی، پھر رانیہ نے دادی کی جانب دیکھا۔

''نہیں دادی جان! مجھے یہ رشتہ قبول نہیں، آپ کی عزیزہ سکھی زرینہ بی بی بتا رہی تھیں کہ ان کا بیٹا ولائت کے ایک بڑے ہوٹل میں منیجر ہے، بقول ان کے نذیر سے شادی صرف قسمت والی لڑکی ہی کر سکتی ہے، جب کہ میری قسمت اتنی اچھی نہیں کہ بنا احتجاج کیے سولی چڑھ جاؤں۔''

''اور سنو! اس لڑکی کے منہ میں تو رب نے جانے کس چھڑے کی زبان فٹ کر دی ہے جو ہر بات کا الٹ جواب ملتا ہے۔'' دادی جان نے انکار سنتے ہی اپنا سر تھام لیا تھا۔

''میری باتوں کو ہٹ دھرمی مت سمجھیں دادی جان! کیا آپ نہیں چاہتیں کہ میں زندگی سکون سے بسر کروں، میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ ہمارے علاوہ ہر کسی کی باتوں پر ایمان لے آتی ہیں، ایک بات یاد رکھیں کہ بیرون ملک جانے والے ایسے تمام لڑکے جو اپنے گھر والوں کو یہ بتاتے ہیں کہ وہ یورپ کے ہوٹلوں میں منیجر ہیں، وہاں برتن دھوتے ہیں، کبھی آپ نے سوچا ہے کہ تعلیم کیا ہے نذیر کی۔''

''میٹرک تھرڈ ڈویژن فرام فیصل آباد ویژن۔''

حمنہ نے کمپیوٹر کی طرح نذیر کا تعلیمی ریکارڈ اگل دیا تو رانیہ نے جواباً طنزیہ لہجے میں کہا۔

''یہیں سن لیں، جو آدمی تھرڈ ڈویژن میں میٹرک پاس ہے وہ لندن کے کسی سیون سٹار ہوٹل میں منیجر کیسے ہو سکتا ہے۔''

''اب مجھے ان باتوں کا کیا پتا، مجھ سے تو جو کچھ اس نے کہا میں نے تم لوگوں کے سامنے رکھ دیا۔'' بات شاید دادی جان کی سمجھ میں آ چکی تھی اسی لئے وہ پتھر سے موم ہونے لگی تھیں، فاخرہ بیگم بھی بیٹی کی بات توجہ سے سن کر اثبات میں سر ہلا رہی تھیں۔

''آپ پریشان مت ہوں دادی جان اللہ نے چاہا تو ہماری رانیہ کے لئے بہت اچھا لڑکا مل جائے گا۔'' قریب بیٹھی ثمرہ نے دادی جان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی۔

''ہاں بیٹی! امید پر ہی دنیا قائم ہے۔''

یہ کہہ کر دادی جان اٹھیں اور چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئیں، فاخرہ بیگم بھی برتن سمیٹ کر کچن میں چلی گئیں، حمنہ ان کی مدد کر رہی تھی کیونکہ ان کی اکلوتی ملازمہ آج کل چھٹی پر اپنے گاؤں گئی ہوئی تھی۔

کچھ دیر تک ڈائننگ روم میں خاموشی چھائی رہی پھر رانیہ نے ثمرہ کی طرف دیکھا۔

''ثمرہ! میں آج کل بہت پریشان ہوں، جیسے جیسے رزلٹ کے دن قریب آ رہے ہیں میرے دل کی دھڑکن بے قابو ہوتی چلی جا رہی ہے، تم سے کہا تھا کہ کسی دن مجھے شاہ جی کے آستانے پر لے جانا، ان سے کہیں گے ذرا حساب کر کے بتائے کہ میرا ایم ایس سی کا رزلٹ کیسا آنے والا ہے؟''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

”ہاں ضرور لے جاؤں گی، مگر ایسا کرو آج ہی چلتے ہیں، اس کے بعد میرا اگلے ہفتے ہی آنا ہو گا، سلیم آج کل بہت مصروف رہتے ہیں، دفتر کا کام بہت زیادہ ہوتا ہے، ان حالات میں جب وہ تھکے ہارے گھر آتے ہیں تو مجھے ہی انہیں کھانا وغیرہ دینا ہوتا ہے، آج تیرے بہانے میں بھی شاہ جی سے کچھ باتیں پوچھ لوں گی۔“ ثمرہ کو جیسے کچھ یاد آ گیا تھا۔

”ہاں ہاں جو دل چاہے پوچھ لینا مگر خدا کے لئے وہاں میری شادی کا رجسٹر کھول کر مت بیٹھ جانا، ہم صرف رزلٹ کی بات کریں گے اور کچھ نہیں۔“

”ویسے آپس کی بات ہے دادی جان نے تو مجھے کئی روز سے ٹاسک دے رکھا ہے کہ تمہیں کسی طرح گھیر گھار کر شاہ جی کے آستانے پر لے جاؤں اور انہیں کہوں کہ اپنے موکل سارے ملک میں گھما کر معلوم کریں کہ اس لڑکی کا دولہا کہاں چھپا بیٹھا ہے۔“

”تو کیا اب تم وہاں جا کر اس غیر آدمی کے سامنے میری درگت بناؤ گی۔“ رانیہ نے برا سا منہ بنایا تو ثمرہ مسکرائی۔

”نہیں میری جان، مجھے تم پر رحم آ گیا ہے، بے فکر ہو جاؤ وہاں ایسی کوئی بات نہیں ہو گی۔“ ثمرہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے بائیں آنکھ کا کونا دبایا تو دونوں اپنا قہقہہ نہ دبا سکیں۔

☆☆☆

”یہ میری بہن رانیہ ہے شاہ جی۔“ ثمرہ نے اس کا تعارف کروایا، تو شاہ جی نے اپنی جھکی ہوئی پلکیں اٹھا کر لال لال آنکھوں سے رانیہ کو گھورا۔

”شاہ جی! اس کا حساب لگا کر بتا دیں کہ امتحان کا رزلٹ کیسا آئے گا، بہت پریشان ہے بے چاری آج کل۔“ شاہ جی نے جواباً عجیب سی نظروں سے رانیہ کو دیکھا اور بولے۔

”اس کا سارا حساب کتاب اس کے ہاتھوں کی لکیروں میں پوشیدہ ہے۔“ وہ رانیہ کے گورے چٹے ہاتھوں کو ندیدی نظروں سے دیکھنے لگے جیسے ہاتھ نہیں ونیلا آئس کریم ہو۔

”ادھر آ کر بیٹھو لڑکی۔“ انہوں نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا تو سہمی ہوئی رانیہ کھسک کر آگے بڑھ گئی۔

”ہاتھ دکھاؤ۔“ یہ کہہ کر بے صبرے شاہ جی نے خود ہی اس کا ہاتھ تھام لیا اور کچھ دیر تک اس کے گداز ہاتھ اور مخروطی انگلیوں سے کھیلتے ہوئے بولے۔

”تمہاری شادی بہت جلد ہونے والی ہے لڑکی۔“

”کیا؟“ رانیہ نے ہڑبڑا کر اس جھٹکے سے اپنا ہاتھ کھینچا کہ سنگل پسلی شاہ جی تیز آندھی میں سفیدے کے بلند قامت درخت کی طرح جھوم کر رہ گئے۔

”یہ آپ کیا فرما رہے ہیں حضرت، میں آپ سے اپنے رزلٹ کے بارے پوچھنے آئی ہوں اور آپ نے میرا رشتہ ڈھونڈنا شروع کر دیا ہے۔“ اعتراض سن کر شاہ جی نے کھسیانے انداز میں قہقہہ لگایا۔

”یہاں آنے والی سب لڑکیاں یہی کہتی ہیں، لیکن میں بھی ماہر نفسیات سے کم نہیں، سب جانتا ہوں کہ جوان لڑکیوں کے دل کس لے پہ دھڑک رہے ہیں آج کل، میرا مشورہ یہی ہے کہ اگر تم کسی جو دل دے بیٹھی ہو تو یہ بات چھپاؤ مت، جو شاہ جی کے سامنے شرمایا، اس نے صرف نقصان اٹھایا۔“ شاہ جی کے انداز گفتگو نے رانیہ کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی، وہ جھنجھلا کر

بولی۔

"آپ ماہر نفسیات ہوں یا ماہر اقتصادیات مگر یہ طے ہے کہ روحانی علوم میں مہارت ہرگز نہیں رکھتے، آپ کو اس کام کی الف ب معلوم نہیں ہے، میں یہاں اپنے امتحان کا رزلٹ معلوم کرنے آئی اور آپ نے شادی کو موضوع بنا کر اندھیرے میں تیر چلانے شروع کر دیے، سچ کہوں تو آپ اندازوں سے کام لیتے ہیں اور کچھ نہیں۔" دل کی بھڑاس نکال کر رانیہ بڑبڑاتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھی اور دیوار کے قریب ثمرہ کے پاس جا بیٹھی۔

"اوہو تم تو خفا ہو گئیں، اتنا گرم مزاج ہونا ٹھیک نہیں جوان لڑکیوں کے لیے، ناراض مت ہو، جو کچھ پوچھنا چاہتی ہو وہی بتلا دیتا ہوں۔" شاہ جی مونچھوں تلے زیر لب مسکرائے۔

"بہت بہت شکریہ، مجھے کچھ نہیں پوچھنا، چلو ثمرہ واپس گھر چلتے ہیں۔" غیر متوقع صورت حال دیکھ کر ثمرہ اپنی جگہ سے اٹھنے ہی والی تھی کہ شاہ جی کے اشارے پر پھر سے بیٹھ گئی۔

"تم سناؤ ثمرہ بی بی، کیسی گزر رہی ہے، میاں کا کیا حال ہے، وہی بے ڈھنگی سی چال ہے اس کی یا پہلے سے بہتر ہے۔" شاہ جی کی زبان سے سلیم بھائی کا نام سن کر رانیہ نے چونک کر ثمرہ کی جانب دیکھا تو حیران رہ گئی، اس کی پرکشش آنکھوں میں تو جیسے اداسیوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔

"کیا بتاؤں شاہ جی!"

"کیوں کیا ہوا؟ کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو، کیا تمہارے شوہر کے حالات ابھی بھی وہی ہیں؟"

"ان کے معمولات میں تو رتی بھر فرق نہیں آیا شاہ جی، بلکہ صورت حال پہلے سے بھی ابتر ہو گئی ہے، ان کے نت نئے انداز اور ادائیں تو میرے لئے وبال جان بن گئی ہیں، جو تعویذ آپ نے دیا تھا اس نے بھی کوئی اثر نہیں دکھایا۔"

"تعویذ کا عمل تو اکیس دن بعد شروع ہو گا۔" شاہ جی نے جواب دیا۔

"لیکن اس روز تو آپ نے پندرہ دن کہا تھا۔" ثمرہ بولی۔

"بعض لوگ سخت جان ہوتے ہیں، ان کا مرض اتنا بڑھ چکا ہوتا ہے کہ تعویذ کا اثر قبول کرنے میں کچھ زیادہ وقت لگا دیتے ہیں۔" وہ کھسیانی ہنسی ہنسنے لگے۔

"اکیس دن بھی گزر ہی جائیں گے۔" ثمرہ نے مایوسی سے کہا۔

"کیوں پریشان ہوتی ہو، یوں اپنی جان کو روگ مت لگاؤ۔" پھر انہوں نے چند لمحے توقف اختیار کیا اور بولے۔

"اچھا پہلے یہ بتاؤ کہ اس کی حرکتیں اب کیسی ہیں، اگر حالات مزید بگڑ گئے ہیں تو ممکن ہے میں کوئی دوسرا تعویذ دے دوں۔"

"کوئی ایک بات ہو تو بتاؤں، میں تو ان کی ہر حرکت پر کڑھتی رہتی ہوں، کہیں جانا ہو تو گھنٹوں ان کی تیاری نہیں ہو پاتی، بالوں کے سٹائل صبح و شام بدلتے رہتے ہیں، نہ جانے دن میں کتنی بار آئینے کے سامنے خود ہی اپنے حسن کا قصیدہ پڑھتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کی بیوی کے بجائے ایک نیاز مند عاشق کے فرائض انجام دوں، گھریلو لڑائیوں میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے، طعنے تو انہیں ایسے ایسے یاد ہیں کہ کیا کوئی ساس دے گی، ابھی نہیں اب فرمائش ہونے لگی ہے کہ ڈرائیونگ سیکھ لوتا کہ انہیں دفتر چھوڑ آیا کروں، کفایت شعاری میں تو عورتوں سے بھی ماہر ہیں، ان کی یہ بھی خواہش ہے کہ میں اپنی

جب خرچی پر انہیں پیش کرواؤں، بازار جاؤں تو ان کے لئے تحفہ ضرور لاؤں، پھر جب وہ تحفے کو شرف قبولیت بخشنے میں نازو انداز کا مظاہرہ کریں تو میں ہاتھ جوڑوں، پاؤں پڑوں، اب آپ ہی بتائیں شاہ جی کہ وہ سب کچھ جو مجھے زیب دیتا ہے وہ چاہنے لگیں گے تو میں کہاں جاؤں گی۔"

ثمرہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا، جب کہ رانیہ کے لئے یہ تمام انکشافات کسی بڑے سانحے سے کم نہیں تھے۔

"یہ سب بدلتے حالات کا اثر ہے۔" شاہ جی نے ثمرہ کی باتوں پر رنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"تم نے بھی اس چیز کو نوٹ نہیں کیا کہ آج کل کے مردوں میں نسوانیت اور عورتوں میں مرد بننے کی خواہش جنم لینے لگی ہے۔"

"واہ شاہ جی، نسوانیت کی بھی آپ نے خوب کہی، مجھے تو اس روز ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا سلیم نے جب انہوں نے اپنی بھانجی کی سالگرہ کی تقریب میں بیلے ڈانس شروع کر دیا، میں تو شرم کے مارے زمین میں گڑھی جا رہی تھی، جب کہ سہیلیاں میری قسمت پر رشک کر رہی تھیں کہ مجھے ایسا نایاب شوہر ملا ہے جو کلاسیکل اور پاپ دھنوں پر رقص بھی کر سکتا ہے۔"

ثمرہ بار بار پلکیں صاف کرتے ہوئے بولے چلی جا رہی تھی اور شاہ جی اسے مختلف ٹوٹکے بتانے میں مصروف تھے، قریب بیٹھی رانیہ کو اپنے بہنوئی کے اس روپ کا سن کر بہت دکھ ہو رہا تھا، شاید اسی لئے ثمرہ انہیں بہت کم اپنے ساتھ میکے لاتی تھی اور زیادہ تر ان کی مصروفیت کا بہانہ بنا کر ٹال دیا کرتی تھی، کتنی ٹوٹی ہوئی تھی اس کی بہن اندر سے مگر کبھی دادی جان، ماں یا بہنوں سے اپنا دکھ شیئر نہیں کیا تھا۔

شاہ جی کے آستانے سے نکلتے ہی ثمرہ نے اس کی منت کر لی تھی کہ گھر جا کر قطعاً ان باتوں کا ذکر نہ کرے، سوائے فاخرہ بیگم کے کسی کو ثمرہ کی پریشانی کا علم نہیں تھا، ثمرہ اپنے میکے کی مشکلات میں مزید کوئی اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی، لہٰذا یہی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اپنے گھر میں بہت خوش ہے اور سلیم اسے دل و جان سے چاہتا ہے۔

☆☆☆

"پینتالیس سالہ خوبرو نوجوان کو ایک رفیقہ حیات کی ضرورت ہے، یہ تعلیم یافتہ نوجوان ایک مشہور ہفت روزہ رسالے کا ایڈیٹر ہے، کنواری، بے اولاد، بیوہ، اور گھروں سے بھاگی ہوئی لڑکیاں بھی رابطہ کر سکتی ہیں۔" ولید نے ناشتے کی میز پر اخبار اٹھا کر با آواز بلند ضرورت رشتہ کے رنگین اشتہارات پڑھنے شروع کیے تو رانیہ کا پارہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔

"بند کرو اپنی بکواس، نہ میں بیوہ ہوں اور نہ ہی گھر سے بھاگی ہوئی۔"

"لیکن تم کنواری کنیا تو ہو نا۔" حمنہ نے لقمہ دیا تو رانیہ نے ہاتھ میں پکڑا سلائس واپس پلیٹ میں پٹخا اور بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی، اسی لمحے کچن سے دادی اماں واپس لوٹیں تو رانیہ کو غائب پا کر باقی لوگوں کو گھورا۔

"کہاں ہے وہ چھمک چھلو۔"

"اپنے کمرے میں چلی گئی۔" جواب دیا گیا۔

"یقیناً کسی نے رشتے کی بات چھیڑ دی ہو گی، پتا نہیں کب عقل آئے گی اس احمق لڑکی کو، ایسی لڑکیوں کو تب سمجھ آتی ہے جب گھر کے بزرگ آنکھیں موند کر منوں مٹی تلے جا سوئیں اور ناز نخرے اٹھانے والا کوئی نہ رہے۔"

"پلیز دادی جان ایسی ڈراؤنی باتیں تو مت کریں صبح سویرے نہار منہ۔" حمنہ نے کہا تو

وہ بولیں۔

"پھر اس سے کہو کہ جو رشتہ کل تسکین بی بی لے کر آئی تھی اس کے لئے ہاں کر دے، بلکہ وہ تو اس کی تصویر بھی دے گئی تھی اور تیری پھپھو سے کوئی راز و نیاز بھی کر رہی تھی، بول رہی تھی لڑکا ڈاکٹر ہے۔"

"تصویر...... کہاں ہے تصویر؟" حمنہ نے بے تابی سے ان کی بات کاٹی تو دادی جان نے چند لمحے سر کھجانے کے بعد انکشاف کیا کہ تصویر تو شاید ان کے تکیے تلے پڑی ہے، سراغ ملتے ہی حمنہ اڑتی ہوئی دادی کے کمرے میں گم ہو گئی، واپس لوٹی تو ہاتھ میں تصویر اور چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔

"دادی جان یہ تو وہی لڑکا ڈاکٹر ہے جس سے ہسپتال میں ہماری مڈبھیڑ ہو گئی تھی۔"

"ارے کیا وہی جس نے رانیہ کے دل کا آپریشن کر ڈالا تھا؟"

"جی بالکل وہی۔"

"یہ تو عجیب اتفاق ہو گیا، نہ بھئی نہ...... ہم نہ کریں گے اس قصائی سے اپنی بچی کی شادی۔"

"کیا ہو گیا ہے اماں، اچھا بھلا لڑکا ہے، رنگ گورا قد لمبا، قابل سرجن ہے، امریکہ سے پڑھ کر آیا ہے اور آپ کے مزاج ہی نہیں ملتے۔" نیلم پھپھو نے فٹ سے اس رشتے کی حمایت میں ووٹ دے دیا تو دادی جان نے انہیں آنکھیں دکھائیں۔

"اے لو اور سنو، تم تو تعریفیں کرو گی ہی، اس نے تمہیں ہم سب میں معقول اور سمجھی ہوئی جو قرار دیا تھا۔" دادی جان بھی کب ہار ماننے والی تھیں لہٰذا فوراً پینترا بدل کر وار کر دیا۔

"تو اس میں کیا غلط ہے، اس روز میں عقل سے کام نہ لیتی تو بات کتنی بڑھ جاتی آپ اچھی طرح جانتی ہیں، فی الحال آپ تمام شکوے شکایتیں رہنے دیجئے اور صرف رانیہ کی مرضی معلوم کیجئے، تسکین بی بی بتا رہی تھیں کہ ڈاکٹر دانش نے خود اسے رانیہ کا رشتہ مانگنے بھیجا ہے، رانیہ تو اسی روز ڈاکٹر دانش کے دل میں اتر گئی تھی جب وہ اس کے ہاتھ کا آپریشن کر رہا تھا۔"

"تبھی میں کہوں وہ ہر مرتبہ خود رانیہ کے ہاتھ کی بینڈیج کیوں کرتا تھا۔" حمنہ نے بھی اس سازش کا سرا ڈھونڈ لیا تھا۔

"یعنی لڑکا اتنا بھولا نہیں جتنا کہ دکھائی دے رہا تھا۔" دادی جان نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا۔

"اگر آپ کہیں تو میں خود رانیہ سے بات کر لوں؟" پھپھو نے تجویز پیش کی۔

"کر لو، اب میری کون سنے گا اس گھر میں، اے بی بی کہیں لڑکی لڑکے نے خود ہی تو گٹ مٹ نہیں کر لی اور مجھے پاگل بنا رہے ہیں۔"

"کیسی بے پر کی اڑا رہی ہیں آپ اماں، ہماری رانیہ کیا آپ کو ایسی دکھتی ہے، ویسے بھی آپ کو پاگل بنانا اتنا آسان کب سے ہو گیا کہ کل کے بچے دغا دے جائیں۔"

"بات تو ٹھیک کہی ہے۔" دادی نے اثبات میں سر ہلایا اور بولیں۔

"اچھا سوچتے ہیں اس قصائی کے بارے میں بھی، پہلے اپنی راجکماری کی مرضی تو معلوم کر لو۔"

"ٹھیک ہے میں آج ہی اس سے بات کرتی ہوں۔" فاخرہ بیگم نے جواب دیا اور خاموشی سے چائے پینے لگیں۔

حمنہ جو کہ قریب بیٹھی تمام گفتگو سن رہی تھیں، وہ چھلانگیں لگا کر رانیہ کے کمرے میں پہنچ گئی جہاں وہ منہ تکیے میں چھپائے جانے کیا کچھ

بڑبڑاتے چلی جا رہی تھی، حمنہ فوراً اس کے قریب پہنچ گئی اور کان میں سرگوشی کی۔

"کچھ سنا تم نے؟"

"کیا ہوا؟" وہ چونکی۔

"سنا ہے وہ قصائی گھر تک پہنچ گیا ہے۔"

"کون قصائی؟"

"جس نے تمہارے ہاتھ پر نشتر اور دل پہ تیر چلا دیئے تھے، اب ذرا بچ کر رہنا وہ تمہارے گلے پڑنے والا ہے۔"

"کیوں بلاوجہ بولے چلی جا رہی ہو۔" رانیہ جھنجھلا کر بولی۔

"سچ کہہ رہی ہوں رانیہ ڈیئر، اس نے رشتہ بھیجا ہے تسکین بی بی کے ذریعے، لگتا ہے اب وہ ٹلنے والا نہیں، بہت برا وقت آنے والا ہے اس پہ تم سے شادی کر کے۔"

"اگر تم نے مزید ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو میں تمہاری زبان گدی سے کھینچ لوں گی۔" رانیہ نے سر کے نیچے سے تکیہ نکال کر اسے کھینچ مارا، مگر حمنہ نے کسی تربیت یافتہ ایجنٹ کی طرح پہلو بدل کر اس کا فائر خطِ مستقیم کی نذر کر دیا جو دروازے سے اندر داخل ہونے والی پھپھو نیلم اور فاخرہ بیگم سے جا ٹکرایا۔

"یہ کمرہ میدان جنگ کا منظر کیوں پیش کر رہا ہے؟" فاخرہ بیگم نے حمنہ کو ڈانٹا۔

"اس لئے کہ رانیہ بی بی قربانی سے قبل کھونٹے سے بندھی گائے کی طرح آخری احتجاج فرما رہی ہیں۔" حمنہ کی وضاحت مکمل نہیں ہو پائی تھی کہ رانیہ آتش فشاں کی مانند پھٹ پڑی۔

"پھپھو میں نے کسی صورت اس ڈاکٹر سے شادی نہیں کرنی۔"

"یعنی خبر تم تک پہنچ چکی ہے۔" انہوں نے حمنہ کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"ویسے ایک بات بتا دوں کہ اگر وہ ڈاکٹر خود بھی تمہیں اس لہجے میں بات کرتے دیکھ اور سن لے تو انکار کر کے تو دو گیارہ ہو جائے۔"

"پلیز پھپھو!" رانیہ کچھ نرم پڑ گئی۔

"ضد مت کرو رانیہ، ایک نہ ایک روز ہر بچی کو بابل کے گھر سے رخصت ہونا ہوتا ہے، تم بھی اپنے دل و دماغ میں موجود تمام خدشات کو گلا گھونٹ کر اس رشتے کے لئے ہاں کر دو۔" فاخرہ بیگم نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر دست شفقت رکھا تو وہ دیوانہ وار ان سے لپٹ گئی۔

"میں آپ کی مجبوری سمجھتی ہوں امی، لیکن دل بہت ڈرتا ہے، میں بہت خوفزدہ ہوں مردوں کے اس معاشرے سے جہاں عورت کی کوئی قدر و قیمت نہیں، اپنی مثال دیکھ لیں ابو نے ساری زندگی آپ کو خون کے آنسو رلایا اور آپ ان کی توجہ کے لئے ترستی رہیں، پھپھو نے بھی کسی کو نہیں بتایا کہ اس رات ان کے شوہر انہیں طلاق دے کر گھر سے نکلے تھے، وہ تو خدا کی قدرت کہ انہیں ہارٹ اٹیک ہو گیا اور یہ راز راز ہی رہا، باقی رہ گئی بظاہر ہر پل مسکرانے والی ثمرہ تو سلیم بھائی کی اداؤں نے اسے روح کی گہرائیوں تک گھائل کر دیا ہے، ایسے میں، میں کس طرح شادی کے نام پر سولی چڑھ جاؤں اور یہ سوچ کر خوش ہوتی رہوں کہ سب ٹھیک ہو جائے گا اور میں اپنے شوہر کے ساتھ بھی خوشی زندگی گزاروں گی۔" اندر ہی اندر کڑھنے والی رانیہ نے دل کی بھڑاس نکالنا شروع کی تو نیلم اور فاخرہ بیگم خاموش ہو گئیں۔

یہ ایک تلخ حقیقت تھی کہ اس گھر کی عورتوں کو شادیاں راس نہیں آتی تھیں، شاید قدرت نے بھی خوشیوں کے نام پر ان کے لئے کڑی آزمائشیں لکھ دی تھیں قسمت میں۔

"مگر یہ سب کچھ سچ ہونے کے باوجود میں تمہاری اس بات سے اتفاق کرنے کے لئے تیار نہیں کہ تمہیں کسی خوف کو دل میں بسا کر شادی سے انکار کر دینا چاہیے، میں چاہتی ہوں کوئی بھی فیصلہ سنانے سے قبل تم ایک بار ڈاکٹر دانش سے ضرور مل لو، پھر جو تم کہو گی، ہمیں منظور ہوگا۔"

پھپھو نیلم نے آگے بڑھ کے اس کے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیریں تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اثبات میں سر ہلانے پر مجبور ہو گئی۔

☆☆☆

ہسپتال کے کیفے ٹیریا میں بیٹھی رانیہ نے ڈاکٹر فیضان کو دور سے اپنی جانب آتے دیکھا تو احتراماً اٹھ کھڑی ہوئی، قریب پہنچ کر ڈاکٹر فیضان نے سلام کرتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"امی اور پھپھو کہہ رہی تھیں کہ آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔"

وہ کافی کنفیوژ دکھائی دے رہی تھی، چنانچہ ڈاکٹر فیضان نے اسے مزید پریشان کرنے کے بجائے اصل موضوع کی طرف آنا مناسب سمجھا۔

"پہلے تو یقیناً آپ حیران ہوں گی اور اندر ہی اندر کڑھ رہی ہوں گی کہ میں نے آپ کو ہسپتال کے کیفے ٹیریا میں کیوں بلایا ہے، حالانکہ اس قسم کی باتیں تو پرسکون اور خوشگوار ماحول میں کی جاتی ہیں۔"

"مجھے اس سلسلے میں نہ کوئی حیرت ہے اور نہ میں کڑھ رہی ہوں، وجہ یہ کہ میں بہت عجیب فطرت لوگوں میں پل کر جوان ہوئی ہوں جو ہر حماقت، عقل مندی سمجھ کر کرتے ہیں اور پھر اپنے موقف کو درست ثابت کرنے کے لئے دلائل بھی ڈھونڈ لیتے ہیں، یقیناً آپ بھی ان لوگوں میں سے ایک ہیں، لہٰذا آپ بھی اپنے موقف کو درست ثابت کرنے کے لئے مجھے دلائل سے بھی نواز دیں۔"

رانیہ کا جواب سن کر ڈاکٹر فیضان نے فلک شگاف قہقہہ لگایا تو ارد گرد بیٹھے لوگ اپنے سارے کام چھوڑ کر ان دونوں کی جانب متوجہ ہو گئے۔

"میرا خیال ہے آپ نے اپنے عجیب ہونے کا ثبوت پیش کر دیا ہے، اس لئے اب مجھے یہاں بلانے کی وجہ بھی بتا دیں، ورنہ آپ کا اگلا غیر انسانی قہقہہ سننے سے قبل ہی میں اس منظر سے غائب ہو جاؤں گی۔" رانیہ نے جھنجھلا کر اسے ٹوکا تو وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"تمہیں یہاں بلانے کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ میرے ارد گرد لوگ کن حالات میں جیتے ہیں، پھپھو نیلم مجھے تمہاری ذہنی الجھنوں کے بارے میں کچھ بتا چکی ہیں۔" ڈاکٹر نے لمحہ بھر کے لئے بغور اس کے چہرے کی جانب دیکھا اور سلسلہ کلام دوبارہ جوڑا۔

"وہ کونے میں بیٹھی جوان عورت کو دیکھ رہی ہو، شادی کو دو سال ہوئے تھے کہ اچانک معلوم ہوا کہ اس کے شوہر کا کینسر ناقابل علاج ہو چکا ہے، اس کے دائیں جانب بیٹھے بوڑھے شخص کی بیٹی کے دل کا آپریشن محض اس وجہ سے نہیں ہو پا رہا کہ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں اور سامنے ویران آنکھوں سے خلا کو گھورنے والے میاں بیوی کا جوان بیٹا ایک حادثے میں اپاہج ہو گیا ہے، بتانے کا مقصد یہ ہے کہ یہاں موجود ہر فرد کی کہانی لرزہ خیز ہے، مگر ان میں سے کسی نے زندگی سے منہ نہیں موڑا، وہ اپنے پیاروں کے ساتھ مل کر آج بھی موت سے زندگی کی جنگ لڑ رہے ہیں اور واضح شکست سامنے ہونے کے باوجود انہیں یقین ہے کہ وہ جیت جائیں گے، یہی زندگی ہے رانیہ، اگر تم ان لوگوں سے اپنے

مسائل کا موازنہ کرو تو احساس ہوگا کہ تمہیں تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔"

"لیکن میں۔" رانیہ نے کچھ کہنا چاہا تو ڈاکٹر دانش نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"پھپھو نیلم نے مجھے تمہارے بارے سب کچھ بتا دیا ہے مگر میں واقعی تم سے محبت کرنے لگا ہوں، انہوں نے اس بات کا ذکر بھی کیا ہے کہ تمہارے خاندان میں ہونے والی اکثر شادیوں کا نتیجہ اچھا نہیں رہا، تم اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی ہو اور یہ بات اچھی طرح جانتی ہو کہ ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، اس لئے تم مجھ پر بھروسہ کر سکتی ہو۔"

ڈاکٹر دانش نے اپنا موقف بیان کر کے جواب طلب نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا، وہ گہری سوچ میں غرق اس کی بیان کردہ سچائیوں کو من کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کر رہی تھی، کچھ دیر بعد اس نے اپنی جھکی ہوئی پلکیں اٹھائیں تو آنکھوں میں یقین کی چمک اور ہونٹوں پر دھیمی سی مسکان تھی۔

"تھینکس کہ آپ نے برسوں سے چلنے والی الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کی، مگر ایک مسئلہ ابھی بھی باقی ہے جس سے میں بہت خوفزدہ ہوں۔" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ شریری ہو گئی تھی۔

"ہاں ہاں بولو، جو دل میں ہے کہہ دو۔" ڈاکٹر دانش اس کی نیم رضامندی دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔

"گھر میں سب لوگ کہتے ہیں کہ آپ پیشے کے لحاظ سے قصائی ہیں، اور قصائی لوگ بہت بے رحم ہوتے ہیں۔"

"قصائی مطلب؟" وہ چونکا۔

"سرجن۔" وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

"حمنہ کہہ رہی تھی کہ رانیہ بی بی بچ کر رہنا کہیں ایسا نہ ہو کہ شادی کے بعد وہ قصائی تمہیں منہ دکھائی میں کچھ دینے کے بجائے زبان ہی گدی سے کھینچ لے۔" رانیہ نے ڈرتے ڈرتے ڈاکٹر دانش کی جانب دیکھا تو وہ انہماک سے اس کی بات سن رہا تھا اور چہرے پر چٹانوں کی سی سنجیدگی تھی۔

"مر گئی، لگتا ہے یہ آج میرا پوسٹ مارٹم کر کے ہی گھر بھیجے گا۔" رانیہ نے بڑبڑاتے ہوئے اخبار اٹھا کر چہرے کے سامنے کر لیا اور جل تو جلال تو پڑھنے لگی، مگر اسی لمحے ڈاکٹر دانش کے دوسرے فلک شگاف قہقہے نے سابقہ تمام ریکارڈ توڑ دیئے تھے۔

اس مرتبہ رانیہ کو ڈاکٹر دانش کے ہنسنے کا انداز برا نہیں لگا تھا، وہ جان گئی تھی کہ ڈاکٹر دانش بناوٹ پسند نہیں، دھوکا دینا اس کی فطرت کا حصہ نہیں، وہ دلوں کو جوڑنے کا فن جانتا ہے، دلوں کو توڑنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا، شاید واقعی سب لوگ ایک سے نہیں ہوتے، اس خیال سے رانیہ کے چہرے پر گلابی پن عود آیا تھا۔

"میرا خیال ہے بہت ہو گیا تعارف، اب مجھے چلنا چاہیے۔" رانیہ نے واپسی کا ارادہ کیا تو ڈاکٹر دانش نے اس کی نازک سی کلائی پکڑ کر سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

"سچ کہوں تم نے آج مجھے اپنی محبت کے حصار میں جکڑ کر زندگی کے سب سے خوبصورت روپ سے آشنا کروایا ہے۔" رانیہ نے ڈاکٹر دانش کا اعتراف محبت سن کر دھڑکتے دل کے ساتھ اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہاں صرف اور صرف محبت تھی۔

☆☆☆

درشمن بلال

ذوناش کے احساسات کا قتل عام تو گزشتہ دو سال سے ہو رہا تھا، مگر وہ اتنی ہرٹ کبھی نہیں ہوئی تھی، جتنی وہ آج ہوئی تھی، زندگی میں پہلی بار دنیا کی ہر نعمت اور ہر آسائش ہونے کے باوجود اس نے کسی بھکاری کی طرح کومیل آفریدی سے محبت کی بھیک مانگی تھی اور اس نے ذوناش کو بری طرح سے دھتکار دیا تھا، اس کا کشکول اٹھا کر پھینک ڈالا تھا۔

اس نے زندگی میں کبھی خود کو اتنا حقیر نہیں جانا تھا، جتنا کومیل کے دھتکارنے پہ آج اسے محسوس ہوا تھا، پہلے وہ اس کی ظاہری شخصیت سے متاثر ہوئی تھی، پھر وہ ان کی باطنی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہو گئی تھی، کومیل ہی حقیقی معنوں میں اس کا آئیڈیل تھا اسے کومیل اچھا لگتا تھا، اس میں تھا

ناولٹ

ہی کچھ ایسا مختلف، کہ وہ اس کی جانب کھنچتی چلی گئی تھی، نہ جانے وہ اس کے ساتھ رہتے رہتے کب اس کے لئے اتنا اہم ہو گیا تھا؟ اتنا خاص ہو گیا تھا؟ وہ رومانٹک موویز ضرور دیکھا کرتی تھی اور رومانٹک ناولز بھی پڑھا کرتی تھی مگر اس نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس کی زندگی میں بھی کوئی ایسا موڑ آئے گا، جب وہ خود کسی مرد سے محبت کا اظہار کرے گی اور جواباً وہ اتنے تلخ انداز میں اتنی سختی سے اس کی انسلٹ کرتے ہوئے اسے دھتکار دے گا، اسے اور اس کی محبت کو بے مول کر دے گا، اس سے اپنی بے عزتی برداشت نہیں ہو رہی تھی، وہ ایک مکمل حسن کا پیکر تھی، جس شخص کو زبردستی اس کی زندگی میں شامل کیا جا رہا تھا اسے بھی ذوناش میں دلچسپی نہ تھی اور جس شخص کی زندگی میں وہ خود بخود زبردستی شامل ہونا چاہتی تھی اس کو بھی گویا ذوناش میں کوئی انٹرسٹ نہ تھا۔

وہ اس زندگی سے چھٹکارا حاصل کر لینا چاہتی تھی، جس زندگی میں اسے کوئی نہ چاہنے والا

تیسری قسط

ہی نہ تھا، وہ گھٹ گھٹ کر مرنے کی بجائے ایک ہی بار مر جانے کے بارے میں سوچ رہی تھی اور شاید فیصلہ بھی کر چکی تھی اسی لئے وہ تھا۔

وہ دیوانہ وار سمندر اندر جا رہی تھی، اسے اپنا آپ بے مول لگ رہا تھا، اسے لگ رہا تھا جیسے وہ اس دنیا کی سب سے بدصورت اور حقیر لڑکی ہو، وہ ہر سے محبت کی بھیک مانگتی تھی اور ہر کوئی اسے دھتکار دیتا تھا۔

جب انسان خود مر رہا ہو تو اسے اپنے مرنے والے بھی یاد آتے ہیں اسے آج اپنی ماں مہرین قریشی بھی شدت سے یاد آئی تھیں اور اسے آج ذوہین قریشی بھی بے پناہ یاد آ رہا تھا۔

رات اپنا تاریک آنچل اوڑھ چکی تھی، وہ ساحل سمندر کے جس حصے میں تھی وہاں رش نہ ہونے کے برابر تھا، اس لئے کسی کی بھی نظر اس پہ نہ پڑی تھی، وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ تھی، اگر ہوتی تو اتنا بڑا قدم نہ اٹھاتی، اسے اپنے سامنے سمندر کی ایک بہت بڑی لہر آتی دکھائی دی، ذوناش نے آنکھیں بند کر لی تھیں، چند لمحوں میں اس کی کہانی سمندر کے اندر چھپی ان گنت کہانیوں میں شامل ہونے والی تھی۔

اس سے پہلے کہ سمندر کی وہ لہر اسے اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی کومیل نے نہایت پھرتی سے عقب سے آ کر اسے خود سے بھینچ لیا تھا۔

سمندر کی وہ بڑی اور تیز لہر نے ان دونوں کو لڑکھڑا کر گرنے پہ مجبور کر دیا تھا، کومیل نے اسے مضبوطی سے بھینچ رکھا تھا کچھ لمحے وہ غائب دماغی سے اس صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی، پانی کی لہر واپس جا چکی تھی، کومیل نے خود کھڑے ہو کر اسے شانوں سے تھام کر اٹھایا تھا دونوں پانی سے بھیگ چکے تھے، وہ غصے میں اس پہ برسنے لگا تھا۔

''یہ کیا حرکت تھی آپ کی؟ کیا کرنے جا رہی تھیں آپ؟ بہت شوق ہے آپ کو مرنے کا؟ اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو؟ اگر میں بروقت آپ تک نہ پہنچتا تو...... تو نا جانے کیا سے کیا ہو جاتا، آپ کو احساس ہے اس بات کا؟'' اب وہ اسے شانوں سے پکڑ کر نہایت غصے میں اسے جھنجھوڑ رہا تھا اور تقریباً اس پہ چیخ رہا تھا۔

''چھوڑو مجھے، کیوں بچایا ہے تم نے مجھے؟'' اس نے کومیل کے ہاتھوں کو جھٹک کر چلاتے ہوئے پوچھا۔

''تم کون ہوتے ہو مجھے میرے کسی بھی قول و فعل کے بارے میں روکنے والے؟''

''آپ کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے میری ذمہ داری ہیں آپ، اپنی جان سے بڑھ کر آپ کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے میں نے کمال صاحب سے۔''

''تو آج میں تمہیں تمہاری اس ذمہ داری سے آزاد کرتی ہوں، مت نبھاؤ تم اپنے فرائض، چلے جاؤ واپس اور چھوڑ دو مجھے میرے حال پہ، دفعہ ہو جاؤ۔'' ذوناش نے چیختے ہوئے اسے دھکا دیا اور ایک بار پھر وہاں سے سمندر کی سمت بھاگنا چاہا۔

مگر اگلے ہی لمحے کومیل نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تھا اور وہ اس کے سینے سے جا لگی تھی، وہ غصے اور بے بسی سے ہانپ رہا تھا۔

''میں نہیں چھوڑ سکتا آپ کو آپ کے حال پہ، خدارا میری حالت پہ رحم کریں، اپنے ساتھ ساتھ آپ مجھ پہ بھی ظلم کر رہی ہیں کیوں؟ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟ پلیز ایسا مت کریں میم! اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو، تو میں کبھی خود کو معاف نہ کر پایا۔'' کومیل کے لہجے میں نمی تھی، وہ اسے پہلی بار اپنی مرضی اور اپنی رضا سے خود سے بھینچے ہوئے

تھا، اس کی آواز بے بسی سے دکھ اور پریشانی سے کانپ رہی تھی، سمندر کی چھوٹی چھوٹی لہریں اب ان دونوں کے گھٹنوں کو چھو کر واپس جا رہی تھیں، وہ گویا ہیروں کی ایک کان تھی جس سے آسانی سے فلرٹ کر کے کومیل اپنے جذبات کی تسکین کے ساتھ ساتھ مالا مال بھی ہو سکتا تھا، مگر اس کا ضمیر زندہ تھا۔

"میں اس دنیا کی سب سے معمولی لڑکی ہوں اور غیر اہم بھی، جس کے نصیب میں سب کچھ ہے سوائے محبت کے، شاید میں محبت کے قابل ہی نہیں ہوں، انسان جس چیز کی خواہش کے پیچھے بھاگتا ہے وہ چیز اس سے اتنی ہی دور کر دی جاتی ہے، چھوڑ دو مجھے کومیل، کیوں بچایا ہے تم نے مجھے۔" وہ بری طرح سے روتی ہوئی اس کی گرفت میں مچل رہی تھی اور اس سے الگ ہونے کی کوشش کر رہی تھی، اسے دکھ کے ساتھ ساتھ کومیل پہ بے انتہا غصہ بھی آ رہا تھا، کومیل نے اس کی کوشش کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک ٹرانس کی کیفیت میں دھیرے سے اس کو خود سے مزید بھینچ لیا تھا۔

"میم آپ اس دنیا کی سب سے خاص لڑکی ہیں، کون کافر ہے جو آپ کو خود سے دور کرنا چاہتا ہے، آپ محبت کی مٹی سے بنی اس دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی ہیں اور آپ کو چاہے جانے کے لئے ہی بنایا گیا ہے، مگر پلیز میم! آپ مجھ سے محبت مت مانگیے، میرے اور آپ کے درمیان Status کی لمبی اور اونچی اونچی دیواریں کھڑی ہیں، میری اور آپ کی حیثیت میں ہر لحاظ سے زمین اور آسمان جیسا فرق ہے۔" وہ دھیرے دھیرے اسی ٹرانس کی کیفیت میں پیار سے اسے سمجھا رہا تھا۔

"تم یہ دیواریں بہت آسانی سے توڑ سکتے ہو کومیل، میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں میں تمہارے ساتھ ہوں پھر ڈر کیسا کومیل؟" وہ بھیگے چہرے کے ساتھ بے تابی سے پوچھ رہی تھی۔

"میں یہ دیواریں نہیں توڑ سکتا میم، میں امانت میں خیانت نہیں کر سکتا۔" کومیل کا انداز جنوں بے بسی لئے ہوئے تھا۔

"کون کہہ رہا ہے تمہیں امانت میں خیانت کرنے کو؟ ہم جائز اور شرعی طریقے سے نکاح کریں گے میں...... میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں کومیل۔" ذوناش اب بھی اپنی بچکانہ ضد پہ قائم تھی، کومیل نے بے چینی کے عالم میں اسے خود سے الگ کر دیا تھا۔

"میم پلیز...... پلیز...... مجھ سے ان سب کاموں کی توقع مت کریں میں یہ نہیں کر سکتا، آپ خوابوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی نظروں سے دیکھیں، آپ کی منگنی ہونے والی ہے آپ کے کزن سے، میں آپ کا ذاتی ڈرائیور اور باڈی گارڈ ہوں، آپ کا محافظ ہوں، اگر آپ کو مجھ سے سچ مچ محبت ہے تو مجھ سے وعدہ کریں، آپ اپنے اور میرے بیچ آئندہ اس محبت کو کبھی نہیں لائیں گی، آئندہ آپ کبھی اس طرح اموشنل ہو کر خود کو نقصان نہیں پہنچائیں گی، ورنہ...... ورنہ میں یہ جاب چھوڑ دوں گا۔" آخری جملہ کومیل نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو وہ جنوں بے بسی سے اسے چند لمحے دیکھتی رہی اور پھر آہستگی سے بولی۔

"اتنے بڑے عہد و پیمان مت لو مجھ سے کومیل، یہ محبت بڑی ظالم چیز ہے دیمک بن کر کھا جائے گی مجھے۔" اس کی آواز میں نمی تھی اور آنکھوں میں آنسو۔

"میم آپ کو مجھ میں وقتی کشش محسوس ہو رہی ہے، آپ اس وقت جذباتی ہو رہی ہیں اسی لئے، اسی وقتی کشش کو محبت کا نام دے رہی ہیں

آپ۔" کومیل اسے کسی بچے کی طرح مسلسل بہلا رہا تھا۔

"کومیل میری محبت کو وقتی کشش کا نام مت دو، تم نے کسی سے محبت کی ہوتی تو تمہیں معلوم ہوتا، محبت کس طرح انسان کی انا اور Self respect کو نگل کر اسے ایک بھکاری بنا دیتی ہے۔" وہ ایک بار پھر رو پڑی تھی، نا جانے کیوں، کب اور کیسے اس کے سامنے کھڑا شخص اس کی زندگی بن گیا تھا اس کی ضرورت بن گیا تھا اس کی عادت بن گیا تھا، وہ ایک بار پھر بے بسی سے رو پڑی تھی۔

"مان لیا کہ آپ کو مجھ سے محبت ہو گئی ہے، پلیز آپ کو اس محبت کا واسطہ اگر آپ مجھے اپنے سامنے اپنے آس پاس دیکھنا چاہتی ہیں تو آپ کو اس محبت کو اپنے دل سے نکالنا ہوگا۔" وہ اب بھی اپنی بات پہ قائم تھا، وہ ہنوز اسی بھیگی آنکھوں اور بھیگے چہرے کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم بہت ظالم ہو کومیل، میری محبت کی یہ بے بسی ایک دن تم کو بھی ایسے ہی بے بس کرے گی، انتقام لے گی یہ محبت تم سے دیکھ لینا تم۔" وہ نم لہجے میں کہتی ہوئی مڑ گئی تھی۔

"میم پلیز...... چیئر اپ اینڈ لیو دس ٹاپک...... ہم...... ہم ایک اچھے دوست بن کر بھی تو ہمیشہ ساتھ رہ سکتے ہیں ناں؟ محبت کو اپنی زندگی سے نکال کر۔" وہ اسے کسی بچے کی طرح بہلاتے ہوئے بول رہا تھا، جیسے کسی روتے ہوئے بچے کو چاکلیٹ دے کر بہلایا جاتا ہے۔

"کیا ہر وقت میرے قریب رہ کر مجھ سے دور رہنے کی سزا دیتے رہو گے مجھے؟ کومیل یہ سزا بہت تکلیف دے گی مجھے۔" ذوناش کے لہجے میں اب بھی نمی تھی البتہ اس کے آنسو اب تھم گئے تھے۔

"میم میں اب بھی اپنی اس بات پہ قائم ہوں، آپ مجھے اپنے سامنے اور اپنے قریب دیکھنا چاہتی ہیں کہ نہیں؟ میں ایک دوست بن کر ہمیشہ آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں، مگر محبوب بن کر نہیں، میں دوستی کا ہاتھ آپ کی جانب بڑھا رہا ہوں، اسے تھامنا چاہتی ہیں تو تھام لیجئے ورنہ میں صبح اس نوکری سے ریزائن دے دوں گا۔"

ذوناش اس کا اپنی جانب بڑھا ہوا ہاتھ دیکھا اور تلخی انداز میں مسکرائی۔

"مجھے بچا کر تم میرے لئے ایک اور بھیانک موت تجویز کر رہے ہو، اگر تم مجھے اسی طرح گھٹ گھٹ کر مرتا ہوا دیکھنا چاہتے ہو تو ایسے ہی سہی۔" ذوناش نے اس کے پھیلے ہاتھ پہ اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھ دیا تھا، کیونکہ سچ یہی تھا، وہ اس دشمن جاں کو ہر وقت ہر لمحہ اپنی نظروں کے سامنے دیکھنا چاہتی تھی اسے اپنے آس پاس دیکھنا چاہتی تھی، اس نے اپنی محبت کے۔

کومیل نے اس کا ہاتھ تھام کر دھیرے سے دبایا اور چھوڑ دیا تھا اس کے چہرے پہ اب ایک اطمینان پھیل گیا تھا۔

"ویری گڈ، یہ ہوئی ناں بات، آج سے ہم صرف دوست بن کر ساتھ رہیں گے۔" کومیل مطمئن انداز میں اس کے ساتھ چلنے لگا، مگر وہ اب بھی خاموش تھی، وہ پہلا مرد تھا جس کے لئے وہ یوں اموشنل ہوئی تھی، اس کے چہرے پہ اب بھی اضطراب اور کرب کا تضاد دکھائی دے رہا تھا۔

"کم آن میم، پلیز چیئر اپ۔" کومیل نے گردن موڑ کر مسکراتے ہوئے اسے کہا، ان چند دنوں میں ہی کومیل کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کس قدر جذباتی اموشنل اور تنک مزاج قسم کی لڑکی تھی، وہ اس پہ ڈانٹ ڈپٹ کر کے غصہ دیکھا کر نتیجہ دیکھ چکا تھا، اب اسے اس اسٹوپڈ لڑکی کو دوسرے

طریقے سے ڈیل کرنا تھا، نہایت سمجھ داری سے، نرمی سے، اور شاید پیار سے۔

☆☆☆

اور پھر ایک ڈیڑھ ہفتہ دوبئی میں گزارنے کا پتہ ہی نہیں چلا تھا، وہ دوبئی سے واپس آئے تو کمال قریشی ایک بزنس میٹنگ کے سلسلے میں کراچی گئے ہوئے تھے۔

ذوناش اپنی نیند پوری کر لینے کے بعد ٹیرس پہ آ گئی تھی، اس کا دل اب بھی بوجھل تھا اداس تھا، تازہ ہوا میں سانس لینے کے لئے، شاید وہ اپنے اندر کی گھٹن دور کرنا چاہتی تھی، اس نے اپنے لئے کافی وہیں منگوائی تھی، اپنے اندر کی فرسٹریشن دور کرنے کے لئے وہ اکثر جگجیت کی غزلیں سنا کرتی تھی سو اب بھی اس نے کانوں میں ہینڈ فری لگا رکھی تھی۔

ہوش والوں کو خبر کیا؟ بے خودی کیا چیز ہے
عشق کیجئے پھر سمجھئے
زندگی کیا چیز ہے؟
ان سے نظریں کیا ملیں
روشن فضائیں ہو گئیں
آج جانا پیار کی جادوگری کیا چیز ہے؟
عشق کیجئے، پھر سمجھئے
زندگی کیا چیز ہے؟

اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ جگجیت کی آواز کے ساتھ آواز ملائے خود بھی گا رہی تھی۔

ہم لبوں سے کہہ نہ پائے ان سے حال دل کبھی
اور وہ سمجھے نہیں یہ خاموشی کیا چیز ہے؟

وہ مکمل اس غزل میں گم تھی، لان میں کھڑا کومیل ہاتھ کے اشارے سے اسے وہاں سے ہٹ جانے کو کہہ رہا تھا مگر وہ غزل میں اس قدر گم تھی کہ اسے دیکھ ہی نہیں پائی تھی، کومیل نے اپنا سیل فون نکالا اور اسے کال کی، ذوناش کے ہاتھ میں پکڑا سیل فون بج اٹھا، ذوناش نے اس کی کال کٹ کر دی اور پھر سے غزل سننے لگی، کومیل نے جھنجھلا کر اسے پھر سے کال کی، اب کے اس نے کوفت سے کال ریسیو کی۔

''کیا مصیبت ہے تم بار بار کال کیوں کر رہے ہو مجھے؟''

''میم آپ ٹیرس سے اتر آئیں، آپ کا وہاں کھڑے رہنا خطرے سے خالی نہیں ہو سکتا۔'' اس نے پروفیشنل انداز میں اسے اطلاع دی تھی۔

''تمہیں میری فکر میں اتنا ٹینس ہونے کی ضرورت نہیں، کچھ کام مجھے میری مرضی سے بھی کرنے دیا کرو، ایک فوج ہے لوگوں کی جنہیں مجھ پہ مسلط کر دیا گیا ہے۔'' اس نے جھنجھلا کر کھٹ سے کال بند کر دی تھی۔

کومیل نے حیرت سے اپنے سیل فون کو پھر جھولے میں بیٹھی ذوناش کو دیکھا اور عجلت میں گھر کے اندر کی جانب بڑھا اور پھر اگلے دو منٹ میں وہ لفٹ کے ذریعے اس کے پاس اس کے سر پہ کھڑا تھا۔

''آپ آسانی سے اور سیدھے انداز سے بات کیوں نہیں مان لیتی ہیں؟'' کومیل نے اس کے کانوں سے ہینڈ فری نکالتے ہوئے غصے سے کہا۔

''تمہاری سب باتیں تو مان لی ہیں میں نے؟ اب کون سی بات باقی ہے تمہاری۔'' آرام اور تسلی سے پوچھا گیا۔

''آپ کا یہاں بیٹھنا، چلنا پھرنا قطعی مناسب نہیں ہے۔'' وہ اس کے اطراف میں پروفیشنل انداز میں اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

''کیا مناسب ہے اور کیا مناسب نہیں ہے

اچھی طرح سے جانتی ہوں مجھے ابھی تھوڑی دیر یہیں بیٹھنا ہے، تم جاؤ یہاں سے میں Singing کی تھوڑی پریکٹس کر رہی ہوں۔" ذوناش نے ایک بار پھر کانوں میں ہینڈ فری ڈالی۔

"آپ کچھ بھی نہیں جانتی ہیں اور رہی بات Singing کی تو آپ اس کی پریکٹس میوزک روم میں بھی کر سکتی ہیں، یہاں بیٹھ کر آپ کوئی میوزک ایوارڈ نہیں جیتنے والیں۔" وہ جھنجلایا۔

"کومیل مجھے ہر وقت ہر بات پہ سمجھانا تمہارے فرائض میں شامل نہیں ہے۔" ذوناش نے اسے غصے سے دیکھا، وہ تنگ آ چکی تھی ہر وقت کی ایسی روک ٹوک سے ایسی پابندیوں اور آرڈرز سے۔

"ذوناش فار گاڈ سیک۔" عجلت میں اس کے منہ سے ذوناش کا نام نکل گیا تھا۔

"بس...... سوری میم۔" اگلے ہی لمحے وہ گڑبڑا گیا اور وہ کتنے ہی لمحے اسے دیکھے گئی تھی۔

"تمہارے لبوں سے اپنا نام سن کر بہت اچھا لگا۔"

"سوری آئیندہ میم! آپ بھی تو آسانی سے میری کوئی بات نہیں مانتی ہیں۔" اس نے جواز دیا۔

"تمہاری ساری باتیں تو مان لی ہیں، اب اور کیا چاہتے ہو تم؟" طنزیہ انداز میں اس نے کومیل سے پوچھا، تو وہ نظریں چرا گیا۔

"فی الحال میں یہی چاہتا ہوں کہ آپ نیچے آ جائیں، یہاں آپ محفوظ نہیں ہیں۔"

"اوکے میں صرف ایک شرط پہ نیچے جاؤں گی۔"

"کیسی شرط؟" وہ حیران ہوا۔

"تم ابھی اور اسی وقت مجھے کہیں باہر لے کر جاؤ گے۔" اس نے حکم سنایا تو کومیل نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"اوکے میم...... لے جاؤں گا...... آپ نیچے تو آیئے۔" اس کی بات سن کر ذوناش کسی سعادت مند بچے کی طرح اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔

"اوکے میم، آپ ریڈی ہو کر لان میں آ جایئے گا، میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔" کومیل نے اس کی بات کا جواب دیا تھا اور پھر وہ دونوں لفٹ کے ذریعے نیچے آ گئے تھے، ذوناش اپنے روم کی جانب بڑھ گئی اور کومیل لان کی طرف، پھر مریم خاتون کو اطلاع دے کر ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد وہ چھوٹے چھوٹے ڈاٹس پرنٹ کی پٹیالہ شلوار پہ سی پلین شارٹ شرٹ میں ملبوس، گلے میں مفلر کے انداز میں دوپٹہ لپیٹے، خاصی پرکشش اور مہذب لگ رہی تھی۔

"کہاں جائیں گی میم؟" کومیل نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر عقب میں بیٹھی ذوناش سے پوچھا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔

"کسی ایسی جگہ جہاں لوگوں کا بہت ہجوم ہو، جہاں بہت رونق ہو جہاں اتنا شور ہو کہ میرے اندر کا شور اس شور میں کہیں دب جائے۔" اس کے لہجے سے جھلکتی اداسی نے جواباً اسے کچھ بولنے ہی نہیں دیا تھا، وہ کوئی فلاسفر نہیں تھی، مگر اس کی گہری باتیں کومیل کے دل کو ایک عجیب دکھ سے ہمکنار کر جاتی تھیں۔

"کومیل۔" اسے سوچتا سوچتا ٹریفک کے اژدھام سے گاڑی نکالتا ہوا اسے اندرون لاہور کے پرانے انار کلی بازار میں لے آیا تھا، وہاں سڑک پہ گاڑی روکتے ہی اس نے ذوناش سے کہا تھا۔

"میم یہاں سے آگے گاڑی نہیں جا سکے

گی، ہمیں پیدل ہی اندر جانا ہوگا۔"

"وائے ناٹ، یہ بتاؤ یہ کون سی جگہ ہے؟" ذوناش نے گاڑی سے نکلتے ہوئے اشتیاق سے لوگوں کی گہما گہمی دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میم یہ انار کلی بازار ہے۔" کومیل نے اپنی عقابی نگاہوں سے ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے اسے بتایا۔

"او آئی سی، وہ کنیز انار کلی جس کی محبت میں شہزادہ سلیم گرفتار ہو گیا تھا اور پھر اس جرم کی سزا میں انار کلی کو زندہ دیوار میں چنوا دیا گیا تھا؟" ذوناش کے لہجے میں اس جگہ کے لئے بہت اشتیاق تھا، وہ پہلی بار یہاں آئی تھی اور بہت اشتیاق سے گاڑی سے نیچے اتر آئی تھی۔

"یس میم! یہ بازار اسی کنیز انار کلی کے نام سے منسوب ہے۔" کومیل اس کے پاس کھڑا تھا۔

"امیزنگ، مجھے یقین نہیں آرہا کہ آج میں یہ Historical Please دیکھوں گی۔" اس کی خوشی دیدنی تھی، کومیل نے بے ساختہ اپنے ساتھ چلتی ہوئی ذوناش کو دیکھا جس کے چہرے پہ کسی معصوم بچے جیسی مسکراہٹ کھلی ہوئی تھی کہ وہ مین بازار کے اندر داخل ہو گئے تھے۔

"وہ سامنے پانی پوری والا ہے ناں؟" ذوناش نے سامنے ٹھیلے کی جانب اشارہ کیا۔

"یس میم۔" کومیل نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مجھے پانی پوری کھانی ہے۔" ایک دم اس نے پانی پوری کا ٹھیلہ دیکھ کر شور مچایا، اس کے انداز پہ کومیل بے ساختہ مسکرایا۔

"او کے کھلاتا ہوں۔" پھر وہ کومیل کے ساتھ اس ٹھیلے پہ موجود تھی اور ٹھیلے کے پاس کھڑی پانی پوری کھا رہی تھی، کومیل اس کے پاس منرل واٹر کی بوتل لئے کھڑا تھا، وہ پوری منہ میں ڈالتی، پھر کھٹے پانی کا پیالہ لبوں سے لگاتی اس کے بعد اسے مرچیں لگتیں تو وہ کومیل کے ہاتھ سے پانی کی بوتل پکڑ کر پانی کا گھونٹ بھرتی اور پھر بوتل کومیل کی جانب بڑھا دیتی۔

پانی پوری کھانے کے بعد اس نے ٹشو سے منہ صاف کرتے ہوئے کومیل سے کہا تھا۔

"میرے لئے یہ انتہائی امیزنگ بات ہے۔" اس نے خوشگوار انداز میں بتایا تو کومیل بھی دھیرے سے مسکرا دیا، اب وہ فٹ پاتھ پہ چلنے لگے تھے۔

"کومیل مجھے یہ پوری مارکیٹ دیکھنی ہے۔" اس نے ایک نیا حکم جاری کیا۔

"آپ تھک جائیں گی میم۔" کومیل کو اس کی فکر ہوئی۔

"ڈونٹ وری میں نہیں تھکوں گی۔" وہ فریش انداز میں بولی۔

"او کے اس طرف آئیں۔" کومیل نے اسے بائیں طرف مڑنے کا اشارہ کیا اور پھر وہ اس کے ساتھ بائیں طرف مڑ گئی۔

"تم بہت آسانی سے میری ہر بات مان لیتے ہو، تمہارے ساتھ میں بہت Comfortable رہتی ہوں۔" اس کے لہجے میں اطمینان تھا، کومیل مسکرا دیا۔

"جانتے ہو تمہارے اس ساتھ کی میں نے کتنی بڑی قربانی دی ہے؟" اس کے لہجے میں پھر سے اداسی اتر آئی تھی۔

"جانتا ہوں۔" کومیل نے اس کے ساتھ چلتے چلتے ایک طویل سانس لیا۔

"اگر آپ میری بات نہ مانتیں تو میں یہ جاب چھوڑ دیتا۔" کومیل نے اطلاع دی۔

"آپ یہ بھی اچھی طرح سے جانتی ہیں

ناں؟"

"جانتی ہوں اسی لئے تو اپنے دل پہ بھاری پتھر رکھ لیا ہے تم میری نظروں کے سامنے رہو گے، مجھے اپنے آس پاس دکھائی دو گے۔" ذوناش نے کہا جواباً وہ خاموش رہا۔

"آئیں آپ کو ربڑی والا دودھ پلاتا ہوں۔" کومیل نے اس کی توجہ ہٹانے کے لئے، سامنے ایک دوکان کی طرف اشارہ کیا جہاں اچھا خاصا رش دکھائی دے رہا تھا۔

"مجھے دودھ پسند نہیں ہے۔"

"آپ پی کر تو دیکھیں، آپ کو اچھا لگے گا یہ بہت اسپیشل ہوتا ہے۔" وہ اسے دوکان میں لے آیا۔

"میں اپنے دوستوں کے ساتھ اکثر یہاں ربڑی دودھ پینے آیا کرتا تھا۔" اس نے مسکراتے ہوئے ذوناش کو بتایا اور دو گلاس دودھ کا آرڈر دیا۔

"ہاں یہ واقعی بہت مزے کا ہے، مگر یہ بہت ہیوی ہے، میں یہ زیادہ نہیں پی سکوں گی۔" ذوناش نے آدھا گلاس پی کر اس کی طرف گلاس بڑھا دیا تھا، اتنے میں کومیل بھی اپنا گلاس خالی کر چکا تھا۔

وہاں سے نکل کر کومیل اسے عورتوں کی مارکیٹ میں لے آیا تھا، اندرون لاہور کی شام پوری طرح سے جاگنے لگتی تھی، ہر طرف گہما گہمی تھی، شور تھا، رونق تھی۔

"کومیل تم نے کبھی اپنی فیملی کے بارے میں نہیں بتایا؟" ذوناش نے اس کے ساتھ چلتے چلتے پوچھا، لوگ آتے جاتے اسے اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"لاہور شہر کے ساتھ ایک قصبہ ہے شیرا کوٹ ہم وہاں رہتے ہیں اپنے دادا کے آبائی گھر میں، میرے ابا فوج میں صوبیدار تھے اور آج کل ریٹائرمنٹ کے بعد سارا دن گھر میں لگائے پودوں اور سبزیوں کی دیکھ بھال میں دن گزارتے ہیں، انہوں نے گھر میں آسٹریلین طوطے بھی پال رکھے ہیں۔" کومیل نے اسے بتایا، اس کے انداز میں اپنے باپ کے لئے احترام تھا۔

"Very Interesting اور تمہاری ماما؟ وہ کیا کرتی ہیں؟"

"ماں ہاؤس وائف ہے، سارا دن گھر کا ابا اور ابرش کا خیال رکھتی ہیں، اس لئے سارا دن مصروف رہتی ہیں، اچار و چٹنیاں اور مربے ڈالنا ان کی ہابیز ہیں۔" اپنی ماں کے بارے میں بتاتے ہوئے کومیل کے لہجے سے خوشی اور تقدس جھلک رہا تھا۔

"ماں کے ہاتھ کا پراٹھا اور آلو کی بھجیا میری فیورٹ ہے، میں اکثر جب چھٹی پہ جاتا ہوں تو ماں میرا بہت خیال رکھتی ہے، میرے سر میں سرسوں کے تیل سے مساج کرتی ہیں، میری نظر اتارتی ہیں، میرا صدقہ دیتی ہیں اور جب میں واپس آنے لگتا ہوں تو ڈھیروں قرآنی آیات پڑھ کر مجھ پہ پھونکتی ہیں۔" اس کے لہجے سے اپنی ماں کے لئے بے پناہ پیار جھلک رہا تھا، جیسے وہ کسی عظیم ترین ہستی کا ذکر کر رہا ہو۔

"میری ایک چھوٹی بہن بھی ہے ابرش، بہت شرارتی ہے، اونٹ کی طرح لمبی ہو گئی ہے مگر اس کی طبیعت میں اب بھی بچپنا ہے، خواہ مخواہ تنگ کرتی ہے مجھے۔" وہ اسے ابرش کے بارے میں بتاتے ہوئے ہنسا۔

"تم کتنے خوش نصیب ہو ایک مکمل اور آئیڈیل فیملی کا حصہ ہو، کاش میں بھی کسی ایسے ہی گھر میں پیدا ہوئی ہوتی، میں بھی کبھی ایسی ہی

فیملی کا حصہ ہوتی، کوئی مجھے بھی پیار سے کھانا کھلاتا، کوئی میرے بھی ناز نخرے اٹھاتا، کوئی مجھ سے بھی شرارتیں کرتا۔'' ذوناش کے لہجے میں اداسی اتر آئی تھی۔

''انشاء اللہ مرسل صاحب سے شادی کے بعد آپ بھی ایک ایسی فیملی کا حصہ بن جائیں گی۔'' کومیل نے اسے بہلانے کی کوشش کی۔

''کومیل تم جھوٹ مت بولا کرو اور مجھے جھوٹے بہلاوے بھی مت دیا کرو، میں اچھی طرح سے جانتی ہوں مرسل کے ساتھ میری زندگی مزید برباد ہونے والی ہے۔'' اس کی بات پر اب وہ خاموش ہو گیا تھا، اب وہ بازار کے اندر چل رہے تھے، ذوناش نے اپنے دائیں بائیں رش اور گہما گہمی دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''واؤ یہ کتنا Fascinating بازار ہے، یہاں چیزیں کتنی سستی ہیں؟'' وہ خوشی سے مسکرائی۔

''ہاں آپ کے لئے یہ چیزیں بہت سستی ہیں مگر عام طبقے کے لئے یہ چیزیں بھی بہت مہنگی ہیں، میم آپ نہیں جانتیں یہاں غریب کی پہنچ سے یہ عام اور معمولی چیزیں بھی دور کر دی گئی ہیں، آج کا متوسط طبقہ اپنی ضرورتوں کی جنگ لڑتے لڑتے نڈھال ہو چکا ہے، خواہشات پوری کرنا تو دور کی بات ہے میم آج کل ضرورتیں پوری کرنا بھی لوگوں کے لئے انتہائی مشکل ہو چکا ہے۔'' کومیل کے لہجے میں افسوس تھا۔

''مجھے بہت افسوس ہوتا ہے یہاں لوگوں کے مسائل اور غربت دیکھ کر۔'' ذوناش کے انداز میں افسردگی تھی۔

''اور میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔'' کومیل نے بے بسی اور تلخی سے کہا، اچانک ذوناش نے کومیل کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''ارے واؤ کومیل وہ دیکھو، وہاں کتنی خوبصورت Bengals ہیں، مجھے وہاں جانا ہے۔'' اس نے کانچ کی چوڑیوں کی دوکان دیکھ کر شور مچایا۔

''میں نے وہ Bengals لینی ہیں۔'' کومیل اسے اس دوکان میں لے گیا تھا، وہ خوشی سے بے صبری ہو رہی تھی۔

''کومیل مجھے یہ پہننی ہیں، میں نے کبھی یہ Bengals نہیں پہنی ہیں۔'' ذوناش کے لہجے میں ایک حسرت تھی۔

''اوکے آپ پہلے ان میں ڈسائیڈ کر لیں۔''

''یہ دیکھو یہ کیسی ہیں؟'' ذوناش نے ریڈ اور گرین کلر کی چوڑیاں اٹھائیں وہ کسی بچے کی طرح پرجوش دکھائی دے رہی تھی۔

''اچھی ہیں۔'' کومیل مسکرایا۔

اور پھر ذوناش نے دونوں کلائیوں میں ریڈ اور گرین کلر کی چوڑیاں ڈلوائیں۔

اس کی سفید اور خوبصورت کلائیوں میں ریڈ اور گرین کانچ کی چوڑیاں اتنی خوبصورت لگ رہی تھیں کہ بار بار کومیل کی نظریں اس کی کلائیوں کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

''کیسی لگ رہی ہیں؟'' وہ اپنی کلائیاں اسے دکھاتے ہوئے ازحد خوشی سے پوچھ رہی تھی۔

''بہت خوبصورت لگ رہی ہیں۔'' اس نے دھیرے سے تعریف کی اور پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا تھا۔

''میم آپ کی میوزک کلاس کا ٹائم ہو رہا ہے، گھر چلیں؟''

''نہیں ابھی نہیں، آج میں میوزک کلاس نہیں لے رہی، یہاں کوئی فورڈ اسٹریٹ ہے تو

وہاں چل کر کھانا کھاتے ہیں، پیدل چل چل کر مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"جی فورڈ اسٹریٹ تو ہے میم مگر اس کے لیے تھوڑا اور آگے جانا پڑے گا، آپ تھک تو نہیں جائیں گی؟" کومیل نے اس سے پوچھا۔

"جب ہم سفر اچھا ہو تو سفر کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو انسان تھکتا نہیں ہے۔" اس کے آنچ دیتے جواب نے کومیل کو خاموش کروا دیا تھا۔

پھر وہ دونوں چلتے چلتے فورڈ اسٹریٹ آگئے تھے، بار بی کیو اور تکا تک کی خوبصورت آوازیں، دیسی اور روایتی کھانوں کی مہک نے فضا کو پر لطف بنا دیا تھا، اسے بہت اچھا لگ رہا تھا یہاں آ کر، اسے اپنے زندہ ہونے کا احساس ہو رہا تھا، یہاں اس بازار میں ایک عجیب سا سحر تھا، وہ زیادہ سے زیادہ ٹائم یہاں گزارنا چاہتی تھی۔

"میم کیا کھائیں گی آپ؟" کومیل نے اس فورڈ اسٹریٹ کے سب سے مشہور دیسی ہوٹل کے باہر رکھی چارپائیوں اور ٹیبل کی جانب بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے یہ تکا تک کھانا ہے، اس کا میوزک بہت انٹرسٹنگ ہے یقیناً یہ ڈش کھانے میں بھی اچھی ہو گی۔" ذوناش نے وضاحت کی اور کومیل نے مسکراتے ہوئے ویٹر کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

"ہاف کڑاہی تکا تک کی مکھن میں تیار کروا کر لاؤ، ایک پلیٹ چکن تکا، رائتہ اور سلاد کے ساتھ اور ہاں روٹی تنوری ہو اور بالکل تازہ ہو۔"

"اچھا باؤ جی میں یوں گیا اور یوں آیا۔" ویٹر خوش دلی سے چٹکی بجاتے ہوئے آرڈر لے کر واپس مڑ گیا، قریب ہی بڑے سے توے پہ تکا تک تیار ہو رہا تھا، کومیل اور وہ ایک ہی چارپائی پہ بیٹھے تھے، ذوناش نے اپنا سیل فون بیگ سے نکالا اور اپنے سے قدرے فاصلے پہ بیٹھے کومیل آفریدی سے کہا۔

"کومیل ذرہ میرے قریب آؤ؟" جواباً کومیل نے اس کی بات پہ اسے اس طرح حیرت سے دیکھا تھا جیسے اسے اپنی سماعت پہ شبہ ہوا ہو۔

"ک...... کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"تم آؤ تو سہی، بتاتی ہوں ابھی۔" ذوناش نے اب کے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو وہ مزید پریشان ہو اٹھا۔

"میم اسٹاپ اٹ یہ...... یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟ پبلک پلیس ہے آخر کچھ تو خیال کریں۔" وہ لب بھینچے دھیرے سے بڑبڑایا۔

"ڈونٹ وری میں تم سے رومانس نہیں کرنے والی ہوں تھوڑا سا قریب آؤ میرے، میں تمہارے ساتھ ایک سیلفی لینا چاہ رہی تھی۔" ذوناش نے اسے گھورتے ہوئے کہا، تو ایک دھیمی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ ٹھہر گئی۔

"آپ کا کیا پتہ کب، کیسے اور کہاں آپ کا موڈ بدل جائے۔" اس کی بات پہ ذوناش کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔

"یہ سچ ہے کہ تم مجھے اچھے لگتے ہو، لیکن اب ایسے بھی ایکسائٹڈ نہیں ہو تم کہ میں ہر وقت تم سے رومانس لڑانے کے بارے میں ہی سوچتی رہوں۔" اسے کومیل کی بات پہ غصہ آ گیا تھا، کومیل اس کے جلے کٹے انداز پہ اور خفگی پہ دھیرے سے ہنسا۔

"میں بھی چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اسپیشل مت سمجھیں۔"

"فار گاڈ سیک کومیل...... اب یہاں اپنا فضول اور بورنگ لیکچر جھاڑنا مت شروع ہو جانا، سیدھی طرح سے میرے قریب آؤ تاکہ میں تمہارے ساتھ ایک سیلفی لے سکوں۔"

"لیجیے آ گیا ہوں، اتنا فرمانبردار باڈی گارڈ آپ کو کبھی نہیں ملے گا۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ گیا، ذوناش نے اسے اور خود کو کیمرے میں لے کر مسکراتے ہوئے سیلفی بنائی، وہ دونوں تصویر میں مسکرا رہے تھے۔

"تھینکس یہ تصویر ایک خوبصورت یاد کا حصہ ہے میں ہمیشہ اسے سنبھال کر رکھوں گی۔" ذوناش نے سیل فون گود میں رکھتے ہوئے دھیرے سے کہا، کومیل اٹھ کر دوبارہ اپنی جگہ پہ چلا گیا تھا، پھر کچھ ہی دیر کے بعد ویٹر کھانا لے آیا تھا۔

"واؤ یہ تو بہت ٹیسٹی ہے اور اس کا ٹیسٹ بہت ڈیفرنٹ ہے۔" پہلا لقمہ لیتے ہی ذوناش نے بے ساختہ تعریف کی تھی۔

"آپ کو پسند آیا؟" کومیل نے اپنی پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بہت زیادہ، آئم شیور اگر تم مجھے اسی طرح سے یہ کیلریز سے بھرپور دیسی کھانے کھلاتے رہے تو میں بہت جلد موٹی ہو جاؤں گی اور پھر مرسل مجھ سے شادی سے انکار کر دے گا۔" وہ رغبت سے کھانا کھاتے ہوئے بولی۔

"ویسے یہ آئیڈیا کتنا اچھا ہے ناں؟"

"اگر یہ بات ہے تو میں آئندہ آپ کو کبھی ایسے دیسی کھانے نہیں کھلاؤں گا۔" کومیل نے ہنستے ہوئے لقمہ منہ میں ڈالا۔

"یعنی تم میری کسی بھی طرح مرسل سے شادی کروا کر ہی رہو گے؟" ذوناش نے کھیرا اٹھا کر کھاتے ہوئے اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورا۔

"جی بالکل آپ نے ٹھیک سمجھا۔" وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

"تم نے میرا بہت دل جلایا ہے اللہ کرے محبت تمہیں بھی وہ سزا دے جو تم مجھے دے رہے ہو، کومیل تم ایک برف کے گلیشیئر ہو، نہ پگھلنے والے گلیشیئر۔" ذوناش نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"تم نے کسی سے محبت کی ہوتی تو تمہیں احساس ہوتا، محبت کتنی تکلیف دیتی ہے، اس محبت میں گھٹ گھٹ کر مرنا کتنا اذیت دیتا ہے۔" کومیل سر جھکا گیا۔

"مرسل صاحب کیسے ہیں؟ رابطہ ہوا ان سے؟" کومیل نے موضوع بدلا حالانکہ وہ جانتا تھا مرسل آج کل جرمنی گیا ہوا تھا اور اس کا ذوناش سے کوئی رابطہ نہ تھا، وہ پھر سے بھٹکنے لگی تھی اداس ہونے لگی تھی۔

"رابطے ان سے رکھے جاتے ہیں جن سے لگاؤ ہو، جن سے محبت ہو اور مرسل کو مجھ سے نہ لگاؤ ہے نہ محبت۔" ذوناش نے اب کھانا ختم کر لیا تھا، اس کا چہرہ اب سپاٹ تھا۔

"آپ مرسل صاحب کے بارے میں ایسا کیوں سوچتی ہیں؟ وہ آپ کے لئے ہی تو اتنی محنت کر رہے ہیں۔" وہ خواہ مخواہ اس کا دل مرسل کی طرف سے صاف کر رہا تھا۔

"تم مرسل کی وکالت مت کرو میں اچھی طرح سے جانتی ہوں کہ وہ یہ محنت، میرے لئے نہیں صرف اپنے لئے کر رہا ہے۔" ذوناش نے ٹشو سے منہ صاف کرتے ہوئے کہا، تو کومیل خاموش ہو گیا، وہ بھی کھانا ختم کر چکا تھا۔

واپسی پہ فورڈ اسٹریٹ سے نکلتے ہوئے کومیل نے اسے اسپیشل میٹھا پان تیار کروا کے دلوایا تھا، وہ شام اگر ذوناش کے لئے اس کی زندگی کی سب سے یادگار شام تھی تو کومیل آفریدی کے لئے بھی وہ شام کبھی نہ بھولنے والی تھی۔

☆☆☆

اسی رات ایک بجے کی فلائٹ سے کمال قریشی واپس آ گئے تھے، ذوناش کو نیند نہیں آ رہی تھی اور وہ لیپ ٹاپ کھولے بیڈ پہ بیٹھی تھی جب پورچ میں اس نے کمال قریشی کی گاڑی رکنے کی آواز سنی تھی۔

وہ لیپ ٹاپ چھوڑ کر اپنے کمرے سے باہر نکل آئی تھی، تھوڑی دیر کے بعد کمال قریشی اندر داخل ہوئے تھے، ڈرائیور نے ان کا بریف کیس اور ہینڈ کیری پکڑ رکھا تھا۔

''انہیں میرے روم میں رکھ دو۔'' انہوں نے اپنے ڈرائیور سے کہا اور آگے بڑھ آئے۔

''ہائے ڈیڈ، ہو آر یو۔'' ذوناش آگے بڑھ کر ان کے گلے لگی۔

''ذونا میری جان!'' انہوں نے اس کے سر پہ تھپکی دی۔

''آئی ایم فائن مائے چائلڈ، تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟''

''یس ڈیڈ! نیند نہیں آ رہی تھی؟'' وہ مسکرائی۔

''جلد سونے کی کوشش کیا کرو، یہ بتاؤ تمہارا ٹور کیسا رہا؟'' وہ اسے اپنے بازو کے گھیرے میں لئے لیونگ روم کے صوفے پہ بیٹھ گئے۔

''بہت بہت اچھا، ڈیڈ میں نے بہت انجوائے کیا۔'' اس نے بے ساختہ خوشی سے بتایا تو کمال قریشی بھی مسکرانے لگے۔

''گڈ ویری گڈ۔''

''ڈیڈ میں نے اپنا کریڈٹ کارڈ خالی کر دیا ہے۔'' وہ ہنسی۔

''ڈونٹ وری، یہ سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔''

''تھینکس ڈیڈ۔'' اس نے خوشی سے ان کے کندھے پہ سر رکھا، کمال قریشی نے برسوں بعد اسے اتنا خوش اور مطمئن دیکھا تھا۔

''میں اپنی جان کو اپنی بیٹی کو ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔'' ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''او کم آن ڈیڈ۔'' ذوناش نے ان کی آنکھوں سے آنسو صاف کیے تھے۔

''اچھا یہ بتائیں، آپ کی کسی غیر ملکی ڈیلی گیشن سے کراچی میں میٹنگ تھی، کیسی رہی میٹنگ؟'' ذوناش نے ان کی توجہ ہٹائی۔

''میٹنگ کامیاب نہیں رہی۔'' انہوں نے افسردگی سے بتایا۔

''مگر کیوں؟'' وہ حیران ہوئی۔

''وکرم کا ایم ڈی ان سے پہلے ہی میٹنگ کر چکا تھا، وہ پہلے ہی انہیں اپنی Presentation سے متاثر کر چکا تھا اور صرف یہی نہیں میں نے جس ڈیل کے لئے مرسل کو جرمنی بھیجا تھا وہ ڈیل بھی کینسل ہو گئی ہے، وکرم اس ڈیل کو بھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے، میرا بزنس دن بہ دن ڈاؤن ہو رہا ہے، ایسی ناکامی مجھے زندگی میں کبھی حاصل نہیں ہوئی، وکرم دیمک بن کر میرے بزنس کو کھا رہا ہے۔'' کمال قریشی کے لہجے اور انداز میں بے پناہ فکر مندی بھی، تفکر تھا، پریشانی تھی۔

''ڈیڈ یہ وکرم راٹھور ہے کون اور کیوں آپ کے اس طرح پیچھے پڑا ہوا ہے؟'' ذوناش نے جھنجھلا کر پوچھا تو انہوں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

''مرسل نے وکرم کے بارے میں تمام معلومات حاصل کی ہیں، وکرم انڈر ورلڈ کا ڈان ہے اور پس پردہ رہ کر مجھے برباد کرنے پہ تلا ہوا ہے، کچھ عرصے پہلے یورپ میں میری ڈائمنڈز کی

ایک بہت بڑی ڈیل طے پائی تھی وہ ڈیل جس نے میری اور میرے بزنس کی کایا پلٹ دینی تھی اور مجھے اس ڈیل سے بے حساب پرافٹ ملنے والا تھا، وکرم کے بندوں نے مجھے اس ڈیل سے دستبردار ہونے کو کہا، میری ڈیل طے پا چکی تھی، ڈیل طے پا جانے کے بعد اس سے دستبردار ہونا بزنس کے اصولوں کی کھلی خلاف ورزی تھی اور پھر مجھے اس ڈیل سے کروڑوں کا پرافٹ ہو رہا تھا، میں کیسے اس ڈیل سے پیچھے ہٹ سکتا تھا۔"

"سو میں نے وکرم راٹھور کی دھمکیوں کو گیدڑ بھبکیاں سمجھ کر اگنور کر دیا اور ڈیل سائن کر لی، تب سے وہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا ہوا ہے اور وہ ہر طرح سے مجھے پریشان کرنے کی کوئی کسر نہیں چھوڑتا اور مجھے ذہنی ٹارچر کرنے کے لئے بھی، تم پہ فائرنگ کرواتا ہے، کبھی مجھے دھمکیاں دیتا ہے اور کبھی مجھے کاروباری نقصان پہنچاتا ہے۔" کمال قریشی نے اضطراب اور پریشانی سے کورٹ کی پاکٹ سے سگار نکالتے ہوئے اسے تفصیل بتائی۔

"اگر میں بھی اس کی طرح کا کوئی چار سو بیس یا دو نمبر بزنس مین ہوتا تو جواباً اس کے ساتھ بھی ایسی ہی کاروائیاں کرتا مگر میں کوشش کے باوجود ایسا نہیں کر سکتا، میں نے یہ بزنس بہت محنت اور نہایت ایمانداری کے ساتھ بنایا ہے، میں ایک امن پسند انسان ہوں، کسی کو ٹارچر کرنا، قتل و غارت گری سے کام لینا، یہ سب میری نیچر میں شامل نہیں ہے۔" کمال قریشی نے سگار کا کش لے کر جیسے اپنا ڈپریشن دور کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ڈونٹ وری ڈیڈ آپ پریشان مت ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" ذوناش نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی تو وہ پر سوچ انداز میں سر ہلا گئے اور توقف کے بعد بولے۔

"مرسل پرسوں جرمنی سے واپس آ رہا ہے، میں سوچ رہا ہوں اس کے آتے ہی تمہاری مرسل کے ساتھ منگنی طے کر دی جائے، مرسل اپنے کچھ بزنس پروجیکٹس پہ کام کر رہا تھا، اگلے چھ مہینے تک اگر وہ بہت مصروف نہیں ہوتا تو میں دو چار ماہ تک تمہاری شادی بھی کر دیتا۔"

"ڈیڈ آپ کو میری منگنی اور شادی کی اتنی فکر کیوں ہے؟" وہ جھنجھلائی۔

"مجھے فکر نہیں ہو گی تو اور کسے ہو گی میری جان، ایسے معاملات میں صرف اپنے ماں باپ ہی فکر کیا کرتے ہیں۔" انہوں نے دھیرے سے اس کے سر پہ چپت رسید کی۔

"ڈیڈ پتہ نہیں کیوں مرسل مجھے اپنے لئے بالکل بھی سوٹ ایبل نہیں لگتا ہے۔" وہ روہانسی ہوئی۔

"یہ سب تمہارا وہم ہے ذونا جان، بس وہ تھوڑا کم گو ہے، سنجیدہ ہے، باتیں کم کرتا ہے اور کام زیادہ اسی لئے تمہیں بورنگ لگتا ہے ورنہ وہ بہت اچھا بچہ ہے، میرے بھائی کی اولاد ہے اور میرا بہت خیال رکھتا ہے، اپنے باپ کے بزنس میں ہاتھ بٹانے کی بجائے وہ میرے ساتھ اٹیچ ہے اور سب سے بڑھ کر اس رشتے میں میری خوشی شامل ہے۔" کمال قریشی نے اس کی شخصیت پہ تبصرہ کیا تو وہ خاموش ہو گئی اور صوفے سے اٹھتی ہوئی بولی۔

"اگر آپ کی خوشی پوشیدہ ہے اس رشتے میں تو اوکے ڈیڈ، جیسے آپ مناسب سمجھیں، مجھے آپ کا انتخاب قبول ہے میں آپ کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں، آپ جب چاہیں انگیج منٹ کی ڈیٹ فائنل کر دیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" وہ انہیں یہاں بول کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی، مگر

سو نہیں پائی تھی، وہ ایک گہری کھائی میں گرنے والی تھی، مرسل اس کے لئے ایک گہری کھائی ہی تھا۔

کبھی کبھی دوسروں کی خوشی کی خاطر ہم جان بوجھ کر خود کو برباد کر لیتے ہیں وہ بھی خود کو برباد کرنے والی تھی، صبح تین چار بجے سونے کے باوجود وہ صبح اپنے ٹائم پہ اٹھ گئی تھی اور اس نے اپنی روٹین کے سارے کام بھی کیے تھے، ماریہ اسے ایکسر سائز کروا کر چلی گئی تھی، مگر اس کے لبوں پہ خاموشی چھائی ہوئی تھی، ریلیکس کرنے اور پھر ناشتہ کرنے کے بعد، وہ اپنے روم میں کچھ ڈھونڈنے لگی تھی، جب مریم خاتون گھر کی دوسری ملازمہ کے ساتھ اس کے روم میں آئی تھیں، ملازمہ کے ہاتھ میں اس کے لئے ہنگ کیے ہوئے کپڑے تھے جو غالباً ابھی لانڈری سے دھل کر اور پریس ہو کر آئے تھے اور وہ انہیں ذوناش کی الماری میں لگانے آئی تھی۔

''ذونا مائے ڈارلنگ تم کیا ڈھونڈ رہا ہے؟''

''ممی میرے کچھ ناولز تھے۔'' اس نے اپنا سائیڈ ٹیبل والا دراز بند کرتے ہوئے مریم خاتون سے پوچھا۔

''وہ مجھے نہیں مل رہے ہیں، آپ نے کہیں دیکھے ہیں؟''

''نہیں ذونا بے بی، ہم نے تمہارا کوئی ناول نہیں دیکھا تم اپنا لائبریری میں دیکھو، وہاں تم کہیں رکھ کر بھول گیا ہوگا۔''

''ہاں شاید، میں جا کر دیکھتی ہوں، تب تک آپ میرا روم بھی صاف کروا دیں۔'' وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آئی، لاؤنج میں آ کر اس نے کومیل کو کال کی۔

''یس میم!'' جواباً اس کی مردانہ بھاری اور گمبھیر آواز اس کے کان سے ٹکرائی۔

''کومیل تم لائبریری آؤ مجھے تم سے ایک کام ہے۔'' ذوناش نے اسے بتایا۔

''کیسا کام میم؟'' عجلت میں پوچھا گیا۔

''فکر مت کرو کھا نہیں جاؤں گی میں تمہیں، تم جلدی سے بس لائبریری آؤ۔'' ذوناش نے فون بند کر دیا اور لائبریری کی طرف بڑھ گئی اور پھر جب کومیل لائبریری کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو وہ سامنے پوری دیوار میں بنے بک ریک کے ساتھ لکڑی کی سیڑھی (جو خاص طور پہ اونچائی سے بکس اتارنے کے لئے بنوائی گئی تھی) لگائے اس سیڑھی پہ چڑھ کر ریک ٹٹول رہی تھی۔

''میم آپ نے یاد کیا تھا مجھے۔'' وہ اس کے عقب میں آ کھڑا ہوا اور مودبانہ انداز میں بولا، وہ اس وقت شلوار قمیض میں ملبوس تھا، سیاہ شلوار قمیض میں، اس کے پیروں میں سیاہ ہی لیدر کی چپل تھی، ذوناش نے مڑ کر اسے دیکھا اور چند لمحے اس سے نظریں نہ ہٹا پائی وہ عام اور سادہ سے حلیے میں بھی جاذب نظر دکھائی دیتا تھا۔

''یس میم!'' اس نے گلا کھنکارتے ہوئے اسے یاد دلایا۔

''ہاں وہ، مجھے تمہاری ہیلپ چاہیے تھی، مجھے کچھ انگلش بکس نہیں مل رہیں، تم چونکہ پڑھے لکھے ہو اس لئے آسانی سے انہیں ڈھونڈنے میں میری ہیلپ کروا سکتے ہو۔'' ذوناش کی بات پہ اس نے پوچھا تھا۔

''نیور مائنڈ میم، آپ مجھے بکس کے نام بتائیں۔'' اس نے اونچی سی سیڑھی پہ کھڑی ذوناش سے پوچھا The flame and the flower. The princess bride. The blithedale romance! کچھ تیکھی سے رومانٹک ناولز ہیں میں انہیں کہیں رکھ کر بھول گئی ہوں۔'' ذوناش کی

وضاحت پہ بے اختیار اس کے لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

(اچھا تو محترمہ رومانٹک ناولز پڑھتی ہیں، جنہوں نے اس کا دماغ خراب کررکھا ہے)

"میں نے تمہیں کوئی جوک تو نہیں سنایا، ایسے کیوں مسکرا رہے ہو؟" ذوناش نے وہیں سیڑھی پہ کھڑے کھڑے اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے وہ دراصل مجھے کالج کے زمانے کی ایک بات یاد آ گئی تھی۔" اس نے خود پہ پھر سے سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بہانہ تراشا اور کتابوں پہ نظر دوڑانے لگا۔

"مجھے نہیں بتاؤ گے وہ بات؟ میں بھی مسکرانا چاہتی ہوں۔" اس نے افسردگی سے کہا۔

"میم وہ بات آپ کو بتانے والی نہیں ہے۔" اس کا انداز جان چھڑانے والا تھا۔

"مگر کیوں؟" وہ عجلت میں نیچے اترنے لگی تھی، اگلے ہی لمحے اس کا پاؤں پھسلا تھا اور وہ لڑکھڑائی تھی، وہ بہت برے طریقے سے نیچے گر جاتی اگر کومیل تیزی سے لپک کر سیڑھی کے پاس نہیں آ جاتا۔

وہ منہ کے بل سیدھا اس کے اوپر گری تھی، کومیل نے اسے گرنے نہیں دیا تھا، ذوناش کا دل اس اچانک افتاد پہ تیزی سے دھڑک رہا تھا اور خوف سے اس کی سانسیں بکھر گئی تھیں، دوسری طرف کومیل کا بھی اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا تھا، اگلے ہی پل کومیل نے اسے نیچے اتار دیا تھا، ذوناش نے سینے پہ ہاتھ رکھ کر ایک طویل سانس لیا۔

"تھینکس کومیل اگر تم نہیں ہوتے تو جانے میرا کیا حال ہوتا؟" کومیل سر جھکا گیا۔

"اٹس او کے میم! اللہ آپ کو اس چوٹ سے بچانا چاہتا تھا اسی لئے اس نے مجھے یہاں بہانے سے بھیج دیا۔" وہ بک ریک کی طرف بڑھتے ہوئے عام سے انداز میں بولا تو وہ کتنے ہی لمحے اس کی پشت کو دیکھتی رہی۔

"ہاں اور وہ بھی صرف تمہیں ہی میرے پاس بھیجتے ہیں، ایک ایسے شخص کو جو میرا نہیں ہے، جو میرا نہیں بن سکتا۔" اس کے لہجے میں دکھ تھا، کومیل نے رخ موڑ کر اس کی جانب پلٹ کر نہ دیکھا تھا اور وہ دیکھنا چاہتا بھی نہیں تھا۔

"میم پلیز لیو دس ٹاپک۔"

"زبان بند کر لینے سے دل دھڑکنا بند نہیں ہو جاتا۔" ذوناش نے طویل سانس لیا۔

"مگر تم جیسا پتھر دل انسان یہ بات نہیں سمجھے گا۔" کومیل نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا، اسے ذوناش کے مطلوبہ ناول مل گئے تھے۔

"کل جرمنی سے مرسل واپس آ رہا ہے، اس کے آتے ہی ہماری انگیج منٹ کا دن ڈیسائیڈ ہو جائے گا۔" ذوناش نے اسے اطلاع دی، وہ کومیل کا ردعمل دیکھنا چاہتی تھی، وہ اس کی بات پہ ایک دم پلٹا تھا۔

"یہ تو بہت خوشی کی خبر ہے۔" وہ مسکرایا، اس کے ہاتھ میں چند بکس بھی تھیں۔

"تمہارے لئے یہ خوشی کی خبر ہے، جانتی ہوں میں، مگر میرے لئے موت کی خبر ہے یہ۔" ذوناش چھوٹے چھوٹے قدموں سے اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی، اس کی نظریں کومیل کے بے تاثر چہرے پہ مرکوز تھیں۔

"یہ لیجئے آپ کی بکس، خواہ مخواہ آپ اوپر چڑھ کر انہیں ڈھونڈ رہی تھیں۔" کومیل نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے بکس اس کو تھمائیں، ذوناش نے اس کے ہاتھ سے بکس لے لیں

تھیں۔

''اب میں جاؤں؟ کوئی اور کام تو نہیں آپ کو؟'' کومیل نے اس کی انگیج منٹ کی خبر پہ اک رتی توجہ نہ دی تھی۔

''اگر کہوں کہ مت جاؤ، تو کیا رک جاؤ گے؟'' آنچ دیتے لہجے میں پوچھا گیا۔

''اگر کوئی کام نہیں ہے تو نہیں، میں نہیں رکوں گا۔'' اس کا انداز دوٹوک تھا۔

''جانتی تھی میں۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''میم آپ کو کہیں باہر تو نہیں جانا؟'' وہ لائبریری سے نکلتے ہوئے پھر سے ایک لمحے کے لئے رکا۔

''نہیں مجھے کہیں نہیں جانا۔'' وہ بھی دروازے کی جانب بڑھی۔

''اوکے میں ابھی فون پہ سر کمال سے اجازت لے لیتا ہوں، ابا کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں، میں ان کی خیریت معلوم کر آؤں، رات تک میں واپس آجاؤں گا۔'' کومیل کی اطلاع پہ وہ اس کے قریب ہی رک گئی۔

''تم گھر جانا چاہتے ہو تو مجھے بھی ساتھ لے جاؤ۔'' اس کی فرمائش پہ وہ حیران ہوا۔

''آپ کیا کریں گی میرے گھر جا کر؟ میرے گھر میں آسائشات نہیں ہیں، آپ کو متاثر کرنے کے لئے وہاں کچھ نہیں ہے۔'' وہ بے ساختہ بولا تو وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

''تم تو ہو گے ناں وہاں؟ بس یہ کافی ہے میرے لئے۔'' اس کے آنچ دیتے انداز اور لہجے پہ وہ سر جھکا گیا تھا۔

''سر کمال کو اعتراض ہو گا کہ آپ میرے گھر.....'' وہ چند لمحوں کے لئے رکا۔

''نہیں ڈیڈ کچھ نہیں کہیں گے، اس لئے تم فکر مت کرو، میں تھوڑی دیر میں تیار ہو کر آتی ہوں۔'' وہ اسے جواب دے کر لائبریری سے نکل گئی تھی۔

☆☆☆

وہ دوپہر گیارہ بارہ بجے کا ٹائم تھا، جب وہ گاڑی میں بیٹھا تھا اور وہ سادہ مگر ڈیزائنر ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس شانوں پہ دوپٹہ رکھے، گاڑی میں آ بیٹھی تھی، کومیل نے بے ساختہ اس کے گہرے سبز رنگ کے مہذب سے لباس کو دیکھا بغیر کسی میک اپ کے لبوں پہ ڈیپ ریڈ لپ اسٹک لگائے بالوں کو فرنچ ناٹ کی شکل میں لپیٹے وہ بہت خوبصورت اور ڈیسنٹ لگ رہی تھی، کومیل نے گاڑی کا مرر درست کرتے ہوئے اگنیشن میں چابی گھمائی اور دوسیع ڈرائیو سے گاڑی نکال کر گیٹ سے نکال گیا۔

موسم خاصا خوشگوار تھا، آسمان پہ تیرتے بادلوں نے دھوپ کو کہیں چھپا دیا تھا، ہوا سے درخت جھول رہے تھے سڑک پہ درختوں سے پھول اور زرد پتے ٹوٹ کر بکھرے ہوئے تھے۔

ان کی گاڑی کے ساتھ ساتھ ذوناش کی سیکورٹی کے لئے مزید ایک گاڑی چل رہی تھی جس میں دو سے تین اسلحہ بردار گن مین موجود تھے، کومیل اس کا ذاتی ڈرائیور اور اس کی سیکورٹی کا انچارج تھا۔

''تمام راستے خاموش رہ کر مجھے بور کرنے کی بجائے اچھا سا میوزک ہی لگا دو تا کہ مجھے تمہارے ساتھ سفر کرکے یہ احساس نہ ہو کہ میں نے تمہارے ساتھ آ کر کتنی غلطی کی ہے؟'' ذوناش کافی دیر سے گاڑی کی پچھلی نشست پہ بیٹھی شیشے کے پار دیکھ رہی تھی، بالآخر اس کی حد درجہ خاموشی پہ شکوہ کر بیٹھی تھی، اگلے ہی لمحے کومیل نے میوزک پلے کر دیا تھا، عاطف اسلم کی خوبصورت آواز کانوں میں گونجنے لگی تھی۔

حال دل کو سکون چاہیے
پوری اک آرزو چاہیے
دل کو تیری موجودگی کا احساس یوں چاہیے
تو چاہیے تو چاہیے شام و صبح تو چاہیے
تو چاہیے تو چاہیے ہر مرتبہ تو چاہیے
جتنی دفعہ ضد ہو میری
اتنی دفعہ تو چاہیے
کوئی اور دو جا مجھے نہ تیرے سوا چاہیے
ہر سفر میں مجھے تو ہی رہنما چاہیے
جینے کو بس مجھے تو ہی مہرباں چاہیے

کبھی کبھی خوبصورت شاعری بھی دھڑکتے ہوئے دل کے احساسات کی ترجمان بن جاتی ہے سو اس وقت ذوناش کے جذبوں کی کہانیاں بھی اس گیت کی شاعری خوب ترجمان بن کر کومیل پہ عیاں ہو رہی تھی ذوناش کی ساکت نظریں سپاٹ انداز میں گاڑی ڈرائیو کرتے کومیل پہ جمی ہوئی تھیں، معاً مرر سے اچانک کومیل نے پیچھے بیٹھی ذوناش پہ نگاہ ڈالی تھی اور پھر اگلے ہی لمحے گڑبڑا کر اپنی نظریں ہٹالیں تھیں۔ ذوناش کے لبوں پہ وہ گویا ایک بے چین دعا بن کر مچل رہا تھا، اس کی آنکھوں کے کناروں پہ ایک بھٹکتی ہوئی آرزو بن کر دکھائی دے رہا تھا، اس کی پلکوں پہ وہ خود کو ایک درد بن کر دیکھ رہا تھا، اسی لئے چند لمحوں کے سوا وہ دیکھ ہی نہ پایا تھا، اس کے دل کی بے چینی نے اسے نظریں پھیر لینے پہ مجبور کر دیا تھا۔

سینے میں اگر تو درد ہے نہ کوئی دوا چاہیے
تو لہو کی طرح رگوں میں رواں چاہیے
انجام ہو، ہو چاہے میرا آغاز تو چاہیے
تو چاہیے تو چاہیے، شام و صبح تو چاہیے
میرے خوابوں کے آشیانے میں تو چاہیے
میں کھولوں جو آنکھیں سرہانے بھی تو چاہیے
جتنی دفعہ ضد ہو میری
اتنی دفعہ تو چاہیے

شاعری گویا اس کے دل پہ اثر کر رہی تھی، ایک بار پھر دل نے ذوناش سے اس کٹھور شخص کی ضد شروع کر دی تھی، کسی نادان بچے کی طرح اس سے الجھنا شروع کر دیا تھا، مگر آج اس کے لب خاموش تھے، صرف اس کی بڑی بڑی آنکھیں اس کی ویران آنکھیں کومیل سے سوال کر رہی تھیں۔

دونوں میں نظروں کی آنکھ مچولی کا یہ سفر اس وقت ختم ہو گیا تھا، جب گاڑی کومیل کے سرسبز بیلوں سے ڈھکے گھر کے سامنے رک گئی تھی کومیل نے شاید گھر میں اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی، جب وہ گھر میں داخل ہوا تھا تو صوبیدار اکرام صحن میں پودوں اور بیلوں کی کانٹ چھانٹ میں مصروف دکھائی دے رہے تھے، ابرش آسٹریلین طوطوں کے پنجرے کے پاس چوکی پہ بیٹھی ہاتھوں میں دانہ لئے انہیں دانہ ڈال رہی تھی، خاموش فضا میں آسٹریلین طوطوں نے شور مچا رکھا تھا۔

قریب ہی برآمدے میں تخت پوش پہ بیٹھی عائشہ بیگم رنگ برنگی ریشمی نلکیوں کا ڈبہ لئے، کسی دوپٹے پہ کروشیے سے بیل بنانے میں مصروف تھیں۔

''السلام علیکم ایوری باڈی۔'' کومیل نے گلا کھکارتے ہوئے بلند آواز میں مسکراتے ہوئے سلام کیا تو تینوں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا، اگلے ہی لمحے تینوں نفوس کے چہرے پہ خوشی اور لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

''ارے کومیل بھیا۔'' ابرش خوشی سے چیک کر دانہ وہیں چھوڑ کر کومیل کی جانب لپکی تھی۔

''بھیا اگر میں اللہ سے کچھ اور مانگ لیتی تو آج وہ بھی مل جاتا مجھے، صبح سے آپ بہت یاد آ رہے تھے مجھے۔'' وہ والہانہ انداز میں کومیل سے

لپٹ گئی تھی، مگر اس کے پیچھے کھڑی الٹرا ماڈرن حسین وجمیل لڑکی کو دیکھ کر اگلا جملہ اس کے لبوں پہ ہی رہ گیا تھا۔

"اسی لئے کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے، تم نے مجھے یاد کیا اور میں آ گیا۔" کومیل نے شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، کومیل کے پیچھے کھڑی ذوناش کی نظروں میں پانی سا تیرنے لگا تھا، اسے اپنا مرحوم بھائی ذونین شدت سے یاد آیا تھا۔

"ارے میرا کومیل آیا ہے، میں صدقے جاؤں۔" عائشہ بیگم دوپٹہ اور کروشیا چھوڑ کر تخت سے اٹھتے ہوئے نہایت خوشی سے بولیں، تب تک کومیل ابرش کو بازو کے گھیرے میں لیا ان تک پہنچ چکا تھا اور جھک کر عائشہ بیگم کے گلے لگ چکا تھا، عائشہ بیگم نے اسے والہانہ پیار کرتے ہوئے اس کے ماتھے پہ بوسہ دیا تھا اور کومیل نے ان کا ہاتھ تھام کر عقیدت سے اپنے لبوں سے لگایا تھا۔

ماں اور اولاد کی محبت کا یہ منظر دیکھ کر ذوناش کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا، ماں جیسے عظیم اور لازوال رشتے سے کمی کا احساس اس کے دل کو رونے پہ مجبور کر گیا تھا، اسی اثناء میں صوبیدار اکرام صاحب بھی ہاتھ جھاڑ کر زیر لب مسکراتے ہوئے برآمدے میں آ گئے تھے۔

"السلام علیکم ابا!" وہ ان کے گلے لگتا ہوا بولا۔

"وعلیکم السلام، میرے شیر جوان میرے بہادر کیسے ہو؟" اکرام صاحب نے اس کے شانے پہ تھپکی دیتے ہوئے خوشگوار موڈ میں پوچھا تو وہ مسکرا دیا تھا۔

"بالکل فٹ ہوں ابا، آپ کی دعاؤں سے۔"

"شکر الحمدللہ، اللہ تم کو ہمیشہ اپنی امان میں رکھے۔" کومیل دھیرے سے مسکرا دیا۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"یار میں بالکل ٹھیک ہوں ہٹا کٹا ہوں، تمہاری ماں نے تو خوامخواہ تمہیں میری بیماری کی اطلاع دے کر پریشان کر دیا۔" اکرام صاحب مسکرائے۔

"کہاں ٹھیک ہیں ابا، اتنے کمزور لگ رہے ہیں آپ مجھے۔" کومیل نے ان کے کمزور سے وجود کو دیکھتے ہوئے فکر ظاہر کی۔

"بھیا ابا کو تو اس بڑھاپے میں جھوٹ بولنے کی بیماری ہو گئی ہے، ابا بتاتے کیوں نہیں بھیا کو، ایک ہفتہ پہلے آپ کی شوگر پانچ سو تک پہنچ گئی تھی اور آپ کے ساتھ ساتھ پریشانی سے کیا حالت ہوئی تھی ہماری۔" ابرش نے تروٹھے سے انداز میں کومیل کو تفصیل بتائی۔

"ارے چھوڑو نہ ان باتوں کو، میرے بچے کو سانس تو لینے دو۔" عائشہ بیگم نے مداخلت کی۔

"ارے ہاں کومیل یار بیٹھ ناں کھڑا کیوں ہے۔" اکرام صاحب نے اسے بیٹھنے کو اشارہ کیا، اچانک ان تینوں کی نظریں دروازے کے قریب کھڑی ذوناش پہ اٹھی تھیں۔

"کومیل یہ...... یہ محترمہ کون ہیں؟" اکرام صاحب نے پوچھا تو کومیل کو ذوناش کی موجودگی کا احساس ہوا۔

"او آئم سوری، میں تعارف کروانا بھول گیا، یہ ذوناش ہیں، انہی کی سیکیورٹی کے فرائض انجام دے رہا ہوں میں، میم آپ آئیے ناں، آپ رک کیوں گئیں۔" کومیل نے پلٹ کر اسے آگے آنے کو کہا۔

"ہیلو۔" ذوناش نے ان کے قریب آتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔

''جیتی رہو۔'' اکرام صاحب نے شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

''میم کو آپ سب سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا، سو میں نے یہاں آنے کا ذکر کیا تو یہ بھی ساتھ چلی آئیں۔'' کومیل نے تخت پہ بیٹھتے ہوئے وضاحت کی۔

''خوش رہو آباد رہو بیٹا۔'' عائشہ بیگم نے آگے بڑھ کر محبت سے اسے خود سے لپٹا لیا۔

''بیٹا تمہارے آنے کی بہت خوشی ہوئی، تم آؤ ناں یہاں بیٹھو۔'' عائشہ بیگم نے محبت سے تخت پوش کے سامنے رکھی دو کرسیوں میں سے ایک کی جانب اشارہ کیا۔

''بیٹا آپ کے شایان شان اس گھر میں بیٹھنے کو کوئی ایسی جگہ نہیں مگر.....'' صوبیدار اکرام صاحب نے جھجک کر جملہ ادھورا چھوڑا، تو وہ دھیرے سے مسکراتی ہوئی کومیل کے مقابل رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''آپ ایسی بات کر کے پلیز مجھے شرمندہ مت کریں، جہاں خلوص پیار و محبت جیسے خوبصورت جذبے ہوں رشتے ہوں، وہاں چیزیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔''

''ہاں بیٹا یہ بالکل سچ کہا تم نے۔'' عائشہ بیگم خوشی اور اشتیاق سے ذوناش کے ساتھ والی چیئر پہ آ بیٹھیں۔

''ارے عائشہ، ابرش، بھئی تم دونوں بھی کمال کرتی ہو، ذوناش بیٹا پہلی بار ہمارے غریب خانے میں تشریف لائی ہیں، ان کی کوئی خاطر مدارت کرو۔'' اکرام صاحب کومیل کے پاس بیٹھتے ہوئے دھیرے سے بولے۔

''جی ابا میں جا رہی ہوں۔'' ابرش اس خوبصورت ساحرہ سے نظریں ہٹاتے ہوئے مسکرائی اور کچن میں چلی گئی۔

پھر چند لمحوں کے بعد ابرش سوفٹ ڈرنک لئے پھر سے وہاں موجود تھی، ذوناش کو سرو کرنے کے بعد اس نے گلاس کومیل کی طرف بڑھایا۔

''میں مہمان تھوڑی ہوں؟'' کومیل نے گلاس اٹھاتے ہوئے سرگوشی کی تو ابرش مسکراتی ہوئی کومیل کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

اس دوران اکرام صاحب نماز پڑھنے کے لئے وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، عائشہ بیگم ذوناش سے باتوں میں مصروف تھیں اور اسے دوپٹے پہ بنائی ہوئی کروشیے کی بیل دکھا رہی تھیں اور وہ حیران ہو کر ان کی بنائی ہوئی خوبصورت بیل دیکھ رہی تھی کہ یہ سب عائشہ بیگم نے بنا کیسے لی تھی؟

''آج تو آپ ہمارے لئے مہمان بن کر ہی آئے ہیں۔'' ابرش نے زیر لب مسکراتے ہوئے کومیل کی بات کا جواب دیا۔

''کیوں بھئی آج کیا خاص بات ہے؟'' کومیل نے مسکراتے ہوئے اسے اچنبھے سے دیکھا۔

''خاص لوگوں کے ساتھ رہنے والے، بھی تو خاص ہی ہو جاتے ہیں ویسے بھیا جو تین گھنٹے اتنی حسین و جمیل لڑکی کے ساتھ ڈیوٹی دینا بھی تو کتنی خوبصورت ڈیوٹی ہے ناں؟'' ابرش کے لہجے میں شرارت تھی۔

''شٹ اپ، یہ ایک فضول مذاق ہے۔'' کومیل نے اسے مصنوعی خفگی سے گھورا۔

''ایویں فضول مذاق ہے، دل میں تو لڈو پھوٹتے ہوں گے اتنی حسین لڑکی کے ساتھ رہ کر۔'' ابرش ہنوز سرگوشی کے انداز میں بولتی ہوئی اسے چھیڑ رہی تھی۔

''فضول باتیں مت کرو، تم اچھی طرح سے جانتی ہو، میں اس ٹائپ کا بندہ نہیں ہوں۔''

کومیل نے گھورتے ہوئے سرزنش کی۔
"ہاں جانتی ہوں اچھی طرح آپ اس ٹائپ کے بندے نہیں ہیں، بلکہ بہت بورنگ ان روماننک اور سڑیل قسم کے انسان ہیں۔" ابرش نے جلے کٹے انداز میں کہا تو کومیل نے اس کی پونی کھینچی۔
"Keep quiet میم نے تمہاری فضول بکواس سن لی تو کیا سوچیں گی؟"
"اچھا جی بڑی پروا ہے آپ کو اپنی میم کی؟" ابرش نے اپنی پونی چھڑائی، ذوناش نے دونوں بہن بھائیوں کو کھسر پھسر کرتے ہوئے دیکھ کر دھیرے سے مسکرا دی، کیسا خوبصورت رشتہ ہوتا ہے، بہن بھائی کا، اس نے دل میں سوچا۔
"ماں کھانے کو کچھ ہے تو پلیز کھلایئے، بہت سخت بھوک لگ رہی ہے مجھے۔" کومیل تخت پوش سے اٹھتا ہوا بولا۔
"آج آلو کی بھجیا بنائی ہے، اگر تم آنے سے پہلے فون کر دیتے تو میں کھانے میں خاص اہتمام کرتی، ذوناش بیٹی پہلی بار گھر آئی ہے اور....." عائشہ بیگم شرمندہ سی ہوئیں۔
"فریج میں چکن رکھا ہے، میں جلدی سے چکن کڑاہی بنا لیتی ہوں۔" ابرش اپنی جگہ سے اٹھی۔
"ارے نہیں ابرش پلیز کوئی تکلیف نہیں کرنا۔" ذوناش نے اسے روکا۔
"ارے نہیں ذوناش بیٹا تکلف کیسا؟ بلکہ مجھے تو بہت شرمندگی ہو رہی ہے، تمہاری آمد کا علم ہوتا تو کچھ ڈھنگ کا کھانا بناتی ہیں۔" عائشہ بیگم مسلسل شرمندہ ہو رہی تھیں۔
"آنٹی پلیز، ایسی باتیں کر کے مجھے شرمندہ کر رہی ہیں آپ، پلیز کھانے پہ کوئی اہتمام مت کیجئے گا میں صرف آپ سب سے ملنا چاہتی تھی۔" ذوناش نے عجز و انکساری سے کہا۔
"ارے نہیں میری بچی، کوئی اہتمام نہیں کر رہے ہم، اب خوش؟" عائشہ بیگم نے شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، تو وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا گئی۔
آج اسے ماں کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔
"ماں آپ میم کے پاس بیٹھئے میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں، کھانا ریڈی ہو جائے تو مجھے بلا لیجئے گا۔" کومیل اپنے کمرے کی طرف جانے کے لئے اٹھا۔
"ٹھیک ہے کھانا لگاتے ہی ابرش تمہیں بلا لے گی، مگر تم آرام کرنے سے پہلے نماز پڑھ لینا۔" عائشہ بیگم نے اسے ہدایت دی۔
"جی ماں، نماز پڑھنے ہی جا رہا ہوں۔" کومیل اپنی شرٹ کے بازو فولڈ کرتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔
ذوناش کی نظریں آسٹریلین طوطوں پہ جمی ہوئی تھیں، رنگ برنگے طوطے پنجرے میں خوشی سے پھدک رہے تھے۔
"ذوناش بیٹا اگر تم بھی تھوڑی دیر آرام کرنا چاہو تو کر لو۔" عائشہ بیگم کو اس کی فکر ہوئی۔
"نہیں آنٹی مجھے اچھا لگ رہا ہے آپ کے پاس بیٹھنا۔" اس نے خوشدلی سے کہا، تو عائشہ بیگم مسکرا دیں۔
"جیتی رہو، اللہ تمہاری قسمت اچھی کرے میں ذرہ اک نظر ابرش کو دیکھ کر آئی، جانے کچن میں کیا کر رہی ہے۔" عائشہ بیگم کچن کی طرف مسکراتی ہوئی بڑھ گئیں اور وہ اٹھ کر صحن میں آ گئی تھی۔
سرسبز و شاداب بیلوں اور پودوں سے ڈھکا

ہوا وہ صاف ستھرا صحن جس میں ہر چیز بڑے سلیقے سے رکھی گئی تھی، اسے بڑھا بھلا لگا، ایک عجیب سکون تھا یہاں، تحفظ کا بھرپور احساس۔

وہ جہاں کھڑی تھی قریب ہی لمبی سی کیاری بنائی گئی تھی، جہاں سبز دھنیا ہری مرچیں، ٹماٹر اور دیگر سبزیوں کو اگایا گیا تھا، اسی کیاری میں وقفے وقفے سے گل دوپہری اور موتیے کے پودے بھی لگائے گئے تھے، ذوناش کیاری کے قریب رکھے موڑھے پہ بیٹھ گئی اور ہاتھ بڑھا کر ڈھیرے سے موتیے کے پھولوں کو چھونے لگی۔

''آپ کو پھول پسند ہیں کیا۔'' اچانک ابرش اس کے قریب آتی ہوئی مسکرائی، تو وہ بھی زیر لب مسکرا دی اور اثبات میں سر ہلا گئی۔

''ہاں ان پھولوں سے بہت خوبصورت گجرے بنتے ہیں، آپ کے لئے بھی بنائیں گی۔'' ابرش آج بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔

''تمہارے ہاتھوں پہ مہندی بہت خوبصورت لگ رہی ہے۔'' ذوناش نے اس کے ہاتھ پہ لگی خوبصورت مہندی دیکھتے ہوئے تعریف کی۔

''یہ..... کل رات لگائی تھی، میری فرینڈ کی شادی تھی۔'' ابرش نے سادگی سے بتایا اور پھر پوچھنے لگی۔

''آپ کو مہندی پسند ہے کیا؟''

''ہاں پسند ہے مگر میں نے کبھی مہندی نہیں لگوائی۔'' ذوناش کی بات پہ قریب کھڑی ابرش نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''مگر کیوں؟''

''بس ایسے ہی، کبھی خیال نہیں آیا۔'' ذوناش نے اپنی ہتھیلی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو ٹھیک ہے میں آپ کو مہندی لگاتی ہوں۔'' اگلے ہی لمحے ابرش کون مہندی لیئے اس کے پاس آ بیٹھی تھی اور اس کی خوبصورت ہتھیلی پہ خوبصورت نقش و نگار بنانے لگی تھی، عائشہ بیگم کچن میں مزید کچھ بنانے میں مصروف ہو گئی تھیں۔

کومیل جب تھوڑی دیر کے بعد اپنے کمرے سے واپس آیا تھا تو اسے صحن میں بڑے مطمئن انداز میں، ابرش سے گپ شپ لگاتے ہوئے پایا تھا، اس کے دونوں ہاتھوں پہ مہندی لگی ہوئی تھی اور وہ اپنی دونوں ہتھیلیاں پھیلائے بیٹھی تھی، اس کے بالوں کی فرینچ ناٹ اس کے شانے سے آگے آئی ہوئی تھی۔

اس وقت وہ ایک سادہ سی گھریلو لڑکی لگ رہی تھی، کومیل نے پہلی بار اسے کھل کر مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

غیر ارادی طور پہ وہ برآمدے میں ہی رک کر اسے دیکھنے لگا تھا، بلاشبہ خدا نے اسے فرصت سے بنایا تھا۔

''کومیل یار! اگر آج آ ہی گئے ہو تو دو گھڑی بیٹھ جاؤ میرے پاس بھی۔'' عقب سے اکرام صاحب نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر یکدم پلٹا۔

''جی ابا۔'' کومیل کسی فرمانبردار بچے کی طرح ان کے ساتھ برآمدے میں بیٹھ گیا۔

''ابا کوئی خاص بات ہے کیا؟''

''خاص بات ہی یہ بیٹا، تم میرے دیرینہ دوست اسلم کو تو جانتے ہی ہو، اس نے اپنے چھوٹے بیٹے اعجاز کے لئے ابرش کا ہاتھ مانگا ہے وہ لوگ باقاعدہ رشتہ لے کر آنا چاہ رہے ہیں، کیا خیال ہے تمہارا؟ اعجاز تمہارا کلاس فیلو بھی رہ چکا ہے، تمہاری رضا مندی ضروری تھی اس سلسلے میں، میں نے تمہاری ماں کی باہمی رضامندی سے اسلم کو کچھ دن مزید رکنے کو کہہ دیا تھا۔'' اکرام

صاحب نے اسے تفصیل بتائی۔
"اعجاز بہت اچھا لڑکا ہے ابا، میں ذاتی طور پہ اسے جانتا ہوں شریف آدمی ہے اور پھر اسلم چاچا کے گھرانے کو ہم بچپن سے جانتے ہیں، دیکھے بھالے لوگ ہیں، انشاء اللہ ابرش وہاں بہت خوش رہے گی۔" کومیل نے اپنی رائے دی۔
"ہاں تو پھر ٹھیک ہے، اس جمعہ کو انہیں گھر بلا لیتے ہیں۔"
"جی ٹھیک ہے ابا، آپ اس سلسلے کو آگے بڑھائیں۔"
"تو کیا تم نہیں آؤ گے؟"
"نہیں ابا، میرے لئے آنا ممکن نہیں ہو گا، میں فون پہ بات کر لوں گا اسلم چاچا سے۔" کومیل کی بات پہ اکرام صاحب اثبات میں سر ہلا گئے تھے۔

☆☆☆

اور پھر وہ جتنے گھنٹے بھی کومیل کے گھر رہی تھی، وہ ذوناش کی زندگی کے خوبصورت لمحات تھے۔ عائشہ بیگم نے کھانے میں آلو کی بھجیا کے ساتھ چکن کڑاہی اور مٹر پلاؤ بھی بنا لیا تھا۔
دسترخوان پہ سجا وہ سادہ سا کھانا بھی اسے مزہ دے رہا تھا، کھانے کے دوران عائشہ بیگم، اکرام صاحب اور ابرش کا اسے مزید کچھ نہ کچھ کھانے پہ اصرار کرنا، ذوناش کو ان سب کی پر خلوص محبتوں کا دیوانہ بنا گیا تھا، وقت نجانے کیسے پر لگا کر اڑ گیا تھا، کچھ خبر ہی ہوئی تھی اسے۔
بالآخر شام کے سائے دن کے اجالے کو اپنے پنکھ میں سمیٹنے لگے تھے، شام اور رات کے بیچ گھڑی کی ٹک ٹک کرتی سوئیاں تیزی سے فاصلہ کم کرنے لگی تھیں، مگر اس نے اپنے محل نما پیلس میں جانے کا نام نہ لیا تھا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ابرش نے چائے بنائی تھی، کومیل نے چائے کا خالی کپ رکھتے ہوئے ذوناش سے کہا تھا۔
"میم کافی ٹائم ہو گیا ہے، اب ہمیں چلنا چاہیے۔" کومیل نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔
"ہاں چلتے ہیں۔" ذوناش نے دھیرے سے چائے کا کپ ٹیبل پہ رکھ دیا تھا۔
"تو بھئی آج تو ٹائم گزرنے کا بالکل بھی احساس نہیں ہوا، ذوناش بیٹا تمہاری آمد کی بے حد خوشی ہوئی۔" عائشہ بیگم نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پہ شفقت سے ہاتھ پھیرا تو ذوناش کا جی چاہا کہ وہ اپنا بھی اس کے سر سے نہ ہٹائیں۔
"اور آپ سے مل کر اس سے بھی زیادہ خوشی ہوئی۔" ابرش نے بھی چہکتے ہوئے اپنے دل کا سچ بولا تو وہ مسکرا دی۔
"مجھے بھی یہاں آ کر، آپ سب سے مل کر بہت اچھا لگا، آپ سب کے ساتھ میرا یہاں جو بھی وقت گزرا، وہ خوبصورت یاد بن کر ہمیشہ مجھے یاد رہے گا۔" ذوناش کی آنکھوں میں بے اختیار پانی تیرنے لگا تھا اور یہ صرف کومیل ہی دیکھ پایا تھا۔
"بس بیٹا یہ تو آپ کی انکساری اور محبت ہے، ورنہ ہمارا غریب خانہ واقعی آپ کے شایان شان نہیں۔" اکرام صاحب نے شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔
"پلیز انکل ایسے مت بولئے، آپ کا یہ چھوٹا سا گھر کسی جنت سے کم نہیں ہے، جہاں زندگی خوبصورت رشتوں، محبتوں اور پر خلوص جذبوں سے بندھی نظر آئے، وہ گھر جنت ہی ہوتے ہیں۔" ذوناش کی بات پہ اکرام صاحب مسکرا دیئے تھے۔
"بیٹا یہ تو سچ کہا آپ نے، بہرحال آپ کا

جب دل چاہے آپ یہاں آ سکتی ہیں، یہاں آپ کو ہمیشہ یہی خلوص اور شفقت ملے گی۔"

اکرام صاحب کی بات پہ وہ مسکراتی ہوئی اثبات میں سر ہلا گئی تھی، اس کی آنکھ کے کونے سے آنسو ٹوٹ کر گرا تھا جسے اس نے سر جھکا کر گویا چھپانے کی کوشش کر لی تھی، مگر کومیل سے اس کی آنکھ سے بہنے والا وہ آنسو بھی مخفی نہ رہا تھا۔

آج وہ ایک الگ ہی روپ میں اس کو دکھائی دے رہی تھی، ایک ٹوٹے ہوئے دل والی حساس، تنہائیوں کی ڈسی ہوئی، رشتوں سے محرومی کا دکھ چھپائے، محبتوں سے گندھی ہوئی ذوناش کمال قریشی۔

اسے ایسی محبتیں کبھی اپنی تائی، تایا اور مرتضیٰ سے نہیں ملی تھیں، آج انجان لوگوں سے ملنے والی پرخلوص محبتوں نے اس کی آنکھوں کو چھلکانے پہ مجبور کر دیا تھا۔

عائشہ بیگم نے بہت پیار سے صحن میں لگے موتیے کے پھول توڑ کر اپنے ہاتھوں سے ذوناش کو گجرے بنا کر پہنائے تھے، ابرش کی لگائی ہوئی مہندی کا اس کے ہاتھوں پہ خوب رنگ چڑھا تھا، جسے دیکھ کر ابرش نے اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بتایا تھا جس کے ہاتھوں پہ مہندی اتنا رنگ چڑھے اس کا ہزبینڈ اسے بہت محبت کرتا ہے، ابرش کی اطلاع پہ ذوناش کچھ انداز میں فقط مسکرا دی تھی۔

گھر سے نکلتے ہوئے عائشہ بیگم نے قرآنی آیات کا ورد کر کے کومیل پہ پھونک ماری تھی اور وہ ایک ماں کی اس محبت کے اظہار پہ دل ہی دل میں یہ سوچ کر رہ گئی تھی۔

لاکھ گرد حصار ہوں حفاظت کے
ایک بھی نہیں ہوتا ان میں ماں کی دعاؤں جیسا

گاڑی میں بیٹھنے اور واپسی پہ تمام راستے وہ پہلے سے بھی زیادہ خاموش ہو گئی تھی، اس کے لب خاموش تھے بالکل اور اس نے گاڑی کی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا رکھا تھا اور آنکھیں موند رکھی تھیں، کومیل نے مڑ کر اسے کئی بار دیکھا تھا، نا جانے کیوں اس کا دل چاہا تھا کہ وہ کوئی بات کرے۔

مگر وہ نہیں بولی تھی، حتیٰ کہ گاڑی کمال پیلس میں داخل ہو گئی تھی، پورچ میں گاڑی لگانے کے بعد کومیل نے گاڑی سے نکل کر اس کی نشست والا دروازہ کھولا تھا اور وہ باہر آ گئی تھی، آسمان پہ اب رات نے اپنا آنچل پھیلا دیا تھا۔

سیاہ بادلوں کی اوٹ میں جھانکتا ہوا چاند اور اٹھکیلیاں کرتی ہوا نے گاڑی سے نکلتے ہی اس کا ماتھا چوما تھا، مگر اس کے چہرے پہ سنجیدگی درج تھی، بالآخر کومیل بے ساختہ اس سے پوچھ بیٹھا تھا۔

"میم آر یو او کے؟"

"یس آئی ایم فائن، کومیل، تم ایک خوش نصیب انسان ہو اور جانتے ہو کبھی کبھی دوسروں کی خوش نصیبی اپنی بد نصیبی کا دوہرا احساس بن کر اور بھی ہرٹ کرنے لگتی ہے۔" وہ ایک لمحے کے لئے اس کے قریب رکی تھی اور پھر پورچ سے مین انٹرنس کی جانب بڑھ گئی تھی، کومیل وہیں دروازے پہ ہاتھ رکھے گاڑی کے پاس کھڑا اسے اندر جاتا ہوا دیکھتا رہا تھا۔

وہ لڑکی بھی بہت عجیب لڑکی تھی، کبھی اپنی حرکتوں سے اسے پریشان کرتی اور کبھی اپنی باتوں سے، وہ واقعی اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا، گاڑی لاک کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گیا تھا، چینج کرنے کے بعد اس نے اپنا دھیان ہٹانے کے لئے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر لیا تھا۔

وہ ذوناش سے اپنی توجہ ہٹانا چاہتا تھا، دل

مسلسل اس پاگل اور جذباتی لڑکی کے بارے میں متفکر ہو رہا تھا، وہ غائب دماغی سے چینل سرچنگ میں مصروف تھا جب ایک چینل کو چینج کرتے کرتے اس کا ہاتھ رک گیا تھا۔

کوئی فریاد تیرے دل میں دبی ہو جیسے
تو نے آنکھوں سے کوئی بات کہی ہو جیسے
ہر ملاقات پہ محسوس یہی ہوتا ہے
مجھ سے کچھ تیری نظر پوچھ رہی ہو جیسے

جگجیت کی پرسوز آواز اس کے مضبوط اور کشور دل کو مسمار کرنے لگی تھی، اسے وہ پل یاد آیا جب وہ کیبن میں اس کے ساتھ آ بیٹھی تھی، اسے وہ لمحہ بھی یاد آیا، جب میٹرو بس میں وہ اس کے بالکل ساتھ بیٹھی تھی اور اس کے بال اڑ اڑ کر کومیل کے چہرے کو چھونے لگتے تھے۔

راہ چلتے ہوئے اکثر یوں گماں ہوتا ہے
وہ نظر چھپ کے مجھے دیکھ رہی ہو جیسے
اس طرح پہروں تجھے سوچتے رہتے ہیں ہم
میری ہر سانس تیرے نام لکھی ہو جیسے
کوئی فریاد تیرے دل میں دبی ہو جیسے

نہ جانے یہ آواز کا اثر تھا شاعری کا یا اس کے اپنے اندر کا کوئی قوی احساس، وہ مسلسل غیر ارادی طور پہ اسے سوچے جا رہا تھا، وہ خود بخود ان لمحوں میں پھر سے سانس لینے لگا تھا، جب وہ دو دن نائٹ کلب کے باہر ہوش و خرد کی دنیا سے بیگانہ ہو گئی تھی۔

جب وہ ساحل سمندر پہ اپنی جان دینے اور اس کی جان نکالنے کے لئے سمندر میں ڈوبنے کی غرض سے بھاگی تھی، تب بے ساختہ اور غیر ارادی طور پہ کومیل نے اسے خود سے بھینچ لیا تھا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے وہ تمام مناظر گھومنے لگے تھے، وہ بے بس سے صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور کھڑکی میں آ کر کھڑا ہو گیا تھا،

مگر وہ لمحہ اب بھی اس کے دل سے لپٹا ہوا تھا، جب وہ کسی بچے کی طرح حیرت و خوشی سے فٹ پاتھ پہ کھڑی پانی پوری کھا رہی تھی، جب اس نے چہکتے ہوئے اپنی کلائیوں میں کانچ کی چوڑیاں چھنکاتے ہوئے اس کو دکھائیں تھیں۔

جب چارپائی پہ بیٹھ کر اس نے کومیل کے ساتھ زبردستی سیلفی بنائی تھی اور جب وہ لائبریری آیا تھا اور وہ گرتے گرتے بچی تھی، کومیل نے آگے بڑھ کر اسے بچا لیا تھا۔

وہ سارے لمحے نا جانے کیوں اس کے بے چین دل سے لپٹنے لگے تھے، اسے پریشان کرنے لگے تھے، وہ اس کے بارے میں نجانے کیوں سوچے ہی جا رہا تھا، گھبرا کر اس نے کھڑکی کھول دی تھی۔

صبح سے آسمان پہ سایہ کیے بادل اب دھیرے دھیرے برسنے لگے تھے، وہ خاموشی سے برستی بارش کی بوندوں کو دیکھنے لگا۔

اب اس کے اور اس کے دل کے بیچ ایک جنگ سی ہونے لگی تھی، دل اسے ذوناش کے بارے میں سوچنے پہ اکسا رہا تھا اور وہ اپنے نادان دل کی اوٹ پٹانگ سوچوں کو رد کر رہا تھا۔

دل اس سے ذوناش جیسے حسین و جمیل اور بے شمار دولت مند لڑکی کو اپنا لینے کی خواہش کر رہا تھا، وہ لڑکی اس سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کر چکی تھی اس سے محبت کی دعوے دار تھی، اسے اپنا آئیڈیل سمجھتی تھی، اپنی منگنی توڑنے پہ تیار تھی، وہ لڑکی ہیرے جواہرات کی ایک کان تھی، جسے حاصل کر کے وہ ہر حساب سے مالا مال ہو سکتا تھا، مگر لوٹنا اس کی فطرت میں شامل نہ تھا، وہ ایک مضبوط اور نہایت ایمان دار آدمی تھا، اپنے نفس پہ حکومت کرنے والا بہادر آدمی۔

کبھی ابھی تھی کہ بے بسی کی انتہا پہ پہنچنے سے

پہلے ہی کومیل نے اپنے دل کی تمام فضول اور بے معنی خواہشات کو کسی روتے ہوئے بچے کی طرح تھپکیاں دے کر سلا دیا تھا۔

کمرے میں کھڑکی کھولنے کے باوجود یکدم اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا وہ کمرے سے باہر نکل آیا تھا، بارش کی بوندیں اب تیزی سے برسنے لگی تھیں۔

وہ بلا مقصد لان میں آ گیا تھا، بے اختیار اس کی نظریں ذوناش کے کمرے کی کھڑکی پہ اٹھی تھیں اور اس نے اپنے بازو کھڑکی سے باہر پھیلا رکھے تھے، بارش کی بوندیں اس کی ہتھیلیوں کو بھگو رہی تھیں، ذوناش نے بھی اس کی جانب دیکھا تھا، ہمیشہ کی طرح، برسوں پرانے خواب کی طرح، کومیل آج بھی اس کی پلکوں میں ٹھہر گیا تھا، پتہ نہیں ایسا کیا تھا اس شخص میں کہ وہ کسی ناسمجھ بچے کی طرح اس کی جانب کھنچی چلی جاتی تھی، ہمکتی تھی، کھنچی چلی جاتی تھی لپکتی تھی اپنی عزت نفس کو اپنی انا کو، اپنی آن کو اپنی شان کو روندتی ہوئی چلی جاتی تھی اور اب بھی ایسا ہی ہوا تھا، وہ بے ساختہ کمرے سے بھاگتے ہوئے وہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

''کیوں میری ضرورت بنتے جا رہے ہو تم؟ کیوں میری جان لیوا عادت بنتے جا رہے ہو؟ کیوں میرے دل کا ریموٹ کنٹرول تم اپنے ہاتھ میں لے رہے ہو؟ کیوں میرے جذبوں کو اپنی خاموشی اور کٹھور پن سے بھٹکنے پہ مجبور کر رہے ہو؟ کیوں مجھے برباد کر دینا چاہتے ہو کیوں؟'' وہ اب روتے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھی، بارش اب اور بھی تیز ہو گئی تھی، وہ دونوں ہی بارش میں بھیگ رہے تھے، وہ اس سے سوال کر رہی تھی اور کومیل اسے دیکھتا ہوا بس اس کے سوالوں میں اپنے جواب ڈھونڈتا رہ گیا تھا، وہ گویا خود بھی بے بس ہو رہا تھا۔

''کوئی ایسا جادو کرو کہ میں تمہارے سحر سے آزاد ہو جاؤں، میرا دل تمہاری طرف مائل ہونا چھوڑ دے، پلیز...... پلیز مجھ پہ رحم کرو، میری آرزو مت بنو، میری تمنا کے راستے سے ہٹ جاؤ۔'' وہ پھر سے ہسٹریکل ہو رہی تھی اور اسے گریبان سے پکڑے جھنجھوڑ رہی تھی، آج وہ بول رہی تھی اور کومیل سن رہا تھا۔

اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی مریم خاتون کے لئے یہ منظر بہت جان لیوا تھا، وہ از حد فکرمندی سے ذوناش کے پاس جانے کے لئے اپنے کمرے سے نکلی تھیں۔

''دعائے مغفرت''

ہماری مصنفہ صباء جاوید کی بڑی بہن پچھلے دنوں قضائے الٰہی سے انتقال کر گئیں ہیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

غم کی اس گھڑی میں ادارہ حنا صباء جاوید کے ساتھ ہے۔
دعا گو ہیں کہ اللہ پاک صباء جاوید کی بہن کے جنت الفردوس میں درجات بلند کرے اور ان کے گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔

شبانہ شوکت

اتنی دیر ہو گئی تھی، ایان اب تک نہ آیا تھا، شاہین دو تین بار اسے کال کر چکی تھی اور وہ آگے سے کاٹ دیتا تھا، زاہدہ بیچاری بھی منتظر بیٹھی تھی کہ ان دونوں کو کھانا دے اور اپنے کوارٹر میں جائے، شاہین اس کے انتظار میں سیل فون پہ اپنا ایف بی اکاؤنٹ چیک کرنے لگی کہ وہ آ گیا۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام! اتنی دیر؟''

''ہاں بس، بزی تھا، بچے سو گئے؟''

''ابھی کچھ ہی دیر پہلے سوئے ہیں، ٹائم بھی تو دیکھیں، ساڑھے گیارہ ہو رہے ہیں۔''

''واقعی لیٹ ہو گیا ہوں۔'' اس نے گھڑی اتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھی، موبائل اور چابیاں بھی اور خود واش روم چلا گیا، نہا کر نائٹ سوٹ پہن کر

ناولٹ

باہر آیا تو شاہین نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''کھانا نہیں کھائیں گے؟'' اس نے چونک کر شاہین کو دیکھا۔

''آپ نے کھا لیا؟''

''میں کب کھاتی ہوں آپ کے بغیر؟'' اس کی سنجیدگی میں ناراضگی بھی جھلکی تھی، وہ مسکرا دیا۔

''تو چلیں آئیں۔''

اس نے اتنا کم کھایا کہ شاہین کو یقین ہو گیا کہ وہ صرف اس کی خاطر ڈائننگ ٹیبل تک آیا ہے، اس نے بھی بددل ہو کر ہاتھ کھینچ لیا، کمرے میں آ کر بھی وہ لیپ ٹاپ لے کر مصروف ہو گیا۔

''اب بس کر دیں، کافی ٹائم ہو گیا ہے۔''

''بہت کام ہے، آپ ڈسٹرب ہو رہی ہیں تو میں اسٹڈی میں چلا جاتا ہوں۔'' شاہین نے ناراضگی سے اسے دیکھا۔

''میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔'' ایان کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔

شاہین کے پاپا کی کاٹن مل تھی، وہ پاپا کی زندگی میں بھی آفس جاتی تھی اور اب بھی جاتی تھی، اگر کوئی ضروری کام نہ ہوتا تو وہ پانچ بجے تک اٹھ جاتی تھی، جبکہ ایان رات گئے تک معاملات نمٹاتا رہتا تھا، مل کا وزٹ بھی وہی کرتا تھا، ان کے دو بچے تھے، آٹھ سالہ اذان، ایان اور ساڑھے چار سالہ عالیان، دونوں اسکول جاتے تھے اور جب شاہین گھر پہنچتی تو ان کے قاری صاحب اور ان کے بعد ٹیوٹر آجاتے، بس آٹھ بجے کے بعد ہی وہ فارغ ہوتے اور شاہین کے پاس آجاتے، ایان اگر دس بجے سے پہلے آجاتا تو بچوں کے ساتھ کو انجوائے کر لیتا ورنہ اکثر اسے دیر ہو جاتی تھی اور وہ دونوں صبح اسکول جانے سے پہلے اس سے مل کر جاتے، یونہی دن گزر رہے تھے۔

☆☆☆

مسز کیانی کی بیٹی کی انگیج منٹ کا فنکشن تھا، وہ اپنی بیوٹیشن سے اپوائنٹ منٹ لے کر وہاں چلی گئی نئے ہیئر اسٹائل اور نئے کلر کے ساتھ فیشل اور مینی، پیڈی کیور نے اسے بہت نکھار دیا تھا، وہ ویسے ہی بہت خوبصورت تھی، دہکتی گوری رنگت، شہد رنگ آنکھیں پھر اس پر مستزاد بیوٹیشنز کی کارکردگی، اس کی خوبصورتی میں بلاشبہ چار چاند لگ گئے تھے، رات کو وہ نائٹی پہنے بالوں میں برش کر رہی تھی کہ اسے محسوس ہوا ایان مسلسل اسے ہی دیکھ رہا ہے، وہ ایکدم مڑی تھی، پر وہ تو پوری طرح ٹی وی میں گم تھا، اس نے جھلا کر برش پٹخا اور دودھ پینے لگی، دودھ ختم کر کے اس نے واش روم میں جا کر کلی کی اور اپنی جگہ پر آ کر لیٹ گئی، وہ اس پورے دورانیے میں ٹی وی دیکھتا رہا تھا، نو سال سے زیادہ ہو گئے تھے ان کی شادی کو مگر آج بھی وہ دو اجنبیوں کی طرح رہ رہے تھے۔

وہ تو کم گو تھی ہی، پھر اکیلے رہ رہ کر بھی کم بولنے کی عادی ہو گئی تھی، مگر ایان بھی کبھی اس سے فری ہو کر بات نہیں کرتا تھا، بہت ہی لئے دیئے انداز میں رہتا تھا، انتہائی ضروری بات کے علاوہ تو اس کے منہ سے بھاپ تک نہیں نکلتی تھی، نہ کبھی اس کی کسی عادت کی تعریف کی نہ اس کی خوبصورتی کو سراہا، معمولی شکل وصورت کی عورت بھی اپنے شوہر سے اپنی خوبیاں سننے کی منتظر رہتی ہے اور وہ اتنی حسین ہو کر بھی اپنے من، چاہے مجازی خدا کی طرف سے التفات کو ترس گئی تھی، اب یوں ہونے لگی تھی، وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ اس کے ساتھ ناخوش تھا، وہ ہر دم مطمئن اور پرسکون نظر آتا، اس سے بہت تکلف اور احترام سے پیش آتا، دونوں بچوں کی پرورش میں اس کا بہت خیال بھی رکھتا رہا تھا مگر پھر بھی کہیں کوئی کمی تھی، کوئی ان دیکھا فاصلہ تھا ان دونوں کے درمیان اور شاہین کو سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کس طرح اس فاصلے کو ختم کرے، میاں بیوی کی مخصوص فرینک نیس تو ان دونوں کے مابین بالکل نہیں تھی، ایان کی سنجیدگی اسے، اس کے ساتھ فری ہونے بھی نہیں دیتی تھی، آفس میں تو پھر وہ اس سے کافی باتیں کر لیتا تھا، مگر گھر پر صرف ضرورت کی بات اور بس، بچوں سے بھی بس ایسا پیار کہ جسے والہانہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا، شاہین صبح بچوں کی وجہ سے جلدی اٹھ جاتی تھی، اسے ڈسٹرب نہیں کرتی تھی، یہ اور بات کہ بچے ایان کو جگا کر اسے پیار کر کے اور اس سے پیار لے کر ہی اسکول جاتے تھے، وہ بچوں کے جانے کے بعد دوبارہ سو جاتی، ایان نو بجے تک تیار ہو کر ناشتہ کر کے آفس چلا جاتا اور وہ آرام سے گیارہ بجے تک جاتی تھی۔

☆☆☆

سات بجے کا الارم چیخ رہا تھا، اس نے

ہاتھ بڑھا کر اسے بند کیا اور اٹھی تو سر چکرا گیا، وہ کچھ دیر سر تھامے بیٹھی رہی پھر واش روم گئی تاکہ منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر خود کو فریش کر سکے کہ اتنی زور کی ابکائی آئی کہ اسے لگا کہ آنتیں ہی الٹ جائیں گی، دو تین ابکائیوں کے بعد اتنی بھی قے آئی کہ وہ بیسن کی سائیڈیں پکڑے کتنی ہی دیر جھکی کھڑی رہ گئی، کچھ دیر بعد طبیعت سنبھلی تو وہ بیڈ پر آ کر لیٹ گئی، ٹانگوں میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی، اتنی دیر میں، عالیان اس کا انتظار کر کر کے خود ہی آ گئے تھے اور اب دروازہ ناک کر رہے تھے، اس میں سکت ہی نہیں تھی، کہ وہ اٹھ کر دروازہ کھولتی، اتنے میں ایان کی آنکھ کھل گئی، بیٹوں کی آواز سن کر وہ پھرتی سے اٹھا اور دروازہ کھول دیا، وہ اس سے لپٹ گئے۔

"ماما کہاں ہیں پاپا؟" ننھا عالیان، باپ کے کندھے کے اوپر سے جھانک کر ماں کو ڈھونڈ رہا تھا، شاہین کھسک کر اوپر ہوئی اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھائے، وہ بھاگتا ہوا آ کر اس سے لپٹ گیا۔

"آپ اٹھی تو ہوئی ہیں تو ہمارے روم میں کیوں نہیں آئیں؟"

"بس آ رہی تھی میں۔" اس کی آواز میں موجود نقاہت نے ایان کو چونکا دیا، اس نے شاہین کی طرف آنے کے بجائے دونوں بچوں کو بلایا۔

"چلو بیٹا آنٹی انتظار کر رہی ہوں گی، وین بھی آنے والی ہو گی، ہری اپ، لیٹس گو۔" عالیان بسورا تو شاہین نے چمکارا۔

"ابھی جائیں پھر شام میں ملتے ہیں۔" اتنے میں سلمٰی (گورنس) نے دروازے پر دستک دے کر دیر ہو جانے کا احساس دلایا تھا، ان دونوں کو باہر تک چھوڑ کر آنے کے بعد وہ تیزی

سے شاہین کے پاس آیا تھا۔

''کیا بات ہے، طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟''

''چکر آ رہے ہیں اور وومیٹنگ بھی ہو رہی ہے۔'' اس بار تو وہ واضح طور پر چونکا تھا۔

''ڈاکٹر کے پاس چلیں؟''

''اتنی صبح کون ڈاکٹر ہو گی؟''

''تو پھر؟'' ایان نے سوالیہ اسے دیکھا۔

''شام کو جاؤں گی ڈاکٹر زارا کے پاس۔'' اس نے جس طرح نظریں چرائی تھیں، اس سے واضح تھا کہ وہ بھی اپنی کنڈیشن سمجھ رہی تھی، ایان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی تھی۔

''آپ آج ریسٹ کریں، میں دیکھ لوں گا آفس کو، شام میں جلدی آ جاؤں گا پھر آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا کر آنکھیں بند کر لیں، اس میں سچ مچ ہمت نہیں تھی کہ وہ آفس جا پاتی۔

''میں زاہدہ سے کہہ دیتا ہوں کہ آپ کے لئے جوس بنا لائے اور کچھ چاہیے تو بتا دیں۔''

''نہیں ابھی کچھ بھی نہیں۔'' وہ اسی طرح آنکھیں موندیں بولی تھی، وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر باہر چلا گیا، شاہین پھر سے سو گئی تھی، وہ بہت احتیاط سے تیار ہو کر آفس جانے کے لئے نکلا تھا۔

☆☆☆

شام کو ڈاکٹر نے وہی خوشخبری سنائی، جس کی دونوں کو ہی توقع تھی، کیونکہ پہلے بھی تو دو بار اس کے ساتھ یہی صورتحال پیش آئی تھی، ایان کے ہونٹوں پر ایک مستقل مسکراہٹ تھی جو اس کی خوشی کا پتا دے رہی تھی، اپنے بیڈ روم میں آ کر اس نے شاہین کو سینے سے لگا لیا۔

''تھینک یو سو مچ فار دس گریٹ پریزنٹ۔'' شاہین نے مسکرا کر اس کے سینے پر سر رکھ دیا تھا۔

''آپ کو کیا چاہیے، بیٹا یا بیٹی؟'' وہ دھیمے سے ہنسا۔

''اس بار تو بیٹی اور وہ بھی، آپ کے جیسی۔'' شاہین نے خوشگوار حیرت سے اسے دیکھا، وہ کب اسے سراہتا تھا۔

''بیٹے تو دونوں مجھ پر گئے ہیں تو اب بیٹی آپ کے جیسی نہیں ہونی چاہیے؟''

''اوہ تو یہ وجہ ہے۔'' وہ بددل سی ہو کر پیچھے ہٹ گئی، دوسری طرف وہ اس کے ردعمل پر حیران سا ہو گیا تھا۔

''لگتا ہے آپ کو بیٹی پسند نہیں ہے؟''

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں، بس لیٹنے لگی ہوں۔''

''او کے، آپ ریسٹ کریں، میں چلتا ہوں آفس ہم دونوں ہی کافی دیر سے وہاں نہیں ہیں۔'' وہ چلا گیا، شاہین سوچوں میں گم ہو گئی، آخر اسے کیوں ایان کی محبت پوری نہیں لگتی تھی، کیوں کہیں کوئی کمی محسوس ہوتی تھی، کوئی خلش کانٹے کی طرح چبھتی تھی۔

☆☆☆

ایان نے اسے کچھ دن کے لئے آفس جانے سے منع کر دیا تھا سو وہ گھر پر ہی آرام کر رہی تھی، اس شام عالیان نے اسے بہت تنگ کیا کہ وہ ان کے ساتھ پارک چلے، اس کی ضد سے مجبور ہو کر وہ تیار ہو گئی، سلمیٰ کو بھی ساتھ لے لیا کہ اگر عالیان تنگ کرے تو وہ سنبھال لے، ویسے بھی عالیان کی شرارتوں کا مقابلہ کرنا شاہین کے بس کی بات نہیں تھی، وہ تو پھدکتا ہوا پارک کے اس حصے سے دوسرے حصے میں چلا جاتا تھا، سلمیٰ ہی اس کے پیچھے ہلکان ہوتی رہتی تھی، آٹھ بجے بالآخر شاہین نے واپسی کا اعلان کیا۔

"مام!" وہ بسورا۔

"تھوڑی دیر اور۔"

"No enough lets go now۔" شاہین نے تادیب کی، آج اتوار کی وجہ سے ٹیوشن اور قاری صاحب کی طرف سے چھٹی تھی، واپسی میں ٹریفک جام ہو گیا۔

"اُف اب مزید دیر۔" شاہین نے کوفت سے سوچا، اسے اب تھکن محسوس ہو رہی تھی، یہ بھی شکر کہ موسم ٹھیک تھا ورنہ اسے تو گھٹن ہونے لگ جاتی۔

"ماما کب کھلے گا یہ ٹریفک؟" ریان نے تنگ آ کر کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔

"کیا پتا؟ کیا کہہ سکتے ہیں۔"

"بہت لمبی لائن ہے، پتا نہیں کب گاڑیاں چلیں گی۔" عالیان نے بھی جائزہ لیا، شاہین نے دائیں طرف دیکھا تو ٹھٹک گئی، اس کی گاڑی سے ایک دو چھوڑ کر تیسری رو میں وہ ایان تھا، جو فرنٹ سیٹ پر موجود ایک بہت خوبصورت لڑکی سے ہنستے مسکراتے باتیں کر رہا تھا، اتنا محو کہ اردگرد کی کوئی خبر ہی نہیں، وہ شاک کے عالم میں اسے ہی دیکھ رہی تھی کہ ٹریفک چل پڑی اور ایان کی گاڑی آگے بڑھ گئی، اسے تو پیچھے بجتے ہارن نے بھی ہوش نہیں دلایا، یہ تو ریان نے اس کا کندھا ہلایا۔

"ماما گاڑی تو چلائیں۔" وہ چونک کر حواسوں میں آئی اور گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی تھی۔

ایان اور کسی دوسری لڑکی کے ساتھ اتنا فری ہو کر ہنستا بولتا ہوا اس کے تو دماغ کے پردے پر وہی منظر بار بار لہرا رہا تھا، ایان جو شاہین سے اپنی بیوی سے اتنا ناپ تول کر بولتا تھا، سوچ سوچ کر ہنستا مسکراتا تھا، وہ کسی اور کے ساتھ اتنے خوشگوار موڈ میں؟ ایک تو ویسے ہی پارک میں اتنا ٹائم گزارنے سے تھکاوٹ سی محسوس ہو رہی تھی اوپر سے یہ نئی ٹینشن، وہ بلاوجہ شک کی قائل نہیں تھی اور اس کا ایان سے کچھ پوچھنے کا ارادہ بھی نہیں تھا، زاہدہ اس کے لئے چائے لے کر آئی تو اس نے بھی سر جھٹک دیا۔

"کل سے میں آفس جاؤں گی، یوں تو میں بالکل ڈل ہو جاؤں گی۔" اس نے فیصلہ کیا اور چائے پی کر صوفے پر سر ٹکایا تو آنکھیں خود بخود بند ہوتی چلی گئیں، وہ تو ایان نے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھے تو اس کی آنکھ کھل گئی، وہ پاس بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

"اتنی جلدی سو گئیں؟"

"ہاں کچھ تھک گئی تھی، بچے پارک جانے کے لئے ضد کر رہے تھے تو انہیں وہاں لے گئی تو اب کچھ تھکاوٹ ہو گئی ہے۔"

"زاہدہ بتا رہی ہے کھانا بھی نہیں کھایا؟"

"نہیں، بالکل دل نہیں چاہ رہا۔" وہ کسلمندی سے اٹھی۔

"تھوڑا سا کھا لیں، بھوکے پیٹ سونا تو آپ کے لئے بالکل بھی ٹھیک نہیں۔"

"آپ جلدی آ گئے۔" اس نے سامنے لگے کلاک کو دیکھا۔

"ہاں کچھ دنوں سے بچوں کو بالکل ٹائم نہیں دے پایا، اس لئے آج کوشش کی کہ ٹائم سے کام نمٹا لوں، ابھی بھی انہی دونوں کے ساتھ تھا، اب آپ بھی اٹھ جائیں تو سب مل کر کھانا کھا لیں۔"

شاید اسے خود بہت بھوک لگ رہی تھی، شاہین کے آفس نہ جانے سے یقیناً کام کا بہت برڈن ہو گیا تھا اس پر اور وہ لنچ بھی نہیں کر پایا ہو گا، وہ تیزی سے اٹھ گئی تھی، ڈائننگ پر بچے خوب چہک رہے تھے، کھانے کے بعد وہ دونوں لان میں چہل قدمی کرنے لگے تو ریان، عالیان کیسے

پیچھے رہتے وہ تیز تیز قدموں سے ان کا ساتھ دینے لگے، وہیں لان میں ایک بلی اپنے تین بچوں کے ساتھ چہلیں کر رہی تھی، عالیان سب بھلا کر ان کے پیچھے لگ گیا، بلی کے بچے میاؤں میاؤں کرتے یہاں وہاں بھاگنے لگے اور عالیان ان کے پیچھے۔

"عالیان نہیں، ایسا نہیں کرتے، کیوں ان معصوموں کو تنگ کر رہے ہو۔" شاہین نے اسے روکا مگر وہ کہاں سننے والا تھا، ایان نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا۔

"ماما منع کریں تو ہو جاتے ہیں نا، سمجھ نہیں آتی۔" وہ احتجاجاً ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔

"پاپا یہ کتنے کیوٹ ہیں نا؟" ریان پاس آ کر پوچھنے لگا۔

"ہوں بہت، ان کے ساتھ کھیلنا چاہیے نہ کہ تنگ کرنا۔"

"میں تنگ نہیں کر رہا تھا، میں ان سے فرینڈ شپ کر رہا تھا۔" عالیان نے آنکھیں پھیلا کر وضاحت دی تھی۔

"اچھی فرینڈ شپ ہے، چکرا ہی دیا ہے، بیچاروں کو۔" ایان بڑبڑایا۔

"اچھا، دیکھو ان میں سے سب سے زیادہ کیوٹ کون سا ہے؟" وہ اسے اٹھائے بلی کے بچوں کے پاس لے آیا جو اپنی ماں کے پہلو میں دبکے ہوئے تھے۔

"وہ وائٹ والا سب سے اچھا ہے، وہ میرا ہے، میں اسے اپنا فرینڈ بناؤں گا۔"

"اور یہ بلیک اینڈ وائٹ میرا ہے۔" ایان بھی قریب آ چکا تھا۔

"پھر یہ جو گرے کلر کا ہے، یہ کس کا فرینڈ بنے گا، ہمارا تو اور کوئی بھائی نہیں ہے۔" عالیان نے اتنی مایوسی سے کہا کہ ایان کو ہنسی آ گئی۔

"یار کافی ہو، آپ دو بھائی، اب ایک بہن بھی ہونی چاہیے۔"

"نہیں۔" عالیان نے جھٹ انکار کر دیا۔

"بھائی، ہمارا ایک اور بھائی ہو، سارے بھائی ہوں تو ہم گیمز کھیلیں گے۔"

"نہیں۔" اس نے فوراً سر ہلایا۔

"آپ کیا کہتے ہو ریان؟" وہ عالیان سے ہار کر ریان کی طرف مڑا۔

"یس پاپا؟" وہ غالباً متوجہ نہیں تھا سوالیہ اسے دیکھنے لگا۔

"آپ دونوں کی ایک بہن بھی تو ہونی چاہیے نا؟" وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔

"نہیں بھائی۔"

"چلو۔" ایان نے گہرا سانس لیا، شاہین کو ہنسی آ گئی، ایان نے اسے ہنستے ہوئے دیکھا تو خود بھی مسکراتا ہوا اٹھ گیا، عالیان ابھی بھی اس کی بانہوں میں سوار تھا۔

"مجھے لگ رہا ہے آپ کی ماما بھی آپ دونوں سے ایگری ہیں۔"

"یس سویٹ ماما۔" ریان نے شاہین کی کمر کے گرد بازو پھیلا لیا۔

"اب اپنے روم میں جائیں آپ لوگ، کافی ٹائم ہو گیا ہے، آج تو چھٹی تھی، کل نہیں ہو گی۔"

انہیں ان کے کمرے میں چھوڑ کر آیا تو شاہین دوائیں لے رہی تھی۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کل میٹنگ ہے، آپ کچھ دیر کے لئے چلیں گی؟"

"ہاں میں بھی بور ہو گئی ہوں۔"

"او کے ڈارلنگ۔" اس نے سکون کی

سانس لی تھی، نائٹ سوٹ میں ملبوس بیڈ پر آیا تو اسے بانہوں میں لے کر اپنے ساتھ لگا لیا، شاہین محسوس کر رہی تھی کہ آج وہ بہت خوشگوار موڈ میں تھا۔

''کیا اس لڑکی کے ساتھ کی وجہ سے۔''

ایک تیر سا دل میں کھب گیا تھا، وہ تنگ ذہنیت کی نہیں تھی کہ محض اسے کسی کے ساتھ دیکھ کر ہی مشکوک ہو جائے، بس یہاں ایان کی کم گوئی نے اسے کسی کے ساتھ ہنستا بولتا دیکھ کر شک میں ڈالا تھا مگر وہ بغیر کسی ثبوت کے اپنے شک کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔

☆☆☆

کاٹن کے ریٹ بہت گر گئے تھے، کسان سخت احتجاج کر رہے تھے اور احتجاجاً انہوں نے کپاس کی چنائی بھی روک دی تھی، زمیندار پریشان تھے تو آڑھتی سخت پریشان اور مل مالکان مال رک جانے سے شدید ترین پریشان، آج اسی لئے یہ میٹنگ بلائی گئی تھی، جس میں شاہین اور ایان شریک تھے، گفتگو کے اہم موڑ پر ایان کا سیل فون لگاتار بیل ہونے لگا، وہ کچھ دیر فون ہاتھ میں لئے دیکھتا رہا پھر Excuse کرتا باہر چلا گیا، چند لمحوں بعد ہی وہ واپس آیا اور شاہین سے مخاطب ہوا۔

''مجھے ایک ایمرجنسی میں جانا ہے پلیز آپ یہ ہینڈل کر لیں۔'' اس کے چہرے سے اضطراب مترشح تھا، وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''اوکے آپ جائیں۔'' وہ اتنی تیزی سے وہاں سے باہر گیا جیسے پل بھر بھی رک گیا، تو نجانے کیا ہو جائے گا، پھر شام تو کیا رات ہو گئی وہ نہیں آیا، سارا دن آفس کے کام اور مل سے آتے فون، نمٹا نمٹا کر اس کے سر میں درد ہو گیا، گھر میں بچے سر کھا گئے۔

''پاپا کہاں ہیں؟ ابھی تک کیوں نہیں آئے؟'' اسے خود کچھ پتا ہوتا تو انہیں بتاتی نا، رات کے ڈیڑھ بجے کا عمل تھا جب وہ بیڈ روم میں آیا۔

شاہین صوفے پر بیٹھی ایک کتاب پڑھ رہی تھی، وہ وہیں ٹھٹک گیا۔

''آپ سوئیں نہیں؟''

''آپ آفس سے بغیر کچھ بتائے چلے گئے پھر فون بھی نہیں کیا، اب رات کا ڈیڑھ بج گیا ہے، آپ سے متعلق کچھ خبر نہیں اور میں سو جاتی۔'' اس نے کتاب بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی اور اس کے قریب آ گئی، وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر ہلکا سا مسکرایا۔

''سوری ڈارلنگ۔'' نہ کوئی شرمندگی، نہ خفت بس ایک لفظ کہا اور ساری پریشانی اور معذرت کا تدارک ہو گیا، وہ چینج کرنے چلا گیا، واپس آیا تو وہ وہیں کھڑی تھی، ایان نے اس کے کندھوں کے گرد بازو پھیلایا۔

''آئیں اب سوتے ہیں، کافی رات ہو گئی ہے۔'' یعنی اب اسے رات گزرنے کا احساس ہوا تھا، اسے بیڈ پر لٹا کر لائٹس آف کیں اور خود بھی لیٹ گیا۔

''کھانا کھا لیا آپ نے؟'' شاہین یہ سوال کرنا کبھی نہیں بھولتی تھی، ایان ہونٹ بھینچ کر رہ گیا تھا، اسے اچھی طرح پتا تھا کہ وہ ڈنر اس کے بغیر کبھی نہیں کرتی تھی کیونکہ یہی ایک ایسا ٹائم ہوتا تھا جس میں وہ دونوں ساتھ ہوتے تھے، باقی کا سارا دن تو بھاگ دوڑ میں ہی گزر جاتا تھا، اب اس کنڈیشن میں وہ اب تک یونہی بھوکی تھی۔

''اُف۔'' وہ ایکدم اٹھ گیا تھا۔

''آئیں کچن میں چلتے ہیں۔''

''نہیں مجھے بھوک نہیں ہے، نیند آ رہی

ہے۔"

"بغیر کچھ کھائے کیسے نیند آ سکتی ہے؟"

"اس وقت میں نہیں کھا پاؤں گی۔"

"او کے دودھ پی لیں۔" اس نے اسے دودھ کے ساتھ کچھ بسکٹس کھلائے تھے۔

صبح دیر سے سونے کے سبب اس کی آنکھ کھل نہیں پائی تھی کہ فون کی بیل نے اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا، فون پر بلنک ہوتا نام دیکھ کر وہ بجلی کسی سی تیزی سے اٹھا، شاہین بھی جاگ گئی تھی وہ شاور لے کر سوٹ پہن کر آیا اور اپنا فون اور گاڑی کی چابی لے باہر کی طرف لپکا، وہ خاموشی سے اس کی پھرتیاں دیکھ رہی تھی۔

"ناشتہ نہیں کریں گے؟"

"نہیں مجھے جلدی ہے۔" وہ اسے اللہ حافظ کہتا چلا گیا، وہ حیران، پریشان، بیٹھی رہ گئی تھی، وہ تو کہتا تھا اس سے کھانے، ناشتے کو پوچھنے کے لئے ہی رہ گئی تھی اور تو اس کی اور ایان کی بات چیت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

دو دن کی مشکوک حرکتوں کے بعد وہ نارمل ہو گیا تھا، وہ خود بھی باقاعدگی سے آفس جا رہی تھی، دن گزر رہے تھے کہ اس دن پھر وہ واقعہ ہو گیا، وہ اس شاپنگ مال میں شاپنگ کے لئے آئی تھی، ریان اس کے ساتھ تھا، عالیان سو رہا تھا، ریان اندر چلا گیا، اسے گاڑی لاک کرنے میں تھوڑی دیر لگی تھی، وہ مڑی اور ایان پر نظر پڑی، وہ اسی لڑکی کے ساتھ مختلف شاپرز اٹھائے گاڑی کا لاک کھول رہا تھا، ہنستی مسکراتی لڑکی کے ہاتھ میں بھی شاپنگ بیگ تھے وہ سن کی وہیں کھڑی رہ گئی تھی، ایان اتنا محو تھا کہ اس کی نظر شاہین پر نہیں پڑی تھی، وہ خود بھی گاڑی کی اوٹ میں ہو گئی تھی، اور ایان کو تو سوائے اس لڑکی کے کسی اور کا ہوش ہی نہیں تھا ورنہ اس کی گاڑی ہی نہ پہچان لیتا، پھر اس نے غائب دماغی سے شاپنگ کی تھی، پہلی بار اس کا موڈ اتنا خراب ہوا تھا کہ وہ بچوں کو بھی جھڑک چکی تھی، دماغ میں خون کھولا دینے والا پیدا کر رہا تھا، وہ کبھی کسی سے بدتمیزی سے پیش نہیں آئی تھی، موڈ بہت خراب ہوتا تو خاموش ہو جاتی مگر آج تو اس کا بس نہیں چل رہا تھا، وہ ہر کسی کو کاٹ کھاتی، سلمٰی اس کے رویے سے گھبرا کر بچوں کو ان کے کمرے میں لے گئی، زاہدہ الگ حیران کہ شاہین جیسی سوئٹ لڑکی جو کبھی بل ماتھے پر نہیں آنے دیتی تھی اسے آخر ہوا کیا ہے، وہ جب سے آئی تھی اپنے بیڈ روم میں بند تھی، زاہدہ کو اس کی بہت فکر ہو رہی تھی، اس کے لئے اتنی دیر تک بھوکا رہنا ٹھیک نہیں تھا، زاہدہ اس کا کسی ماں کی طرح خیال رکھتی تھی، وہ دو دفعہ دروازہ ناک کر چکی تھی مگر آگے سے وہ بہت بیزاری سے جواب دیتی۔

"مجھے تنگ نہیں کرو زاہدہ۔"

نو بجے ایان آ گیا۔

"باجی کہاں ہیں تمہاری اور بچے کیا اتنی جلدی سو گئے ہیں؟" وہ حیرت سے ادھر اُدھر دیکھتا لاؤنج میں خاموش بیٹھی زاہدہ کے پاس چلا آیا، وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

"وہ تو جی باجی آج بہت غصے میں تھیں تو بچوں کو بھی ڈانٹ دیا، سلمٰی انہیں کمرے میں لے گئی ہے۔" ایان کو لگا اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے، شاہین اور بچوں پر غصہ؟ وہ زاہدہ سے کچھ اور پوچھنے لگا پھر سر جھٹک کر اپنے بیڈ روم میں چلا آیا، وہ سامنے بیڈ پر کروٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی، دروازہ کھلنے پر بھی کوئی ردعمل نہیں ہوا۔

"شاہین!" وہ قریب آ کر اس پر جھکا۔

"شاہین...... شاہین۔" وہ اسی طرح لیٹی
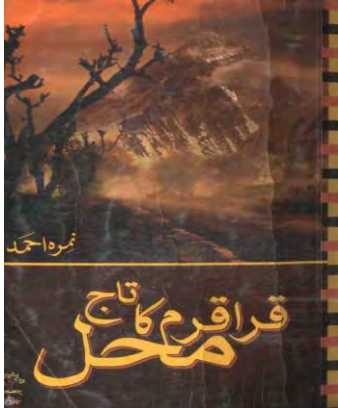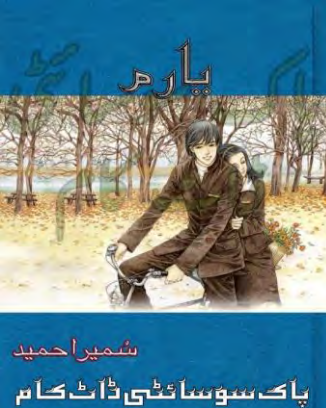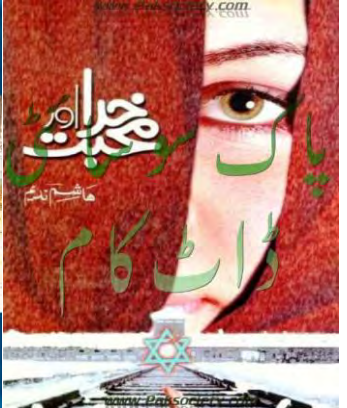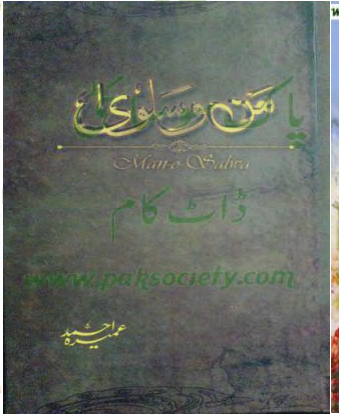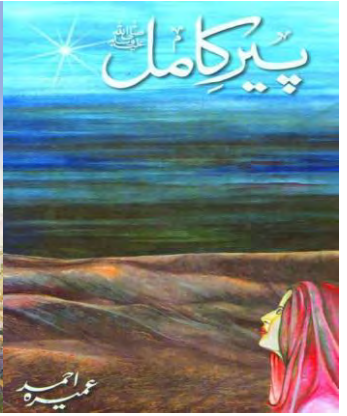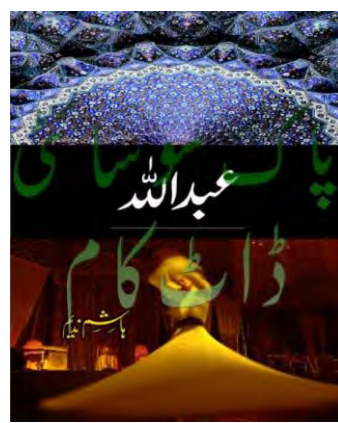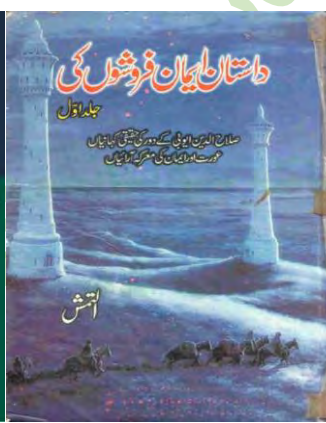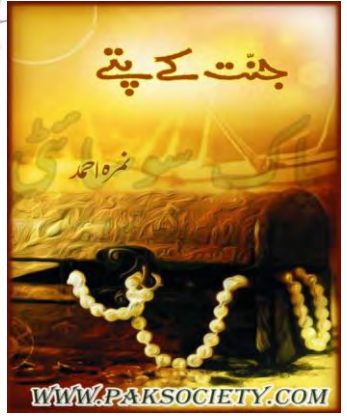
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

رہی، غالباً سوگئی تھی، حیرت کی بات تھی، نو بجے ہی کیسے سوگئی، وہ حیران ہوتا ڈریسنگ روم میں آیا، وارڈ روب کھول کر ہینگر نکال کر کوٹ تا نگا، ٹائی گلے میں سے کھینچ کر اندر رکھی اور کف اور گریبان کے بٹن کھولتا ہوا آکر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"شاہین!" اب اس نے اس کا کندھا تھا، وہ کسمسائی اور آنکھیں کھول دیں، سرخ سوجی ہوئی آنکھیں متورم چہرہ، وہ تو حیرت سے بت بن گیا تھا، آج کیا ہوا تھا آخر ہر چیز اتنی غیر متوقع کیوں تھی؟

"کیا ہوا ہے شاہین، سب ٹھیک تو ہے؟" حالانکہ نظر تو کچھ بھی ٹھیک نہیں آرہا تھا، وہ اسے دیکھتی رہی، چپ چاپ، خاموشی سے، ایان کو لگا اس کی نگاہوں میں ناراضی ہو، شکوہ ہو مگر کیوں، کس بات پر؟

"میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے؟" وہ کھسک کر اوپر ہوئی اور تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگئی، جواب اب بھی نہیں دیا تھا، اب وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوگیا ہے شاہین، دو دفعہ میں آپ سے پوچھ چکا ہوں اور آپ مجھے یوں اگنور کر رہی ہیں، جیسے میں دیواروں سے مخاطب ہوں۔" اس کے لہجے میں ناراضی جھلک رہی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا سب ٹھیک ہے؟" وہ بہت دھیمی آواز میں کہہ کر اٹھ گئی اور جاکر واش روم میں بند ہوگئی، ایان کے چہرے سے الجھن ظاہر ہونے لگی، وہ باہر آیا، بچوں کے کمرے کا دروازہ ناک کیا، سلمٰی آگئی۔

"جی سر؟"

"بچوں نے ڈنر کرلیا تھا؟"

"یس سر! میں نے کروایا تھا۔"

"سو گئے ہیں کیا، آواز نہیں آرہی؟"

"ابھی ابھی سوئے ہیں۔" وہ گہری سانس لیتا لاؤنج میں آگیا، زاہدہ کو کھانا لگانے کا کہہ کر کمرے میں آیا تو وہ برش کر رہی تھی۔

"آپ چلیں، میں چینج کر کے آرہا ہوں۔"

کھانے سے شاہین کی بد دلی صاف ظاہر تھی، ایان نے زاہدہ سے دودھ کا گلاس لیا اور کمرے میں آگیا۔

"یہ دودھ کے ساتھ اپنی میڈیسن لے لیں۔" اس نے خاموشی سے اس کی ہدایت پر عمل کیا تھا۔

"آپ کسی وجہ سے ڈسٹرب ہیں مگر بتانا نہیں چاہ رہی ہیں۔"

"کوئی بات نہیں ہے، بس یونہی۔" وہ آہستگی سے کہہ کر کتاب لے کر صوفے پر جا بیٹھی۔

"واک نہیں کریں گی؟"

"نہیں سستی ہو رہی ہے۔" اس کا چہرہ کتاب کے پیچھے چھپا ہوا تھا، ایان اسے دیکھتا رہا۔

"کیا پتہ اس کی طبیعت ہی ٹھیک نہ ہو۔" اس نے خود ہی قیاس کیا تھا۔

☆☆☆

اس کا رویہ ایان سے نارمل ہوگیا تھا، وہ اس سے ناراض رہ ہی نہیں سکتی تھی، یہ تو طے تھا اور یہاں تو یہ بھی کنفرم نہیں تھا کہ وہ لڑکی کون تھی اور ایان سے اس کا کیا تعلق تھا، بلاوجہ شک کا اظہار کرکے اپنی خوشگوار زندگی کو خراب کرنا کون سی عقلمندی تھی، اس دن ایمن آگئی، اس کی پھپھو کی بیٹی تھی۔

"یار شاہین! تم کس دنیا میں گم ہو، یاسین انکل کو ہارٹ پرابلم ہوئی اور وہ ہاسپٹلائزڈ ہیں اور تم نے ہاسپٹل جانا تو دور کی بات فون تک

کر کے ان کی طبیعت نہیں پوچھی۔" شاہین تو اچھل پڑی تھی۔
"یہ کیا کہہ رہی ہو، مجھے تو سنبل پھپھو نے بتایا تک نہیں تو مجھے کیسے معلوم ہوتا؟"
"آنٹی تو اتنی پریشانی میں تھیں لیکن میں نے تو تمہیں دو بار کال کی، تم نے اٹنڈ کی نہ ریپلائی کیا تو میں خود آگئی ہوں۔"
"یار!" اس نے تاسف سے پیشانی پر ہاتھ مارا۔
"مجھے تو بیچ میں کچھ پتا نہیں چلتا، عالیان میرے فون سے لگا رہتا ہے، اسی نے سب گڑبڑ کی ہوگی، فون میں کہیں مسڈ کال تک نہیں ہے۔"
"چلو پھر تیار ہو جاؤ، ہاسپٹل چلتے ہیں۔"
کچھ ہی دیر میں دونوں ہاسپٹل میں تھیں، یاسین انکل کی عیادت کے بعد وہ دونوں واپس آ رہی تھیں تو ایک کمرے کے کھلے دروازے سے نظر آتے مرد پر ایمن کی نظر پڑی تھی۔
"یہ تو ایان بھائی ہیں۔" ساتھ ہی اس نے کھلے دروازے پر دستک بھی دے ڈالی، شاہین نے دیکھا وہ ایک لڑکی کو اپنے ساتھ لگائے اس کا سر تھپک رہا تھا، وہ غالباً رو رہی تھی اس کے ہلتے جسم سے ظاہر تھا، ان دونوں پر نظر پڑتے ہی وہ ساکت رہ گیا تھا، شاہین ایک شاک کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔
"ایان بھائی آپ؟" ایمن کی آواز میں بھی استعجاب تھا، لڑکی چونک کر پیچھے ہٹی اور انہیں دیکھ کر اس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا، وہ وہی لڑکی تھی جسے شاہین دو بار پہلے بھی ایان کے ساتھ دیکھ چکی تھی اور اپنا شک سمجھ کر اس معاملے کو سیریس نہیں لیا تھا، مگر یہاں وہ کس پوزیشن میں اس کے ساتھ کھڑا تھا، وہ اب کیا جھٹلاتی، کیسے جھٹلاتی، اس آنکھوں دیکھی مکھی کو نگلنا اب ناممکن تھا، وہ اس کے ساتھ دھوکہ کر رہا تھا اور وہ اس کی محبت میں آنکھیں بند کر کے آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی، ایان مسلسل اسے دیکھ رہا تھا، جس کا چہرہ غم و غصے سے سرخ ہو چکا تھا۔
"شاہین!" اس نے پکارا، وہ نفی میں سر ہلاتی مڑی اور تیزی سے باہر جانے والے راستے پر چل پڑی، اس کے سر میں خون ٹھوکریں مار رہا تھا، غم و غصے کا ایک طوفانی ریلا اسے اپنے ساتھ بہائے لے جا رہا تھا، وہ پہلے اسے اس لڑکی کے ساتھ دیکھ کر بھی خاموش رہی تھی مگر اب اور نہیں۔
"شاہین...... شاہین۔" ایمن اسے تیز چلتا دیکھ کر دوڑتے ہوئے پیچھے آئی تھی، وہ اسے روک کر بات کرنا چاہتی تھی، مگر شاہین کی رفتار بہت تیز تھی، وہ اسی تیزی سے پارکنگ کی طرف بڑھی تھی کہ ایک بائیک بہت تیزی سے اندر آئی تھی، وہ بھی اپنے دھیان میں تیزی سے آگے بڑھی تھی کہ بائیک پوری شدت کے ساتھ اس سے ٹکرائی تھی کہ وہ اڑتی ہوئی دور جا گری تھی، ایمن چیختی ہوئی اس کی طرف بھاگی تھی۔

☆☆☆

جب اسے ہوش آیا تو درد کی تیز لہر نے اسے کراہنے پر مجبور کر دیا تھا، اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو خود کو ہاسپٹل کے ایک بیڈ پر پایا تھا، ذہن کام کے قابل ہوا تو رفتہ رفتہ سارے مناظر یاد آنے لگے۔
"اوہ۔" وہ ایکدم اٹھنے لگی تھی کہ درد کی شدت سے واپس گر سی گئی۔
"ارے ارے آرام سے بیٹا۔"
"پھپھو!" اس نے گردن موڑی، بتول پھپھو، ایمن اور سنبل پھپھو سب ہی موجود تھیں۔
"مجھے کیا ہوا ہے پھپھو؟" اس کا ہاتھ اپنے پیٹ پر گیا، جہاں بہت درد ہو رہا تھا، اس کا ہاتھ

بھاری ڈریسنگ پر جا رکا، اس کی آنکھیں خوف اور تحیر سے پھیلیں۔

''کچھ نہیں ہوا بیٹا، تم گر گئیں تو ڈاکٹرز کو ایمرجنسی میں آپریشن کرنا پڑا۔'' بتول پھپھو نے جس طرح نظر چرا کر بات کی، اس سے اس کے اندر خطرے کا سائرن بجا، اس نے گھبرا کر ایک بار پھر اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

''آپریشن، کیسا آپریشن، میرا بچہ؟ کہاں ہے وہ، کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟''

وہ کچھ گھبرائیں تو ضرور مگر پھر خود پر قابو بھی پالیا۔

''یہیں ہے بیٹا، کہاں ہونا ہے۔''

''یہیں کہاں؟ مجھے دکھائیں پھپھو، کہاں ہے میرا بچہ؟''

''وہ یہاں نہیں ہے شاہین، اسے انکیوبیٹر میں رکھا گیا ہے، قبل از وقت پیدائش کی وجہ سے اسے انکیوبیٹر میں رکھا گیا ہے، ویسے ٹھیک ہے وہ، فکر مت کرو۔''

معاً کمرے کا دروازہ کھلا اور ایان ہاتھ میں دواؤں کے شاپرز لئے اندر داخل ہوا تھا، اسے ہوش میں دیکھ کر وہ تیزی سے پاس آیا تھا۔

''کیسی ہیں آپ؟ ٹھیک ہیں؟''

''ان سے کہیں پھپھو یہ یہاں سے چلے جائیں۔'' اس نے نفرت [illegible] تھا، وہ ہرگز اسے نہیں دیکھ [illegible] چکی تھی، اس کے نتیجے میں [illegible] احسان سے دوچار ہوئی تھی، دو بچے نارمل پیدا ہوئے اور تیسرا ایمرجنسی آپریشن کے ذریعے پیدا کروایا گیا، اب جانے کس پوزیشن میں تھا، وہ کس کس بات کا غم کرتی، خود کس پوزیشن میں بیڈ پر پڑی تھی کہ ابھی اٹھنے میں جانے کتنے دن لگنے تھے، ایان تو اپنی جگہ جم کر رہ گیا تھا۔

''شاہین! کیسے فیل ہو کر رہی ہو بیٹا؟''

پھپھو نے تنبیہ کی۔

''پھپھو پلیز ان سے کہیں یہ یہاں سے چلیں جائیں، میں انہیں ہرگز نہیں دیکھنا چاہتی، ان سے کہیں میرے سامنے سے ہٹ جائیں۔''

وہ اتنی زور سے چیخی کہ درد سے بے حال ہو گئی، وہ تینوں تو بوکھلا کر اس پر جھکی تھیں اور وہ؟ وہ تو جیسے خلا میں معلق ہو گیا تھا، اتنی نفرت، اتنی بے زاری، شاہین اور اس کے لئے یہ سب کہہ رہی تھی، اسے یقین نہیں آ رہا تھا اور جب آیا تو وہ تیزی سے وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا۔

شاہین کو تیسرے دن بچہ دکھایا گیا تھا جو ابھی تک مشینوں کے حوالے تھا، خود اسے ایک ہفتہ ہاسپٹلائزڈ رکھا گیا تھا، دونوں بچوں کو دیکھنے آئی اور یہ حادثہ پیش آ گیا تھا اور اب انکل اسے دیکھنے کے لئے دو بار آ چکے تھے، اس پورے ہفتے میں ایان نے تو خود آیا نہ اس کا فون آیا، دونوں بچے کس حال میں تھے اسے کوئی علم ہی نہیں تھا، اس نے پھپھو سے بچوں کے متعلق پوچھا تو انہوں نے یہی کہا کہ وہ ٹھیک ہیں، بچے کو تو ابھی ہاسپٹل میں [illegible] رکھا جانا تھا، اسے چھٹی دے دی گئی تو وہ گھر [illegible]، ایان اور عالیان بھاگ کر اس سے لپٹ [illegible] تھے، ایمن اور بتول پھپھو اس کے ساتھ ہی آئی تھیں، ملازموں کو اس کے کھانے پینے سے متعلق ہدایات دے کر رات سے پہلے وہ واپس چلی گئیں، پھر آنے کا کہہ کر۔

''آپ کے پاس یہاں کون ہوتا تھا؟''

اس نے ریان سے پوچھا۔

''پاپا ہوتے تھے نا۔'' ریان کو ماں کی بے خبری پر حیرت ہوئی۔

''کب ہوتے تھے وہ گھر پر؟''

''شام کو سات بجے تک آ جاتے تھے اور صبح

ہمیں اسکول چھوڑ کر خود آفس چلے جاتے تھے۔"

"اُف۔" اس نے بہر حال شکر کی سانس لی تھی، ورنہ یہی فکر تھی کہ مل اور آفس کا کیا بنا ہو گا، وہ تو بیڈ پر تھی اور ایان کو بھی نفرت سے دھتکار دیا تھا، جب ہوش ٹھکانے آئے تو خود ہی پریشان بھی ہو گئی تھی، پر صد شکر کہ سب ٹھیک تھا، اب بہر حال اس کا ایان سے وہ تعلق، وہ محبت بھرا رشتہ نہیں ہو سکتا، وہ اب اس دھوکے باز، ہرجائی سے محبت نہیں کر سکتی، اب صرف نباہ ہو گا اور اس سے پہلے وہ سب کلیئر کروا کر رہے گی کہ وہ اس لڑکی سے کس ضمن میں اتنا فرینک تھا کہ اسے گلے لگائے کھڑا تھا، وہ اگر اس کے ساتھ انوالو تھا یا اس سے شادی کر چکا تھا تو اسے ایک راستہ منتخب کرنا ہو گا، وہ اتنی گئی گزری تو نہیں کہ دو حصوں میں بٹے ہوئے شخص کو سر آنکھوں میں بٹھائے رکھے، وہ تو اب اسے بالکل دیکھنا نہیں چاہتی تھی، جس کی وجہ سے وہ اتنی ہسٹریک ہوئی کہ بائیک سے جا ٹکرائی اور آج ان حالوں میں پہنچی ہوئی تھی کہ چلنا پھرنا دوبھر ہو چکا تھا اور وہ بچہ جسے دو ماہ بعد دنیا میں آنا تھا، وہ وقت سے پہلے پیدا ہو کر اپنی زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا، ایان کو یقیناً شاہین کے آنے کی اطلاع ہو چکی تھی سو وہ رات بھر نہیں آیا تھا، وہ دواؤں کے زیر اثر سو تو گئی مگر جاگ کر بھی غم و غصے سے بری حالت تھی، یعنی ویسے تو آتا رہا اور اس کے پہنچتے ہی گھر نہیں آیا، اتنی اکڑ، بارہ بجے اس نے آفس فون کیا، اس کی سیکرٹری خالدہ نے فون ریسیو کیا، اس کی خیریت معلوم کی اور بتایا کہ سر ایان پر کس قدر لوڈ ہو گیا ہے، وہ مل اور آفس کے چکر میں بہت تھک جاتے ہیں۔

"تیر اس کے پاس جا کر ساری تھکن دور ہو جاتی ہو گی۔" اس نے زہر خند سے سوچا، دو دن بعد انوار تھا اور عالیان باپ کو نہ پا کر رو ہی پڑا۔

"پاپا کہاں چلے گئے ہیں، روز نہیں آتے، ان کو بلائیں۔"

"آ جائیں گے آپ روؤ نہیں۔" اس نے بہلانے کی کوشش کی مگر وہ روتا ہی رہا۔

"نہیں آپ ابھی فون کریں، ابھی ان کو بلائیں۔"

"ابھی تو میں بھائی کو دیکھنے ہاسپٹل جا رہی ہوں، آپ بھی چلیں۔" جیسے تیسے اس کو بہلا لیا تھا، مگر تین دن بعد ننھے حمدان کو گھر لایا گیا تو اسے پھر سے رونا آ گیا۔

"پاپا کو بلائیں، وہ بھی اسے دیکھیں نا۔" وہ اتنا رویا کہ اسے مجبوراً فون ملا کر دینا پڑا، وہ بے تابی سے ایان کو اپنی الفت کے قصے سنانے لگا۔

"پاپا آ رہے ہیں۔" اس نے خوشی سے اعلان کیا، کچھ ہی دیر بعد وہ سچ مچ آ گیا، شاہین نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں، اس نے البتہ سلام کے ساتھ خیریت بھی پوچھی تھی، وہ اسے بچوں کے ساتھ چھوڑ کر خود اپنے کمرے میں آ گئی، زاہدہ کچھ دیر بعد اس کے لئے فریش جوس لائی تو اس نے حمدان کا پوچھا۔

"بابا تو کب سے صاحب کے پاس ہے۔"

وہ خاموش ہو گئی، رات کو وہ جب تک جاگتی رہی، وہ کمرے میں نہیں آیا تھا، صبح اس نے دیکھا وہ کروٹ لئے سو رہا تھا اس کی آنکھیں بھر آئیں، وہ دن یاد آیا، جب اسے پہلی بار دیکھا تھا۔

☆☆☆

وہ ڈیڈ کا پی اے تھا وہ ان کے آفس گئی تھی، بلکہ وہ خود اسے اپنے ساتھ لے کر آنے لگے تھے، وہ کسی کام سے اندر آیا تھا، وہ جو ڈیڈی سے ایک کسٹمر سے متعلق اپ ڈیٹس لے رہی تھی، اسے دیکھ کر نظر ٹھٹک گئی تھی، وہ صاف رنگت اور تیکھے

نقوش کا بہت خوبصورت نوجوان تھا، بہت سنجیدہ اور ریزرو بھی، ڈیڈ نے اس کا تعارف کروایا، اور بتایا کہ اب وہی زیادہ تر آفس کے معاملات دیکھے گی، ایان نے اس کی طرف دیکھا، وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی، نظر ملنے پر وہ ہلکا سا مسکرایا اور سر کو خم کیا، اتنی تیز چمکتی ہوئی ساحر آنکھیں، وہ تو جیسے انہی میں تحلیل ہو گئی تھی، آہستہ آہستہ رفتہ رفتہ وہ اس کے سحر میں جکڑی جانے لگی، یہاں تک کہ جب ڈیڈ نے اس کے سامنے دو تین پرپوزلز رکھے تو وہ چپ ہو گئی۔

"کیا بات ہے شاہین، یہ ایسے چپ ہو جانے کا کیا مطلب لوں میں؟"

"کچھ نہیں ڈیڈ، بس یونہی۔"

"کیا یونہی، میں آپ کا صرف ڈیڈ تو نہیں ہوں، دوست بھی تو ہوں، اگر کہیں کمٹمنٹ ہے تو مجھ سے مت چھپاؤ۔"

"آپ مان جائیں گے؟" اس نے جھجک کر کہا، وہ چونکے، یعنی واقعی کوئی تھا۔

"کون؟" انہوں نے بغور اسے دیکھا اور جب اس نے ایان کا نام لیا تو وہ سوچ میں پڑ گئے، چونکے اس لیے نہیں کہ انہیں اندازہ تو ہو گیا تھا کہ جو کوئی بھی تھا اسٹیٹس میں ان کا ہم پلہ نہیں ہے، ورنہ شاہین جھجکنے کی بجائے پر اعتماد ہوتی۔

"آپ کو برا تو نہیں لگا ڈیڈ۔" ان کی خاموشی سے اسے گھبراہٹ ہوئی۔

"نہیں بیٹا، بس آپ مجھے کچھ وقت دیں پھر میں آپ سے فائنل بات کروں گا۔"

پھر تقریباً ڈیڑھ ہفتے بعد انہوں نے اسے بلایا تھا۔

"میں نے ایان سے بات کر لی ہے، انشاء اللہ کچھ ہی دنوں میں آپ کی شادی طے پا جائے گی، آپا اور سنبل سے میں نے بات کر لی ہے اب بس یامین بھائی اور یوسف بھائی سے بات کر کے معاملات کو فائنل کرنا ہے، سنبل آ کر آپ کو شاپنگ کے لیے لے جایا کریں گی، آپ ہر چیز اپنی پسند سے لینا ہوں۔" وہ مسکرائے تھے، وہ بہت خوش تھی، بہت زیادہ، بہت زبردست طریقے سے ان کی شادی ہوئی تھی اور ایان ان کے گھر شفٹ ہو گیا تھا، کتنے ہی دن اسے یقین کرنے میں لگ گئے کہ وہ واقعی اس کا شوہر بن چکا ہے، اس کے ساتھ رہ رہا ہے، ڈیڈ نے انہیں ہنی مون کے لیے سوئٹزرلینڈ بھجوایا تھا، وہاں سے آنے کے کچھ ہی عرصے بعد ریان کی خوشخبری ملی تھی اور جب ریان پیدا ہوا تو کتنے دن اس کی پیدائش کی خوشی منائی جاتی رہی تھی، ڈیڈ نے بڑے بڑے فنکشن کیے تھے، سنبل آنٹی سے کہہ کر ڈیڈ نے سلمیٰ کو رکھوایا تھا، کیونکہ وہ شاہین کو بچے کے لیے بھی پریشان نہیں دیکھ سکتے تھے، ریان ایک سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ ڈیڈ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں دنیا ہی چھوڑ گئے، وہ تو صدمے سے پاگل ہو جاتی اگر ایان اسے نہ سنبھالتا تو، اس کی محبت اور توجہ اسے پھر سے دنیاداری کی طرف کھینچ لائی تھی، عالیان کی پیدائش نے تو اسے خاصا مصروف کر دیا تھا، اس کی والدہ کی وفات کے بعد ڈیڈ نے اسے جس پیار سے پالا تھا، اس کی مثال ملنی مشکل تھی، اب بھی ڈیڈ کو یاد کر کے اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

☆☆☆

منہ دھو کر فریش ہو کر وہ باہر آ گئی تھی، سلمیٰ لاؤنج میں ٹی وی دیکھتے ہوئے ناشتہ کر رہی تھی، حمدان پاس رکھی کیری کاٹ میں موجود تھا۔

"السلام علیکم میم۔" وہ احتراماً اٹھنے لگی تھی، مگر شاہین نے اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا، زاہدہ اسے دیکھتے ہی لپک کر آئی تھی۔

''ناشتہ بناؤں باجی؟''

''بس ایک کپ چائے۔''

ایان تیار ہو کر آیا تو حمدان پر جھک گیا، بہت نرمی سے اسے اٹھا کر چوما اور بازوؤں میں لئے صوفے پر بیٹھ گیا، زاہدہ چائے لے کر آئی اور شاہین کے آگے رکھ کر ایان سے ناشتے کا پوچھ کر کچن میں چلی گئی، ایان نے شاہین کو دیکھا جو بے نیازی چائے پی رہی تھی، نظریں ٹی وی پر تھیں، سنبل اپنی ٹرے لے کر کچن میں چلی گئی تھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟'' ایان نے بہت نرمی سے اس سے پوچھا تھا، اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''میں آپ سے پوچھ رہا ہوں شاہین؟'' وہ اب بھی چپ رہی، ایان نے حمدان کو واپس کیری کاٹ میں ڈالا اور اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''آپ کو کیا لگتا ہے کہ آپ مجھ سے بات نہیں کریں گی تو میں بھی خاموش ہو جاؤں گا، نہیں ہرگز نہیں، میں اب یہیں بیٹھا ہوں، جب تک آپ مجھ سے بات نہیں کریں گی ورنہ اب میں اگر چلا گیا تو پھر واپس یہاں کبھی نہیں آؤں گا اور آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں بلاوجہ کوئی بات نہیں کرتا۔'' شاہین نے بے اختیار اسے دیکھا تھا، وہ اس کے اتنے قریب بیٹھا تھا، اس کا لمس، اس کی خوشبو اس کے احساسات پر حاوی ہو کر پہلے ہی اسے کمزور کیے رہی تھی، اس پر اس کی دھمکی، وہ اندر سے گھبرا گئی، اسے دیکھا، وہ کتنا کمزور لگ رہا تھا، تھکا تھکا سا، بڑھی ہوئی شیو، آنکھوں کے گرد حلقے، شاہین کے دل کو کچھ ہوا تھا، اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر ایان نے دوبارہ پوچھا۔

''کیسی طبیعت ہے؟''

''ٹھیک ہوں۔'' نقاہت زدہ حزین سی آواز، زرد رنگت اور بہت کمزور، پہلے والی شاہین کا سایہ دکھ رہی تھی، دکھ سے اس کے ہونٹ بھینچ گئے تھے، اگلی بات کرنے میں دقت پیش آئی تھی۔

''آئیں ناشتہ کریں۔'' کچھ دیر بعد اس نے کہا تو وہ بدقت اٹھی اس کا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا کچھ بھی کھانے کو، پر کیا کرتی اس نے دھمکی ہی ایسی دی تھی، اتنے دنوں سے اس کے خلاف کتنا غصہ تھا اس کے اندر پر ایک دھمکی نے ہی اس کے کل پرزے سیدھے کر دیئے تھے۔

ایان نے اسے خود ناشتہ کروایا تھا، سلائس پر مکھن لگا کر، بوائل ایگ کا کانٹے میں پرو پرو کر اسے کھلاتا رہا، ناشتے کے بعد وہ اسے اپنے ساتھ لگائے کمرے میں لایا تھا اور کمرے میں آتے ہی اپنے سینے سے لگا لیا۔

''ابھی تو میں آفس جا رہا ہوں، مل کا چکر بھی لگانا ہے، شام میں جلدی آ جاؤں گا، پھر آپ کو ایک جگہ لے کر جانا ہے، اچھی سی تیار ہو جائیے گا، اوکے اللہ حافظ۔'' اس کے بالوں کو نرمی سے چھو کر وہ چلا گیا اور وہ حیران پریشان بیٹھی سوچتی رہ گئی کہ وہ اسے کہاں لے جانے والا ہے، شام میں اس سے بھی پہلے بچے تیار ہو گئے، ایان کے ساتھ وہ تینوں اس چھوٹے سے بنگلا نما گھر میں آئے تھے، ہر چند ایان اسے سہارا دے کر اندر لایا تھا، پھر بھی اتنا چل کر اس کی حالت غیر ہو گئی تھی، ایان نے اسے صوفے پر بٹھایا، بچے بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئے تھے، وہ خود اندر چلا گیا تھا، واپس آیا تو گلاس میں جوس تھا، شاہین نے پیا تو اس کی جان میں جان آئی تھی، وہ اتنی دیر میں پھر اندر چلا گیا تھا، واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر عورت اور...... شاہین کو بیٹھے بیٹھے کرنٹ لگا تھا، وہ وہی لڑکی تھی جو سچ مچ شاہین کے لئے

ایک امتحان ثابت ہوئی تھی، خاتون کو اس نے کندھوں سے تھام کر احتراماً صوفے پر بٹھایا تھا اور لڑکی سے مخاطب ہوا۔

''تم خود کرواؤ گی اپنا تعارف یا میں کرواؤں؟'' وہ مسکرا رہا تھا۔

''آپ کروا دیں۔'' وہ بھی مسکرائی، شاہین کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

''اب کیا سننے کو ملنے والا ہے، کیا کہہ کر وہ تعارف کروانے والا ہے؟''

''شاہین ان سے ملئے یہ میری امی ہیں، یعنی آپ کی ساس اور یہ میری چھوٹی بہن ہے ذونیرہ اور تم تو پہچانتی ہو اپنی بھابھی کو؟'' شاہین کو تو لگا چھت اس کے سر پر آ رہی ہو۔

''بہن، ماں؟'' وہ کیا سوچے بیٹھی تھی اور یہ کیا نکلی۔

''السلام علیکم بھابھی۔'' ذونیرہ اس کے قریب آ گئی تھی، وہ تو اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کر پائی تھی کہ ایان نے ذونیرہ کو مخاطب کیا تھا۔

''آگے ہو کر ملو، دیکھو تو رہی اپنی بھابھی کی حالت۔'' شاہین ابھی تو ذونیرہ اس کے گلے لگ گئی، پھر وہ ایان کی والدہ کی طرف بڑھی، انہوں نے اسے لپٹا کر بہت پیار سے دونوں گالوں کو چوما تھا۔

''ریان، عالیان آپ نہیں ملو گے اپنی گرینی اور آنٹی سے۔''

''یس پاپا۔'' وہ آگے بڑھے تو ذونیرہ نے دونوں کو لپٹا لیا، باری باری ان کے گال چومے، ایان کی امی نے تو ان کے چہرے پر بوسوں کی بارش ہی کر دی تھی۔

''کوئی گرینی ورینی نہیں، میں آپ کی دادو ہوں۔''

''اور میں پھپھو۔'' ذونیرہ بھی چہکی تھی۔

''اور ایک چاچو بھی ہیں جو آج کل آسٹریلیا میں ہوتے ہیں۔''

''آپ کیا لیں گی بھابھی، آپ کے لئے کیا لاؤں۔''

''کچھ بھی۔'' وہ مسکرائی، دل سے مسکرائی تھی اس بار، کیونکہ دل و دماغ ہلکے پھلکے ہو چکے تھے، سب کچھ اتنا اچھا لگ رہا تھا، ہر فکر اور ہر بدگمانی دور ہو چکی تھی۔

''میں نے تو ایان سے بہت کہا کہ مجھے ملوانے لے چلو، شاہین ٹھیک نہیں ہے، چھوٹا بھی ٹھیک نہیں تھا اسے بھی دیکھ لیتی پر یہ مانا ہی نہیں۔'' حسرت اور مایوسی تھی ان کے لہجے میں، شاہین نے محبت سے ان کے ہاتھ دبائے۔

''آپ ابھی چلیں ہمارے ساتھ اور اسے دیکھ لیں۔''

''میں اسے بھی لے آتا، مگر وہ بہت ہی کمزور ہے۔''

''ستو اتنا بچہ ہے، کمزور تو ہو گا بس اللہ تعالیٰ زندگی دے، صحت تو بن ہی جائے گی، پھر ماں کا حال دیکھو تو بچے کا کیا حال ہو گا، وہ تو سمجھ آ ہی رہا ہے۔''

''آپ ہم سے پہلے کیوں نہیں ملیں، یوں الگ اور اجنبی بن کر کیوں رہیں؟'' شاہین نے آخر وہ سوال کیا جو کب سے دل میں کلبلا رہا تھا، وہ چپ ہو کر ایان کو دیکھنے لگیں، وہ مسکرایا۔

''میں آپ کو گھر چل کر سب بتا دوں گا۔''

''آپ الگ کیوں رہتی ہیں، ہمارے ساتھ کیوں نہیں رہتیں؟''

''ایان نے کبھی کہا ہی نہیں۔'' وہ ہلکا سا مسکرائیں۔

''کیوں آپ نے کیوں نہیں کہا؟'' وہ اس کی طرف مڑی۔

"کہا تھا گھر چل کر بتاتا ہوں۔" وہ اسی طرح تحمل سے مسکرایا تھا۔

"میرا فرینڈ ہے زاوار، اس کی گرینی اور آنٹی، انکل، گرینڈ پا سب ساتھ رہتے ہیں، تو آپ کیوں نہیں ہمارے ساتھ رہتیں۔" ریان نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر پوچھا تو انہوں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا، ان کی آنکھیں بھر آئی تھیں ایان نے ان کا سر چوما۔

"امی پلیز۔" ساتھ ہی ان کا کندھا دبایا، انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر آنکھیں پونچھ لیں۔

"اب ہمیں اجازت دیں امی، چھوٹا حمدان گھر چھوڑ آئے ہیں۔" وہ اٹھ گئیں۔

"ہاں بیٹا اب تم لوگ جاؤ۔"

"آپ کے بغیر کیسے چلے جائیں؟" شاہین نے ان کے کندھے کے گرد بازو پھیلایا، انہوں نے محبت سے اسے گلے لگا لیا، ذونیرہ چپ کی کھڑی تھی، ایان نے اس کا سر تھپکا۔

"اوکے ذونی، اوکے امی Hey gays please come on۔"

بچے ان سے مل کر باہر چلے گئے، شاہین منتظر نظروں سے امی کو دیکھ رہی تھی، وہ نرمی سے مسکرائیں۔

"پھر آؤں گی، بعد میں، ابھی تو جاؤ، تھک بھی گئی ہوگی۔" ایان نے مسکرا کر ماں، بہن کو اللہ حافظ کہا اور شاہین کو سہارا دے کر گاڑی میں لا بٹھایا۔

رات کو فرصت ملتے ہی وہ شروع ہو گئی۔

"اب آپ مجھے بتائیں کہ یہ کیا مسٹری ہے، آپ نے یہ کیا ڈرامہ کیا اور کیوں؟! اگر میری سسرال میں کچھ رشتے موجود ہیں تو انہیں اتنا عرصہ مجھ سے چھپائے رکھنے کی کیا وجہ تھی؟"

"ہماری شادی کے وقت ڈیڈ نے کچھ شرائط رکھی تھیں جن میں ایک یہ تھی کہ میں کبھی بھی تمہیں اپنی فیملی کے متعلق نہ بتاؤں، کہ چونکہ آپ اکیلی رہنے کی عادی ہیں تو بہت ممکن ہے کہ آپ دوسرے لوگوں کے ساتھ ڈسٹرب ہو جائیں تو آپ کو ان خواہ مخواہ کے جھنجٹوں میں نہ ہی پھنساؤں تو بہتر ہوگا، میں یہ شرط کبھی نہ مانتا اگر...... خیر میں یہاں اکیلا ہی رہ رہا تھا، امی ابو اور بہن بھائی سب تو قریبی گاؤں میں رہتے تھے، وہ اپنا گھر بستی چھوڑ کر ویسے بھی یہاں نہ آتے، میں ان کی اجازت سے ہی یہاں رہنے پر رضا مند ہوا تھا، ابو کی وجہ سے مجھے بے فکری تھی، پر اب ابو کی ڈیتھ کے بعد شایان کو آسٹریلیا میں اسکالرشپ پر مزید تعلیم کی آفر ہوئی تو وہ ہچکچانے لگا، ادھر امی کی طبیعت بھی خراب رہنے لگی، انہیں دل کی تکلیف اور شوگر دونوں ہو گئی ہیں تو میں نے شایان کو سمجھا بجھا کر بھیجا اور امی اور ذونی کو یہاں لے آیا، کیونکہ میں بار بار گاؤں نہیں جا سکتا اور بیمار ماں اور جوان بہن کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا، میں آپ کو ان کے بارے میں بتا کر ان سے ملوانا چاہتا تھا، وہ بے شک یہاں نہ رہتیں لیکن آپ اور بچوں سے مل بھی لیتیں تو کتنی خوش رہتیں لیکن آپ مجھے، میری ہی بہن کے ساتھ دیکھ کر غلط فہمی کا شکار ہو گئیں اور پھر جو ہوا وہ اتنا خوفناک تھا کہ میں تصور بھی کروں تو پسینے آ جاتے ہیں۔"

"کیوں...... کیوں پسینے آتے ہیں، اپنے بچے کے لئے؟" اس کے لہجے میں ناراضگی محسوس کر کے وہ ہنس پڑا تھا۔

"اف یہ غلط فہمیاں پلس بدگمانیاں کہاں ختم ہوں گی آخر؟"

"تو آپ امی کو مجھ سے ملوانے کے لئے

کیوں نہیں لائے؟"
"امی نے مجھ سے بہت اصرار کیا کہ میں انہیں آپ سے ملوانے لے چلوں، میں آپ کی طبیعت کا بہانہ بنا دیتا، کیسے بتاتا کہ آپ تو اتنی بد گمان ہیں کہ مجھے تک دیکھنا نہیں چاہتیں۔"
"آپ آج مجھے سچ سچ بتا دیں کہ آپ کو ڈیڈ نے Insist کیا تھا مجھ سے شادی کے لئے؟"
"Insist؟" اس نے بے یقینی سے دہرایا۔
"وہ مجھے کیسے Insist کر سکتے تھے اگر میں خود ہی انٹرسٹڈ نہ ہوتا تو، آپ کیا یہ سمجھتی ہیں کہ آپ سے شادی ڈیڈی کے دباؤ کا نتیجہ تھی؟"
"یعنی میری محبت اتنی ارزاں تھی کہ دس سالوں میں آپ کو اپنے وجود کا احساس ہی نہ دلا سکی۔" ایان کی آواز میں گلہ تھا۔
"ساتھ رہنے سے تو جانور سے بھی انس ہو جاتا ہے۔"
"اپنے آپ کو جانور سے تشبیہ مت دیں، یقیناً ساتھ رہنے سے، آپ کی بہترین عادتوں کو پسند کرنے سے یہ محبت مزید بڑھی ہے، ہونے کو تو پہلی نظر میں ہی ہو گئی تھی، جب باس نے اپنی حسین بیٹی سے میرا تعارف کروایا تھا، نیندیں آنکھوں سے روٹھ گئی تھیں، دل بار بار بہانے بہانے سے اسے دیکھنے کے لئے مچلنے لگا تھا، وہ اپسرا بھی میرے لئے ہی کچھ محسوس کرتی ہے، ابھی اس احساس کو پوری طرح انجوائے بھی نہ کر پایا تھا کہ باس نے مجھے اپنے پاس بلایا، پہلے یہ بتایا کہ انہوں نے میرے متعلق تمام معلومات کر لی ہیں جو کہ تسلی بخش ہیں اور اس تحقیق کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنی بیٹی کا پروپوزل دینا چاہتے ہیں، مگر ساتھ ہی کچھ شرائط بھی تھیں کہ ان کی بیٹی رخصت نہیں ہو گی بلکہ مجھے ان کے گھر آنا پڑے گا اور یہ صرف میرے لئے نہیں بلکہ کوئی بھی نوجوان جو شاہین سے شادی کا خواہش مند ہوتا، اس کے لئے یہ شرائط لازمی تھی اور ان کی بیٹی چونکہ تنہائی اور سکون کی عادی ہے، اس لئے اسے نئے نئے رشتوں میں نہ الجھایا جائے، میرا دل اگر مجھے مجبور نہ کرتا تو میں ان شرائط پر کبھی رضامند نہ ہوتا، امی کو میں نے آپ کی تصویر دکھائی تھی جو ڈیڈ نے مجھے دی تھی، امی نے ایک نظر تصویر پر ڈالی اور دوسری مجھ پر اور مسکراتے ہوئے کہا۔
"اللہ تمہیں خوش رکھے، بہت ہی پیاری لڑکی ہے۔" انہوں نے میرے چہرے میری آنکھوں سے سب بھانپ لیا تھا، میں اپنے قول کا پابند تھا ورنہ میرے بچوں کی پیدائش پر میرے والدین اور بہن بھائی جتنے خوش ہوتے تھے، وہ دیکھ کر میرا دل بجھ جاتا تھا، ازالے کے لئے میں بہت ساری تصویریں اور ویڈیوز بنا کر انہیں دکھا دیتا تھا، اس دن جب آپ نے مجھے ذونیرہ کے ساتھ ہاسپٹل میں دیکھا تھا، اس دن امی کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا، ان کی حالت بہت سیریس تھی، اس سے پہلے بھی جب میں میٹنگ میں تھا اور ذونیرہ کا فون آیا تھا، امی بے ہوش ہو گئی تھیں، میں اب اس کشمکش سے خود بھی تنگ آ گیا تھا اور آپ کو سب بتانا چاہتا تھا کہ یہ سب ہو گیا اور مجھے تو یہ افسوس مارے ڈال رہا ہے کہ جس کے لئے یہ سب کیا، اپنی عزت نفس بھی قربان کر دی، اسے میری محبت کا یقین ہی نہیں ہے۔"
شاہین شاکڈ بیٹھی یہ انکشافات سن رہی تھی، کیسی نئی نئی باتیں کر رہا تھا وہ، وہ جو ہمیشہ اتنا سنجیدہ، اتنا لیا دیا رویہ رکھنے والا، کہ وہ چاہ کر بھی اس کے ساتھ کبھی بے تکلف نہیں ہو پائی تھی، کہ دل کی کوئی بات ہی کر سکے، اسے تو اندر سے یہ احساس جرم کھائے جاتا تھا کہ اس نے ڈیڈ کے سامنے ایان کے لئے پسندیدگی ظاہر کی اور انہوں

نے کسی بھی طرح دیان کو راضی کر کے اس کے ساتھ شادی کے بندھن میں باندھ دیا اور وہ بارے باندھے یہ بندھن نبھانے پر مجبور تھا، پتا نہیں اس کا ماضی کیا تھا، وہ کسی کو پسند تو نہیں کرتا تھا، وہ کسی سے منسلک تو نہیں تھا، اس لیے کتنے ہی سوالات اس کے اندر اودھم مچائے رکھتے تھے پر اسے کھونے کے ڈر سے، وہ انہیں کبھی زبان تک نہ لائی تھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہیں، یقین نہیں آرہا؟"

"پہلے بھی آپ نے اپنی محبت کا یقین دلایا بھی تو نہیں؟"

"یہ تو آپ کی زیادتی ہے، ورنہ یہ آپ کی محبت ہی ہے کہ میں آپ کو کسی تکلیف میں دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر ... تھا، کبھی کسی چیز کے لیے آپ کو مجبور نہیں کیا ..." وہ رکا، شاہین نے سوالیہ اسے دیکھا، وہ ا... آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ... معنی خیز انداز میں مسکرایا تھا۔

"ایسی حسینہ عالم پری جیسی بیوی میرے پہلو میں موجود ہوتی تھی اور میں اسے ڈسٹرب نہ کرنے کے لیے خود پر کڑے پہرے بٹھایا کرتا تھا، یہ کسی مرد سے پوچھا جائے تو پتا چلے کہ کتنا مشکل کام ہے۔" شاہین کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا، وہ بے اختیار ہنسا تھا۔

"شادی کے دس سال بعد بھی آپ شرماتی ہوئی کتنی پیاری لگتی ہیں، میں کیسے بتاؤں؟" وہ اس کی طرف جھکا، وہ گھبرا گئی۔

"آ..... آپ امی اور ذونی کو یہاں لے آئیں نا پلیز، ہمارے گھر بھی تو کچھ رونق ہو جائے گی، میں اور بچے تو سارا دن بور ہی ہو جاتے ہیں۔"

"تو ڈیڈ کے وعدے کا کیا ہوگا؟"

"پلیز آپ مجھے مزید شرمندہ مت کریں۔

پتا نہیں ڈیڈ نے ایسا کیوں کیا، اکلوتی بیٹی میں بیچارہ رہ کر ماں کی کمی، بہن بھائیوں کی کمی سب محسوس تو کرتی مگر ڈیڈ سے ذکر نہیں کرتی تھی کہ وہ دکھی نہ ہوں اور وہ سمجھتے ہیں اسی طرح خوش رہتی ہوں ورنہ میرا رویہ تو کبھی کسی رشتے دار سے برا نہیں تھا، اس کے تو آپ بھی گواہ ہیں۔"

"بالکل گواہ ہوں، کہ ایک رشتے دار کے ساتھ تو آپ کا رویہ بہت غلط تھا۔" شاہین ہکا بکا رہ گئی۔

"کون، کس کے ساتھ؟" اس نے اپنے سینے پر انگلی رکھی۔

"میرے ساتھ۔"

"کیا غلط کیا میں نے آپ کے ساتھ؟" رنج سے اس کی آواز بھرا گئی۔

"مجھ ... کو ... کر ... کر دا کر میرے سامنے ہر طرح کے ناز و انداز دکھا کر بڑی بے نیازی سے سو جاتی تھیں، کبھی یہ سوچا کہ میرے اندر کیا ہیجان برپا ہو رہا ہے، کبھی میرے جذبات کا اندازہ کر کے خود سے قریب آئیں۔"

"اف اسے روکنا ضروری تھا، وہ سرخ چہرے کے ساتھ تیزی سے اٹھ گئی۔"

"حمدان رو رہا ہے شاید۔"

"تو سلمیٰ کس مرض کی دوا ہے، آپ یہیں بیٹھیں آرام سے۔" وہ بھی سب سمجھتا تھا، شاہین نے بے بسی سے ہاتھ مسلے۔

"امی اور ذونی۔"

"انہیں کل چل کر لے آئیں گے، ہوں اب صرف اپنی باتیں۔" ہار کر شاہین نے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا، سکون، خوشی، سکھ کا ایک احساس تھا جو روانی سے اس کے اندر اترتا جا رہا تھا۔

اک فسانہ درد کا

رمشا احمد

زندگی بھی انسان کے ساتھ کبھی کبھی عجیب مذاق کرتی ہے، صرف مذاق نہیں کرتی بلکہ اسے مذاق بنا دیتی ہے اور وہ ساری زندگی جوکر بنا دوسروں کی ہنسی کا سامان کرتا رہتا ہے، یہ تقدیر ہی ہے جس کی اتنی زیادتی کے باوجود انسان اس کے سامنے بے بس ہے، اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، صرف شکوہ کرتا ہے یا برا بھلا کہہ کر رہ جاتا ہے اور تقدیر انسان کی بے بسی پر مسکراتی ہے۔

کوؤں کے کوسنوں سے ڈھور نہیں مرتے اسی طرح بندہ بھی تقدیر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، کیونکہ اس سے زیادہ طاقتور چیز اس دنیا میں کوئی نہیں ہے اور انسان کے طعنے، کوسنے اور بد

دعائیں اس کے منہ پر واپس آکر لگتے ہیں۔

کہتے ہیں انسان اپنی تقدیر خود بناتا ہے، اس میں بھی کافی حد تک سچائی ہے کیونکہ جتنا ظلم بندہ خود اپنے اوپر کرتا ہے اتنا شاید ہی کوئی دوسرا اس پر کرتا ہو، لیکن مصیبت یہ ہے کہ اسی صورت میں انتقام لینے کے بجائے پچھتاوے اس کا مقدر بن جاتے ہیں اس کی ایک زندہ و جاوید مثال میں ہوں، میں یعنی عدیل بخاری۔

ایک منٹ پہلے میں اپنا تعارف کروا دوں، پھر آپ کو اپنے اوپر گزرنے والے سانحے کی روئیداد سناتا ہوں، جیسا کہ آپ کو بتا چکا ہوں میرا نام عدیل بخاری ہے، دو سال پہلے ایم ایس سی فزکس کر کے پاکستان کے چند خوش نصیب (صرف اس حد تک) نوجوانوں کی طرح بغیر کسی خواری کے ایک اچھی پوسٹ پر کام کر رہا ہوں، حیرت انگیز بات ہے کہ مجھے جاب حاصل کرنے کے لئے کسی بھی قسم کی رشوت یا سفارش کی ضرورت نہیں پڑی۔

بچپن ماما کے لاڈ پیار (بجا) اور ڈیڈی کی سختیوں (بے جا) کو جھیلتے گزرا، ڈیڈی جس بات پر ناراض ہوتے ماما کے لئے وہی بات قابل فخر ہوتی جس وجہ سے وہ ڈانٹ رہے ہوتے اسی وجہ پر ماما کی محبت میں اضافہ ہوتا، جس فعل پر چٹاخ چٹاخ تھپڑ پڑتے اسی فعل پر چٹاخ چٹاخ بوسے ملتے، اب آپ خود ہی غور کریں اس صورتحال میں میری تربیت کیسی ہوئی ہوگی، یا تربیت ہوئی بھی ہوگی یا نہیں، یہی وجہ تھی کہ میں نہایت بودی اور ان کانفیڈنٹ شخصیت کا مالک تھا، خود اعتمادی کی کمی نے عجیب گھونچو سا بنا دیا تھا، اس قدر بیبا بچہ کہ جس نے جہاں بٹھا دیا وہیں بیٹھا رہتا تاوقت یہ کہ بٹھانے والا خود ہی اٹھنے کا نہ کہہ دے، سکول میں بچوں کے ہاتھوں تختہ مشق بنا رہتا، ہر دوسرے دن کسی نہ کسی سے مار کھا کر آ جاتا، ٹیچر اگر کچھ پوچھ لیتیں تو حلق خشک ہو جاتا، آنکھیں باہر کو ابل آتیں ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے، مجبور ہو کر ٹیچرز نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا، اسی بودے پن کی وجہ سے دو مرتبہ اغواء ہوتے ہوتے بچا۔

بچپن میں بھی کبھی شرارت نہیں کی، میں شرارت کر بھی کیسے سکتا تھا جب صورتحال میرے گھر جیسی ہو، لیکن مجھ سے تو جوانی میں بھی کوئی شرارت سرزد نہ ہو گی، ایک مرتبہ یونہی بڑی پھپھو کی بیٹی مونا کی چوٹی کھینچ لی، ایک ہفتہ تک ڈیڈی کی ناراضگی برداشت کرنی پڑی، آخر کتنی منتوں سے ماما کو منایا اور یقین دلایا کہ یہ محض شرارت ہی تھی اور چوٹی کھینچنے سے مونا کے جملہ حقوق بحق عدیل بخاری ہرگز محفوظ نہیں ہوتے، پھر کہیں جا کر ماما کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔

دراصل انہیں پھپھو کی وہ فاتحانہ مسکراہٹ تپا رہی تھی (جو ان کے علاوہ کسی نے دیکھی)، ساری زندگی کم دکھ دیئے ہیں کہ اب بیٹی کے ذریعے وہ ان کا بیٹا چھین لینا چاہتی تھی، ان کی زندگی کا محور امیدوں کا مرکز، دراصل ماما اور پھپھو کی آپس میں بھی نہیں بنی، (نند بھاوج کی ازلی چپقلش) اس لئے ماما کو ان کی مسکراہٹ مکارانہ، طنزیہ ہی لگی۔

یہ تو میرے اس فعل پر ماما کا ردعمل تھا، لیکن ڈیڈی تو ان سے بھی دو ہاتھ آگے رہے، فوراً مجھے بلوایا اور مونا کے بارے میں رائے مانگی، میں بونقوں کی طرح ان کی شکل دیکھنے لگا، چند سیکنڈ تک جواب کا انتظار کیا، پھر ان کے برداشت کی حد ختم ہو گئی، چلا کر بولے۔

''میں کیا بکواس کر رہا ہوں؟'' ان کے چلانے سے تو پہاڑ کا کلیجہ لرزتا تھا میں تو پھر ایک

کمزور دل کا بزدل لڑکا تھا، فوراً تھر تھر کانپنے لگا اور خود کو دل ہی دل میں کوسنے لگا جب یہ خوفناک خیال (چوٹی کھینچنے والا) میرے دل میں آیا۔

''جواب دو؟'' وہ پھر چیخے اور میری ٹانگوں میں جان نہ رہی، دھڑام سے زمین پر بیٹھ گیا، میرے اس طرح بیٹھنے سے ان کا غصہ مزید بڑھ گیا اور وہ چیختی آواز میں جانے کیا کہنے لگے۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا بس یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں ایک ٹوٹی پھوٹی کشتی میں ہوں اور اچانک سمندر میں طوفان آ گیا ہے اور کشتی ادھر ادھر ڈول رہی ہے، ہچکولے کھا رہی ہے، واقعی ڈیڈی اس وقت ہر چیز تہس نہس کر دینے والا طوفان لگ رہے تھے، لیکن ان کے آخری الفاظ نے بھنور کا کام کیا جس میں، میں دھنستا چلا گیا، ان کے آخری الفاظ جو باہمی ہوش و حواس میرے کانوں نے سنے وہ یہ تھے۔

''چونکہ لڑکی تمہاری وجہ سے سب کی نظروں میں آ گئی ہے (شکر ہے بدنام نہیں ہوئی) تم نے جو حرکت کی ہے وہ ناقابل معافی ہے (کیونکہ میں آپ کا بیٹا ہوں) اور تمہیں اس کی سزا ملنی چاہیے (دفعہ ۳۰۲ یا دفعہ ۳۰۶) لیکن چونکہ تم میرے بیٹے ہو اور مجھے تم سے محبت ہے (اچھا) میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا، اس لئے رعایت کر رہا ہوں، اگر تمہیں واقعی موناً پسند ہے (نہیں......) تو تمہیں پہلے بتانا چاہیے تھا، ہم تمہارے والدین ہیں اور تمہاری خوشی میں خوش ہیں، (واقعی اگر خوشی کا تعلق ددھیال سے ہو) اس لئے کل ہی تمہارے لئے موناً کا ہاتھ مانگنے سعیدہ کی طرف جائیں گے (یا اللہ مدد)۔''

اس کے بعد مجھ میں تو کچھ بھی سننے کی سکت نہ رہی، لیکن ماما فوراً میدان میں آ گئیں، میری مدد سے زیادہ اپنا دفاع کرنے لگیں، اگر پھپھو کی بیٹی ان کی بہو بن جائے تو واقعی دفاع کی ضرورت تھی، دونوں طرف سے خوب گھن گرج کے ساتھ گولا باری ہونے لگی۔

ماما کا خیال تھا کہ موناً نے ہی مجھے بہکایا ہو گا، اس لڑکی کے لچھن انہیں شروع ہی سے ٹھیک نہیں لگ رہے تھے، یوں محفلوں میں گھلنے ملنے والی لڑکیاں ٹھیک نہیں ہوتیں وہ اگر اس گھر میں بہو بن کر آنے کے خواب دیکھ رہی ہے تو یہ خواب، خواب ہی رہیں گے، ایسا قیامت تک ممکن نہیں ہو گا، اس کی ڈولی اس گھر میں ان کی لاش پر سے گزر کر ہی آ سکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

ڈیڈی کی رائے کچھ مختلف تھی، ان کے خیال میں مجھ جیسا بے شرم اور بے حیا اس سے پہلے اس خاندان میں پیدا نہیں ہوا، (دراصل میں ان کی واحد اولاد ہوں) اور نہ ہی آئندہ پیدا ہو گا، (شاید انہوں نے دوسری شادی سے توبہ کر لی ہے) چونکہ میں موناً کو پسند کرتا ہوں اس لئے انہوں نے اس کا نام لیا ہے ورنہ تو وہ میرے لئے شبنم کا انتخاب کر چکے تھے، (یا اللہ خیر لیکن اب اس گھر میں موناً کے علاوہ کوئی لڑکی قدم نہیں رکھ سکتی، بہو کے روپ میں)۔

ان کے خیال میں میری اس حرکت نے ان کی عزت اور تربیت خاک میں ملا دی ہے، وہ اپنی بہن کی نظروں میں گر چکے ہیں اور سرخرو ہونے کا ایک ہی طریقہ ہے (میری قربانی)۔

ڈیڈی کو اپنی بھانجی عزیز تھی اور ماما کو اپنی، سو اس لئے موسم کی صورتحال تشویش ناک حد تک خراب تھی، مطلع ابر آلود تھا، موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، وقفے وقفے سے اولے پڑ رہے تھے، آخر کار (تھکنے کے بعد) ہلکی ہلکی بوندا باندی ہونے لگی، ڈیڈی اور ماما کی یہ سرد جنگ میری اور ماما کی صلح کے بعد بھی کافی عرصے تک جاری رہی،

اس کا اختتام تب ہوا جب ہم نے مونا کی منگنی کی مٹھائی کھائی، لیکن ایک مرتبہ پھر شبنم اپنی چھوڑی ہوئی جگہ پر واپس آگئی تھی۔

یہ تو اس وقت کی بات ہے جب میں تھرڈ ائیر کے ایگزام دے کر فارغ تھا، لیکن اس واقعے کے بعد اتنا سہا کہ کسی لڑکی کی چوٹی یا کلائی پکڑنا تو دور کی بات ان کے سامنے نظر تک نہ اٹھا سکتا۔ وہ بجائے مجھ سے ڈرنے کے بھی بھی مذاق میں مجھے ڈرا دیتیں، خاندانی تقاریب میں زور و شور سے ذاتی گفتگو میں مصروف ہوتیں۔

آہٹ پر ٹھٹک کر رک جاتیں اور جب مجھے دیکھتیں تو دوبارہ شروع ہو جاتیں، مجھ جیسی بے زبان مخلوق سے انہیں کیا جھجک ہو سکتی تھی، اپنی اس حرکت پر مجھے آج بھی اتنی ہی شرمندگی اور خوف محسوس ہوتا ہے جتنا اس وقت ہوا تھا، حالانکہ اس دن نہ تو پھپھو نے کچھ نوٹ کیا تھا نہ مونا نے برا منایا تھا، بلکہ اس نے تو اسے ایک اعزاز سمجھ لیا تھا، جب بھی میرے متعلق بات ہوتی تو وہ بڑے فخر سے کہتی۔

''عدیل نے زندگی میں صرف ایک مرتبہ اور ایک لڑکی سے مذاق کیا ہے اور وہ میں ہوں۔''

اس کی بات پر سب ہنس پڑتے اور میں زمین میں گڑنے لگتا شرمندگی سے، یہ تو خیر چار پانچ سال پہلے کی بات ہے لیکن اس مرتبہ واقعی ایک حادثہ رونما ہو گیا۔

یہ تو شاید آپ کو نہیں معلوم کہ خدا نے مجھے خاصی فرصت سے بنایا ہے، اس کا کریڈٹ بھی ڈیڈی اور ماما کو جاتا ہے کیونکہ واقعی وہ دونوں خاصے خوبصورت ہیں، ویسے بھی اس دن احمد مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اگر تم اپنے چہرے کے تاثرات میں سے حماقت ہٹا کر تھوڑا سوبر بنا لوں تو خاصی حد تک معقول نظر آؤ، یقین تو اس بات کا مجھے بھی لیکن کبھی تجربہ نہیں کیا، لیکن ایک دن موقع مل ہی گیا، ہوا یوں کہ۔

وہ ایک سہانی شام تھی، (اور آخری بھی کیونکہ اس کے بعد کوئی شام بھی سہانی نہ تھی) میں احمد سے ملنے کے لئے گھر سے نکلا، ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ میری بائیک ایک خوفناک آواز کے ساتھ بند ہو گئی، مجھے غصہ اتارنے کا حق صرف بے جان چیزوں پر تھا، سو ان کو بھی صرف گھور کر رہ جاتا ہوں، خیر ابھی میں گھور ہی رہا تھا کہ ایک گاڑی میرے پاس سے گزری، لیکن تھوڑی دور جا کر وہ رکی اور ریوائنڈ ہو کر میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔

ابھی میں گاڑی کے واپس مڑنے کے بارے میں سوچنے ہی والا تھا کہ ایک ریشم کے تاروں کی سی نرم و ملائم آواز میرے کانوں سے ٹکرائی، میں اس مدھر آواز کی سندرتا میں کھو سا گیا۔

''کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں؟'' وہ شاید میرا پریشان چہرہ دیکھ کر پوچھ رہی تھی، مجھے خیال آیا کہ پریشانی میں میرا چہرہ مزید ہونق ہو جاتا ہے، اس نے میری خاموشی کو محسوس کر کے ایک مرتبہ پھر نہایت شائستگی سے اپنا سوال دہرایا، میں چونک پڑا اور سوچا کیا جواب دوں، پھر میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ایک فیصلہ کیا خود۔

☆☆☆

''عدیل..... عدیل سن رہے ہو کہ نہیں؟'' ایک چنگھاڑتی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی، میرا حلق تک کڑوا ہو گیا، جی چاہا کہ کان لپیٹ کر سو جاؤں ان سنی کر دوں، لیکن میں مجبور تھا، بے بسی سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور بہت محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''کیا بات ہے جان؟'' اس سوال میں

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماء راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ،
سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

کتنے میزائل، ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بند ہوں گے مجھے معلوم تھا لیکن میں بے بس تھا اور یہ سوال میں نے ہر صورت پوچھنا ہی تھا۔

جواباً وہ شروع ہو گئی، میں اس کی باتوں سے زیادہ دروازوں اور کھڑکیوں کو کھڑکتے ایک دوسرے سے بجتے سن رہا تھا اور اب پتا چل رہا تھا کہ اگر ڈیڈی کی آواز میں بادلوں کی گرج تھی تو میری بیوی کی آواز میں بجلی کی تڑپ تھی، کبھی کبھی مجھے شک ہوتا کہ کہیں وہ پانی پت کے مقام پر تو پیدا نہیں ہوئی۔

وہ ماما کی کسی بات پر ناراض تھی، یہ تو سامنے کی بات تھی کیونکہ ابھی ابھی باہر ایک معرکہ ہو چکا تھا، محاذ اگرچہ پسپا ہو چکے تھے لیکن ابھی دونوں کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا، اس لئے کہ ان کی لڑائی کے دوران میں غیر جانداری سے اپنے کمرے میں بیٹھا تھا، جنگ میں شریک نہیں ہوا تھا، ان کا ساتھ نہیں دیا تھا، ماما چاہتی ہیں کہ اس کا ساتھ دوں اور بیگم چاہتی ہیں کہ ان کا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب وہ دونوں سپر ہیں تو انہیں مجھ جیسے پٹے ہوئے مہرے کی مدد کی کیا ضرورت ہے بھلا۔

ماما نے جب یہ سنا کہ بیگم اب مجھ سے مخاطب ہیں تو انہوں نے بھی کمرے میں انٹری دی، ویسی ہی انٹری جیسی شفقت چیمہ کی ہوتی تھی، بھڑک مار کے تھوڑی دیر میں تو تو میں میں ہونے لگی، پھر ماما مجھے بتانے لگیں کہ میں نے والدین کی نافرمانی کر کے جو گناہ کمایا ہے یہ عورت یعنی میری بیوی اس کی سزا ہے، ماما کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہی تھیں، اس دن جب اس نے یعنی ماہا (میری بیگم) نے مجھے لفٹ کی آفر دی تھی تو میں اس کی دلکش آواز کے سحر میں کھو سا گیا، اس کی آواز میں وہ جادو تھا کہ میں نے اس کے چہرے کی طرف دھیان ہی نہ دیا اور اگلی ملاقات کی راہ ہموار کی (ہے نہ حیرت والی بات ہو جاتا ہے ایسا بھی، کبھی کبھی)۔

اس وقت میرے دماغ نے تمام قصوں اور ناولوں، افسانوں کو جانچا اور جو طریقہ مناسب لگا اپنائی کیا، آگے اس معاملے میں احمد میرے مخلص دوست نے بھی میری بہت مدد کی اور آخر کار میں ماہا کو اپنی دلہن بنا کر اس گھر میں لانے میں کامیاب ہو گیا۔

ماما اور ڈیڈی کو بہت شاک لگا، جب میں نے انہیں اپنی پسند سے آگاہ کیا، شاید ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ میں اتنا بڑا کام (محبت) ان کی مرضی کے بغیر کر سکتا ہوں، شاید وہ ہرٹ بھی ہوئے ہوں لیکن اتنے نہیں جتنے میری ان کے مخالف پارٹی کی پسند کی ہوئی لڑکی سے شادی کر لینے کی صورت میں ہوتے، اس لئے بھی شاید میری بچت ہو گئی، ورنہ تو شاید ساری زندگی میں ان سے اپنی بات نہ منوا سکتا (کاش)۔

شروع شروع میں، میں اس کی مدبھری آواز میں کھویا رہا، لیکن آہستہ آہستہ پردہ اٹھنا شروع ہوا اور اصلیت دکھائی دینی شروع ہوئی، لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ یہ میرا اپنا کیا دھرا تھا، اس میں تقدیر کا بھی کوئی دوش نہ تھا، کیونکہ اس وقت میں نے خود یہ فیصلہ کیا تھا کہ اپنی تقدیر خود بناؤں گا، تقدیر بن تو گئی میرے ہاتھوں لیکن ناقابل برداشت، اب یہ آواز میں نے زندگی بھر سننی ہے، شادی سے پہلے جو خوش آئندہ امید تھی، وہ بھی ختم ہو گئی، یقیناً آپ کو اس وقت مجھ سے ہمدردی محسوس ہو رہی ہو گی، ہونی بھی چاہیے۔

☆☆☆

"چاچے کو میں نے آج کرنے کے لئے کہا تھا۔" وہ کچھ سوچتی ہوئی بولی۔

"تو کوئی بہانہ کر لیتا۔"

"کرنا تو پڑے گا۔" وہ بولی۔

ابھی نذیراں باتیں کر ہی رہی تھی کہ اس کی نظر باہر والے دروازے سے اندر آتی خورشید پہ پڑی۔

"چاچے نے سویرے کہا تھا کہ گھر میں چونا پھر رہا ہے میں نے سوچا تو کلی (اکیلی) ہوگی، تیرا ہاتھ ہی بٹا دوں۔"

"نہیں میں نے اور پا لطیف نے مل کر کام کر لیا تھا، پانڈے (برتن) چاچے نے کلی کروا دیئے۔"

"تو بتا خورشید کیسی گزر رہی ہے تیری۔" نذیراں نے دیوار سے اترتے ہوئے سرسری سا اس کا حال پوچھا۔

"اچھا لاجو، یاد سے چلی جانا۔" نذیراں کی آخری بات پر خورشید نے لاجو کے چہرے پہ بکھرے رنگوں کو دیکھا مگر ایسا کچھ ظاہر نہیں کیا۔

"لاجو پتر، سارا کام ہو گیا۔" پا رشید ہاتھ میں چونے والا برش پکڑے جانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔

پھر وہ چاچے کے ساتھ باتیں کرتا باہر نکل گیا، لاجو خورشید کو لے کر آگے بڑھی کہ جا من کے نیچے والے حصے پہ چونا پھیر دے سوہنا لگتا ہے۔

"پا قادر بخشا تیرے گھر کوئی بیاہ تھوڑی ہے جو تو گھر کو اتنا لشکار رہا ہے۔"

"میری دھی مجھے ست پتروں سے زیادہ افضل ہے، جب اس کا بیاہ کروں گا تو دنیا دیکھے گی، لاجو اے لاجو۔" چاچے کی بات سن کر شرمائی وہ پا رشید سے شرم کھاتی پیچھے کو ہٹ گئی پھر

مکمل ناول

نذیراں کے بلانے پہ دیوار کی طرف دیکھنے لگی جہاں وہ کھڑی تھی۔

"نیڑے (پاس) تو آ۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا پاس آنے کا۔

"کیا ہوا؟" وہ اس کے اتنی راز داری برتنے پر جلدی جلدی دیوار کے پاس آگئی۔

"جانے کیا بات ہے؟" وہ یہی سوچتی پاس آگئی۔

"افضل ملا تھا مجھے آپا جی کے گھر، وہ وہاں نوید پا جی سے ملنے آیا تھا کہہ رہا تھا کہ لاجو سے کہنا جنگل والے کھوہ پر ملے۔" چاچے کی وجہ سے وہ بہت ہولے ہولے بات کر رہی تھی چاچا بھی پا رشید کے ساتھ باتوں میں لگا اس کی باتوں پر غور نہ کر سکا۔

"میں نے تو آج کام ختم ہو جانے پر ویڑے میں مٹی کا لیپ کرنا ہے۔"

"کل کر لینا۔" نذیراں بڑے آرام سے بولی۔

"میں کسی غلط ٹیم (ٹائم) پر تو نئی آگئی، تو نے جانا ہے۔"

"میں نے..... جانا۔" وہ کہیں کھوئی کھوئی بولی تو خورشید کو کچھ کھٹکا۔

"کوئی بات ہے۔"

"نئی۔"

"مجھے بتاؤ گی نہیں، بہن کہا ہے۔" خورشید کی بات پر لاجو شرمندہ سی ہوگئی۔

"کوئی بات نہیں، وہ......" وہ بات کرتے کرتے جیسے رک گئی، چاچے کو پتہ چل گیا تو؟

"کوئی بات تو ایسی ہے جو چھپا رہی ہے، چل ٹھیک ہے تیری مرضی۔" خورشید کی بات سن لاجو کو لگا جیسے اسے برا لگا ہو، وہ اس کے پاس ہی منجی پر بیٹھ گئی۔

"کیا کروں خورشید، میں نے بہت سینت سینت کر رکھا ہے اسے اپنے دل میں، ڈر لگتا ہے اگر چاچے کو پتہ چل گیا تو۔"

"تیرے دل میں اگر کوئی بات ہے تو اسے نکال ضرور دینا ورنہ بڑا دکھ پاؤ گی۔" خورشید کی بات میں اتنی پیڑ تھی کہ لاجو کا دل دہل گیا، وہ خورشید کے منہ کی طرف دیکھنے لگی جہاں اک جھکڑ سا تھا جو جھل گیا تھا، ویران آنکھوں میں کئی داستانیں درد کی تصویر بنی سر نکالے جھانک رہی تھیں، بے رنگ و بے نور ہونٹ ہنسی کو ترسے ہوئے لگے، زرد چہرہ بہار کے ہاتھوں لٹنے کے بعد اک آس لئے جھولی پھیلائے کھڑا تھا کہ کب خوشی کے پھول کھلیں گے۔

"کوئی بات ہے؟" لاجو نے اسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا تو وہ اتھرو لڑھک کر اس کے بے رنگ دوپٹے میں جا پڑے اور وہ تو ایسے ہی کسی کندھے کو اڈیک رہی تھی جس پر سر رکھے وہ جی بھر کے رو سکے، لاجو کے گلے لگی وہ اتنا روئی کہ لاجو کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

"اسے اپنے دل کی بات نہ بتا کر میں آج تک رو رہی ہوں اور ساری حیاتی روتی رہوں گی۔" لاجو کا دلاسہ جیسے اس کے اندر پھیلے صحرا پر کسی پھوار کی طرح برسا تھا، برف سی تھی جو ہولے ہولے پانی ہونے لگی۔

"اس کا بیاہ ہو گیا ہے اس کی اک دھی ہے۔" لاجو کو لگا جیسے ایک بھاری سا پتھر میرے سینے کے اوپر آن گرا ہے اس درد کی اس پیڑ کو وہ اچھی طرح محسوس کر سکتی تھی آخر وہ بھی اپنے سینے میں اک پیار بھرا دل رکھتی تھی۔

"کون تھا وہ؟" لاجو کی بات پر اس نے جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا۔

"وہ بھی میری طرح گلے کا بڑا سریلا تھا،

میری نانی کے پاس آتا رہتا تھا، میرا دل کب اس کا ہوا مجھے پتہ ہی نہ چلا۔"
"کیا وہ بھی......"
"بس دل کی باتیں دل میں ہی رہ گئیں، میرے حصے کی خوشیاں کسی اور کی جھولی میں جا گریں گزرتا وقت اپنے پیچھے پیچھے باتوں کی اہمیت بھی ختم کرتا جاتا ہے، یہ بات اپنے بیاہ کے بعد اس نے مجھے بتائی۔" خورشید اک جھونپڑی والی، کم علم لڑکی، کتنی سمجھداری کی باتیں کررہی تھی کسی نے ٹھیک کہا ہے وقت بہت بڑا استاد ہے سب کچھ سکھا دیتا ہے۔
"وقت گزر چکا تھا، تھی تو بس پچھتاوؤں کی اڑتی ہوئی دھول جس میں اب تک میں اپنا کھویا ہوا وجود ڈھونڈ رہی ہوں اور شاید ساری زندگی ڈھونڈتی رہوں گی، کیونکہ یہ دھول مجھے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔"

☆☆☆

درگاہ پر دعا کے لئے اٹھے ہاتھ کانپ رہے تھے۔
"میرے مولا! میرا افضل میرے لئے سب کچھ ہے اس کی طرف سے مجھے کسی امتحان میں نہ ڈالنا، تیرے خزانے میں کسی شے کی تھوڑ نہیں ہے۔"
ہولے ہولے شام سلونی ہورہی تھی، افضل اسے ہی اڈیک رہا تھا، کھوہ (کنواں) عام حالات میں چلتا تھا مگر اس وقت بند تھا مگر اس کی ٹنڈوں میں ابھی بھی تھوڑا تھوڑا پانی تھا، کھوہ کے پاس اک چھوٹا سا مٹی کا بنا ہوا کوٹھا (کمرہ) تھا جس کا لکڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا، کوٹھا استعمال میں نہیں تھا اس لئے اندر جھاڑ جھنکار سر نکالے جھانک رہی تھیں، لوکاٹ کے پیڑوں نے کھوہ کو اپنے جھرمٹ میں لے رکھا تھا قریب آتی شام نے اس منظر کو بہت اداس کر دیا تھا۔
"تو اداس ہے تو لگتا ہے جیسے یہاں کی ہر چیز اداس ہو گئی ہو۔" افضل اس کی روئی ہوئی آنکھیں دیکھ کر اس کے قریب آ گیا۔
لاجو نے آتے ہی اسے ان سوجی آنکھوں کی وجہ بتا دی تھی۔
"میں تجھے اپنے دل کی بات بتا چکا ہوں، ہم دونوں اک دوسرے کو چاہتے ہیں، پریشانی کس بات کی ہے۔"
"میں تیرے سے الگ نہیں ہو سکتی۔" وہ پھر روتی ہوئی اس کے گلے جا لگی، افضل نے محبت سے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔
"کون کررہا ہے تجھے مجھ سے الگ۔"
"وقت کا کوئی بھروسہ تھوڑی ہے، بڑا کٹھور ہے وہ۔"
"وقت سے پہلے وقت سے ڈرنا، اک انسان کو اندر سے کمزور ظاہر کرتا ہے اور میری لاجو کمزور ہو جائے یہ تو میں نہیں چاہتا۔" اس نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا۔
"اس بنجارن کے ساتھ جو ہوا وہ اس کی قسمت تھی، ضرور نہیں کہ ہمارے ساتھ بھی ویسا ہی ہو۔" اس نے جیسے اسے بھرپور اپنی محبت کا یقین دلایا۔
"اب یہ رونا دھونا بند کرو اور یہ لو۔" افضل نے کچھ سامان جو قریب ہی لوکاٹ کے تنے کے ساتھ رکھا تھا اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔
"میلے پہ پہن کر ضرور دکھانا۔" لاجو نے حیرت سے افضل کی طرف دیکھا۔
"تیرے لئے لایا تھا۔"
"میرے لئے؟" اس نے پانی سے بھیگیں پلکیں اٹھائے حیرت سے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"تیرے سوا بھی یہاں کوئی ہے، میں کسی چیز کے لئے تو لایا نہیں۔" افضل نے اس روتی لڑکی کو ہنسانے کی کوشش کی تو لاجو ہنستے ہوئے دوبارہ اس کے گلے سے جا لگی۔

☆☆☆

"نذیر آج پھر آیا تھا میرے پاس افضل کے لئے۔" نمبردارنی نے افضل اکی کی بات سن کر سر اوپر اٹھایا۔

نذیر ان دونوں کے تایا کا بیٹا تھا جو بڑی دیر کا افضل کے لئے اپنی بیٹی کی بات کر رہا تھا پر نمبردارنی اندر ہی اندر اس رشتے سے راضی نہیں تھی، لڑکی چٹی ان پڑھ تھی اور شکل کی بھی بس پوری پوری تھی اور اس کا پتر پڑھا لکھا، سوہنا جوان تھا، روپیہ ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا، نمبردارنی بولی کچھ نہیں۔

"میں تو کہتا ہوں رشتہ کرتے ہی شادی بھی ہو جائے۔" نمبردار تو ایک طرح چھمی کا دھیان افضل سے ہٹانا چاہ رہا تھا، اگر اس کے دل میں ذرا سا بھی افضل کا خیال ہے تو وہ شادی کے بعد ختم ہو جائے گا چھمی جیسی بھی تھی نمبردار بری طرح مرتا تھا اس پر، وہ کسی دوسرے کے بارے میں سوچے وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

"افضل سے بات کروں گی۔" نمبردارنی کے منہ سے یہ بات نکلی تھی کہ نمبردار بھڑک اٹھا۔

"میں اس کا باپ ہوں، اس کے لئے برا کیسے سوچوں گا۔"

"ساری حیاتی گزارنی ہے اس نے، پوچھنے میں کیا ہرج ہے۔" نمبردار اس حق میں نہیں تھا کہ افضل سے پوچھا جائے، اس کی عادت سے وہ اچھی طرح واقف تھا، غصے سے بولتا وہ باہر نکل گیا نمبردار کی طرح نمبردارنی کو بھی شک تھا کہ وہ انکار کر دے گا اور وہی ہوا۔

"مجھ سے پوچھے بغیر میرے رشتے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں، میری جہاں مرضی ہو گی وہاں کروں گا۔" نمبردارنی بڑے غور سے بیٹے کا منہ دیکھتی اس کے پاس چلی آئی۔

"تو کیا تو کسی اور سے بیاہ کرے گا۔" ماں کے پوچھنے پر جیسے وہ شرمندہ ہو گیا۔

"میں کتنے دنوں کا سوچ رہا تھا کہ آپ سے بات کروں گا پر۔"

"کیا بات ہے؟"

"یہی کہ میں کسی اور سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں اس کے سوا کسی سے نہیں۔" افضل کے لہجے سے چھلکتی مضبوطی جیسے ماں کا دل لرزا گئی۔

"تجھے پتہ ہے اپنے باپ کا۔" انہوں نے جیسے اسے کچھ جتایا۔

"یہ میری زندگی کا مسئلہ ہے کوئی ایک دن کی بات نہیں، ساری زندگی گزارنی ہے، مرضی بھی میری ہو گی۔"

"ایسے نہ بول تیرے باپ کو پتہ چل گیا تو ہیری جھل جائے گی۔" نمبردارنی نے پیار سے بیٹے کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"وہ ہیری اس ہیری سے کم تباہی لائے گی جو ان کی بات ماننے پر میری زندگی میں آئے گی۔" وہ بڑے مضبوط لہجے میں بول رہا تھا، ماں کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔

"نہ میرا پتر اپنے باپ کے آگے مت کھڑے ہونا، ویسے تو میں بات کروں گی اس سے اور اگر وہ نہ مانا تو تجھے خود کو سمجھانا ہو گا۔"

"اماں میں کسی کی بات نہیں کرتا پر میں اتنا جانتا ہوں کہ اگر کوئی میری بات نہ مانے پر میری ماں ضرور مانے گی۔" وہ ان کے پاس آ کر انہیں پیار سے کندھوں سے پکڑ کر بولا، بیٹے کی محبت کے آگے ماں کا دل نرم پڑ رہا تھا۔

''جو وہ چاہتے ہیں میں ایسا نہیں کر سکتا، بیاہ وہیں کروں گا جہاں میرا دل چاہتا ہے۔'' وہ غصے میں بولتا ان کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا۔

نمبردارنی تھوڑی دیر خاموش کھڑی کچھ سوچتی رہی، خاوند اور بیٹے کے درمیان ہلکورے کھاتا دل ایک جگہ رک نہیں رہا تھا، نمبردار کا لایا رشتہ انہیں بھی پسند نہیں تھا مگر وہ یہ بھی نہیں چاہتیں تھیں کہ بیٹا باپ کے مقابلے میں کھڑا ہو، وہ چلتی ہوئی اس کے پاس آن رکی۔

''کون ہے جس نے میرے شیر کا دل جیت لیا ہے۔'' ان کی بات سن کر افضل کے چہرے پر جیسے بہار سی آن ٹھہری جو اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ افضل دل و جان سے چاہتا ہے اسے، نمبردارنی کو اس بات کی تو سمجھ آ گئی تھی کہ اب وہ پیچھے نہیں ہٹے گا آخر وہ بھی فضل الٰہی کا پتر ہے۔

''اس میں وہ سب کچھ ہے اماں جو تجھے چاہیے پڑھی بھی ہے اور سوہنی بھی، وقت آنے پر سب کچھ بتا دوں گا کہ وہ کون ہے، بس ابے کو بتا دیں گے چاچے نذیر والی بات بھول جائیں۔'' نمبردارنی نے بڑے غور سے پتر کو دیکھا جو اتنی بڑی بڑی باتیں کر رہا تھا، کب اتنا بڑا ہوا مجھے پتہ ہی نہ چلا۔

☆☆☆

نمبردار فضل الٰہی کا کاما اندر آیا بیٹھک خالی تھی نمبردار کے سوا کوئی وہاں نہیں تھا۔

''سارا کام ہو گیا ہے سرکار، جس طرح آپ نے کہا ویسے ہی کیا ہے۔''

''ٹھیک ہے اب تو جا، اب جو کرنا ہے مجھے اپنے ہی کرنا ہے۔'' نمبردار نے پچھلے کئی دنوں سے اسے کسی کام پر لگا رکھا تھا جو اس نے پورا کیا تھا اور ساری بات نمبردار کو بتا دی تھی جسے سن کر نمبردار کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی تھی، وہ غصے میں بھرا چکر کاٹ رہا تھا تبھی دروازے پر آ کر بنتو نے نمبردارنی کا پیغام دیا، نمبردارنی چہرے پر فکر کے رنگ لئے ادھر اُدھر چکر کاٹ رہی تھی۔

''کیسے بات کروں، وہ تو جانے کیا کر ڈالے۔'' نمبردار کی اک بھڑک پر سارا گھر اکٹھا ہو گیا تھا، تینوں بہویں، نوکر چاکر، لیکن پھر سب ہی تتر بتر ہو گئے، ہاں پھپھی رجو بے پسار ی میں تھی مگر اس کے کان ادھر ہی لگے ہوئے تھے، جانے کیا بات ہے جو نمبردار یوں غصہ دکھا رہا ہے۔

''یہ گھر میرا ہے اور یہاں ہونے والے سارے کاموں کے فیصلے بھی میں نے ہی کرنا ہیں۔'' نمبردار بجلی کی سی کڑک لئے بول رہا تھا، نمبردارنی تو ڈر کر سہم گئی، دہشت زدہ کر دینے والے لہجے میں بولتا وہ جیسے مارنے مرانے پر تیار کھڑا تھا، وہ بے چاری تو شادی کے پہلے دن ہی اس کی دہشت کے نیچے آ گئی تھی اور آج تک باہر نہیں نکلی تھی خوف سے اور نمبردار بھی خوب جانتا تھا کہ یہ کچھ نہیں کر سکتی سو جو مرضی کرو۔

''سمجھا دو اپنے اس لاڈلے پتر کو، میرے آگے کھڑا ہوا تو اچھا نہیں ہو گا۔''

''دیکھیں جی آپ اتنا غصہ کر رہے ہیں، بچہ ہے وہ۔'' آخر وہ ایک ماں تھی ڈر کے باوجود اپنے بیٹے کے حق میں بولنے پر مجبور ہو گئیں۔

''اپنی مرضی کرنا چاہتا ہے تو حرج ہی کیا ہے۔'' نمبردارنی کی بات پر ان کی آنکھوں میں انگارے برسنے لگے اور وہ ایسے غصے سے دیکھنے لگا جیسے ان انگاروں میں جلا ڈالیں گے نمبردارنی کو۔

''تیری اسی شہ نے بگاڑ دیا ہے اسے۔'' پھپھی کے کان ادھر ہی لگے ہوئے تھے۔

''شہ تو نہیں بس محبت ہے جو میرے پتر کے لئے میرے دل میں۔''

"تیری اسی محبت کی وجہ سے وہ میرے آگے کھڑا ہو گیا ہے۔"

"وہ آپ کا پتر ہے، آپ اسے برا نہ سمجھیں۔" وہ بے چاری جھڑکیاں کھاتی پھر بھی اس کی وکالت کر رہی تھی۔

"مجھے نہ سمجھا، میں کوئی بچہ نہیں ہوں اور بتا دینا چوہدری فضل الٰہی اپنی باتوں سے پیچھے نہیں ہٹتا۔" اتنی بات کہتا وہ کھٹ سے دروازہ کھولتا باہر نکل گیا تو جاتے جاتے نظر پیاری کے آگے کھڑی بچی پر پڑی، غصہ ماتھے کی تیوریاں بڑھا گیا اور وہ ڈرتے ہوئے دروازے کے پیچھے ہو گئی، اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے، اتنے غصے سے وہ مجھے کیوں دیکھ کر گیا ہے، میرے لئے وہ تھوڑی ایسا کر رہا ہے وہ تو اس گانے والی کے پیچھے شیدائی ہو گیا ہے، نمبردار کو یہ شک تھا کہ یہ اب مجھ سے پیچھا چھڑا کر میرے پتر پر ہاتھ صاف کر رہی ہے وہ بھی اس کے لئے میرے آگے کھڑا ہو رہا ہے، یہ کڑی مجھے چھوڑ نئی امنگوں کا سہارا لینا چاہتی ہے۔

☆☆☆

مولوی بشیر کو وہ نیند کی گولیاں زہر کی طرح لگ رہی تھیں جن کا کوئی تریاک نہیں تھا، نمبردار کے ساتھ ساتھ وہ اکبر سے ملنے جاتی بھی انہیں نیند کی گولیاں کھلا جاتی تھی، گولیوں کا استعمال بوڑھے جسم پر بڑا برا اثر کر رہا تھا، پچھلے چار پانچ دن سے وہ بستر سے جا لگے تھے، آنکھیں اندر کو چلی گئیں تھیں، کمزوری سے جسم ٹوٹتا رہتا، یہی حال ماں کا تھا، لیکن وہ ان سے تھوڑی بہتر تھیں، سہ پہر کے بعد جو بچے سپارہ پڑھنے آتے تھے اب ان کو بچی کی ماں پڑھاتی تھی اب بھی گھر میں کافی رش لگا تھا، مولوی صاحب کی چارپائی کے قریب بیٹھی وہ انہیں ہاتھ والا پنکھا جھل رہی تھیں اور بچوں کو بھی سبق دے رہی تھیں، گھر میں کام بکھرا پڑا تھا اب وہ کام کریں یا گھر والے کا خیال رکھیں، بچی گھر کے اندر آئی تو ان کا پنکھی والا ہاتھ اپنے آپ رک گیا، سوہنے صاف ستھرے کپڑوں میں وہ کوئی حور ہی لگ رہی تھی، یہ کپڑے اس نے کہاں سے لئے، سویرے تو کوئی اور کپڑے پہن کر گئی تھی۔

"کیا بات ہے اماں، کیا دیکھ رہی ہو۔" دور سے بولتی وہ اس کے پاس آ گئی اور پھر ان کی نظروں کا مطلب سمجھتی بولی۔

"نمبردارنی کی چھوٹی نو (بہو) نے دیئے ہیں یہ کپڑے، پرانے اتار دیئے نئے پہن لئے۔" وہ صفائی سے جھوٹ بولتی ان سے نظریں چرا گئی۔

"ابے کا کیا حال ہے؟" ماں نے شاید اس کا جھوٹ سچ مان لیا تھا اس لئے کوئی بھی سوال پوچھے بغیر وہ اسے ابے کے بارے میں بتانے لگی۔

اسے یہ کپڑے منشی اکبر نے دیئے تھے اور اب بھی وہ اس کی بیٹھک سے اٹھ کر آئی تھی اور ماں سمجھ رہی تھی کہ نمبردار کے گھر دیر ہو گئی۔

"جا تھک گئی ہو، اندر جا کے لے (لیٹ) پے جا، ساری دیہاڑی کام کر کے تھک جاتی ہے۔" اپنی ماں کے بھولے پن پر ہنستی وہ اندر چلی گئی اور پھر کمرے میں آتے ہی ایک انگڑائی لیتی ہوئی وہ منجی پر لیٹ گئی۔

"ہائے او ربا یہ منشی بھی ناں۔" آج منشی نے کپڑے دیئے تھے اور آج وہی سر پر سوار تھا، اس کے خیال کو پیار سے جھٹکتی وہ سیدھی ہو کر لیٹی رہی پھر جانے کیا ہوا کہ افضل کا چھوٹا وجود جیسے نیری کا روپ لئے دھڑام سے اس کے اوپر آ گرا تو وہ جو کچھ اور سوچ رہی تھی بوکھلا کر اٹھ بیٹھی،

سانسیں تیزی سے پھڑپھڑاتی نکلتی اس کی دھڑکنیں بڑھا گئیں۔

"یہ کیا ہوا مجھے؟" وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھتی اپنی سانسوں کی ترتیب ٹھیک کرنے لگی۔

افضل، اس پیاس کی طرح تھا جو بجھ کے نہیں دے رہی تھی، وہ کنواں تھا جس کی بوکیاں سے نکلتے ٹھنڈے پانی کی مٹھاس کسی اور کے لئے تھی اور وہ کنارے پر پیاسی کھڑی تھی، لیکن کیا وہ اس مٹھاس کی حقدار تھی وہ تو جانے کس کس گھاٹ سے سیر ہو چکی تھی اس پیاس کی اس کے اندر کیسے جگہ بن رہی تھی کیوں سیر ہونے کے باوجود اس پیاس کی طلب اندر محسوس کر رہی تھی، خود کو وہ ایک کھون کے اندر بند پا رہی تھی، جہاں ایک طرف نمبردار کا خوف تھا ایک سرے پر منشی تھا اور ایک طرف افضل کی چوری چوری جگہ بناتی محبت، تو ان تینوں میں کیا فرق تھا۔

بدن کا نشہ ایک ایسی بلا کی طرح ہوتا ہے جو ایک دفعہ سر پر سوار ہو جائے تو کوئی بھی منتر کام نہیں آتا بلکہ سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیتا ہے، پچھی بھی چاہے جیسے بھی ہو، اس بلا کے قابو میں تھی جو اپنے سامنے اتنے حسین مرد (افضل) کو دیکھ کر قابو سے باہر ہو رہی تھی۔

لیکن ہر انسان ایک جیسا نہیں ہوتا، نمبردار اور منشی دونوں اس بلا کے آگے بے بس ہو گئے تھے مگر افضل ان لوگوں میں سے تھا جو ہر قسم کے نشے کو اپنے جوتے کی نوک پر رکھتے ہیں، لاجو اس کے لئے کوئی نشہ نہیں تھی بلکہ اس کے جسم میں روح کی طرح تھی جس کے بغیر زندگی ممکن نہیں ہوتی۔

☆☆☆

پالطیف کو چاچے سے اچھی خاصی جھاڑ پڑ گئی تھی، دھوپ جامن کے پیڑ کے اوپر سے ہوتی آسمان کی کھلی بانہوں میں پوری طرح غرق ہو چکی تھی، سارا دن کے گرمی سے نڈھال پرندے ستانے کے لئے پیڑ کی شاخوں پر آ بیٹھے تھے، گرمی بھی وہ جو باہر نکلنے کی اجازت نہ دے۔

ویسے تو پالطیف زیادہ تر چاچے کے ساتھ طبلے پر ہی سنگت کرتا تھا ہر اسے گانے کا بھی کبھی کبھی دورہ پڑتا تھا آج اس نے چاچے سے کہا کہ وہ ایمن کلیان میں کچھ گا کر سنائے گا، چاچے کو اس کے بے سرے پن کا پتہ ہونے کے باوجود اسے نہ نہ کی اور وہ شروع ہو گیا۔

ایمن کلیان جسے یمن کلیان بھی کہا جاتا ہے اس راگ کو زیادہ تر گوپے الاپتے ہیں، چاچے کی بتائے ہوئے ہر عمل کرتا وہ بھی اسے الاپنے شروع ہو گیا، گانے کی اس کی زیادہ مشق نہیں تھی اس لئے راگ کو الاپتے ہوئے اس کا سانس بار بار ٹوٹ رہا تھا، پہلے تو چاچا برداشت کرتا خاموشی سے سنتا رہا پھر جیسے سروں کی بے عزتی برداشت سے باہر ہوگئی۔

"اٹھ کسی بے سرے کھوتے کی اولاد یہ روا چاری (گویے کے عیوب، آواز کو ہلانا اور آواز کا ٹوٹنا) کہاں سے سیکھی تم نے۔"

"اتنے سوہنے من موہنے راگ کا کیا حال کر دیا، یہ راگ جو کئی شام کے راگوں کی ماں ہے کیا کر دیا اس کا۔"

"تجھے تو پتہ ہے چاچا میرے ہاتھوں میں سر ہے، گلے میں تو بس پورا پورا ہی ہے۔" پالو بے چارہ چاچے سے ڈرتا جلدی سے ہتھیار چھوڑ بیٹھا۔

"میں ذہن کا سریلا ہوں گلے کا نہیں۔"

"تو پھر کیوں پیر ڈالتے ہوئے اس کام میں جو تیرا ہے ہی نہیں۔" چاچے کو تو تپ چڑھ گئی تھی، وہ بھی جانتا تھا کہ یہ وقتی غصہ ہے، پھر بھی

پیار سے انہیں ٹھنڈا کرنے لگا۔
"ویسے یہ راگ ہے بڑا سوہنا۔" پا لطیف نے طبلے کی تھاپ دیکھتے ہوئے چاچے کی طرف دیکھا تو چاچا بھی غصہ بھولے اپنے پسندیدہ راگ پر بات کرنا نہ بھولا۔
"یہ راگ تان سین کے خاندان کا راگ ہے اس میں بڑی راگنیاں پیدا ہوتی ہیں، جیسے ساونی کلیان، شام کلیان، جیت کلیان، بھوپ کلیان، چندر کانت۔" چاچا اپنی گود میں رکھی اپنی ستار پر ہاتھ پھیرتا بڑی محبت سے بول رہا تھا یہ ستار چاچے کو اس کے استاد نے شہر سے منگوا کر دی تھی، ان کے استاد شہر میں کسی گانے والی کے پاس رہتے تھے جو انہیں اپنے پاس رکھ کر گانا سیکھتی تھی، انہیں اپنے ہونہار شاگرد سے بڑی محبت تھی اس لئے وہ چاچے سے ملنے چند ضرور آتے تھے اور پھر آتے آتے چاچے کے لئے کوئی نہ کوئی ساز ضرور لاتے، چاچے کے پاس ان کی دی ہوئی ہارمونیم تھی، گانے کے ساتھ ساتھ چاچا سازوں کو بجا بھی بہت اچھا لیتا تھا۔
"میرے استاد کا انتقال کے بعد میرے اوپر بڑا کرم رہا ہے، آج اگر میں کسی راگ کو سمجھ کر اس پر بول لیتا ہوں تو یہ انہی کی وجہ سے ہے۔"
"تجھے پتہ ہے طیفے اپنے استاد کے پاس جب میں شاگردی میں پڑا تھا تو انہوں نے جو راگ سب سے پہلے مجھے سکھایا تھا وہ راگ ایمن کلیان ہی تھا۔" اپنے استاد کو یاد کرتے ہوئے چاچے کی آنکھیں بھیگ گئیں، لاجو جو ان دونوں سے دور بیٹھی چولہے پر رات کی ہانڈی چڑھا رہی تھی چاچے کو دیکھ کر اس کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔
"لاجو پتر، آ ادھر۔" وہ ہاتھ میں پکڑی چھری چھوڑ پیڑھی سے اٹھ کر چاچے کے پاس آ گئی۔
"ہاں چاچا۔"
"کیا پکانے لگی ہو؟" چاچا جیسے ادھر ادھر کی باتیں کر کے اپنے درد کو بھلانے کی کوشش کرنے لگا۔
ان کے استاد چاہے اب اس دنیا میں نہیں تھے مگر پھر بھی وہ چاچے کو وہ بہت عزیز تھے، پا لطیف بھی چاچے کو اداس دیکھ کر خود بھی پریشان ہو گیا، چاچے نے ٹھنڈی سی آہ بھرتے ہوئے اپنے پٹکے سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔
"دلسی کی کڑی پکانے لگی تھی؟"
"اچھا چل اس کے ساتھ سفید چاول پکانا نہ بھولنا۔"
"اچھا چاچا۔"
"اچھا تو پھر میں روٹی ادھر ہی کھا کر جاؤں گا۔" کڑی کا نام سن پا لطیف کے منہ میں پانی آ گیا تھا اسے بھی کڑی بڑی پسند تھی۔
"ہاں......پا...... تائی کے لئے بھی لے جانا، مجھے پتہ ہے اسے بھی کڑی بڑی پسند ہے۔" لاجو نے پا لطیف کی ماں کے بارے میں کہا۔
"کیا اس کے سارے خاندان واسطے بھیجے گی تو۔" چاچا پھر اسی رو میں واپس آ گیا۔
"چل معاف کر دے چاچا۔" لاجو کو پتہ تھا کہ چاچے کو کون سا غصہ چڑھا ہے، لاجو کو اپنے منہ بولے بھائی پر ترس آ گیا۔
"اچھا چل ٹھیک ہے یہ تیری سزا یہ ہے تو میرے ساتھ ابھی چل خورشید کے گھر، تو نے جو میرے کان بے سرے کیے ہیں انہیں خورشید کا سریلا گلا ہی ٹھیک کر سکتا ہے۔" چاچے کی بات پر پا لطیف کی باچھیں کھل گئیں، بن مانگے مراد مل رہی تھی۔
[illegible] کا سے کیوں [illegible] دکھوں کی بات [illegible] دیتی

پیا بن تڑپت تڑپت کٹت رین
خورشید کے میٹھے گلے سے نکلتے بھاگیری

کے سر ان دونوں کے دلوں میں کہیں دور تک مٹھاس بھر گئے۔ اپنی کٹیا میں اکیلی بیٹھی وہ جانے کن خیالوں میں گم تھی۔

شام سر پہ کھڑی اس کے اندر چھپے غم کو اور بھی ہوا دے رہی تھی، لاوا سا تھا جو اس کے اندر تھا مگر اپنے آپ کو سہارا دیے وہ اس لاوے کو اندر ہی روکے ہوئے تھی کہ اگر اب یہ باہر نکلا تو کسی کا کچھ نہیں جائے گا سو وہ غم اندر ہی اندر گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہا تھا، اس کی آنکھیں ہر وقت اس کے دھوئیں سے نم ناک رہتیں۔

چاچے نے پالطیف سے کہا تھا کو وہ بالکل چپ چاپ کھڑا رہے وہ جس رو میں گا رہی تھی وہ جگنی بھی ہی کانوں کو ملتا تھا، انترہ شروع کرتے وقت اس نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو اپنی پوروں سے صاف کیا۔

جب سے پیا پردیش گئیو کینو
نس دن بیکل جیجن تڑپت مورا جیا
ایری سکھی مورو پران جات

اور جب اس نے انترہ ختم کیا تو سوگ کا اک بادل سا تھا جو چھا گیا تھا اور پالطیف جو اس بادل کے چھٹنے کا انتظار کر رہا تھا مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ بادل اسے بڑا عزیز ہے اور اس نے اسے اپنی مرضی سے اوڑھ رکھا ہے، چاچے کی واہ واہ سے اس کا دھیان ٹوٹ گیا۔

''میرے کان اتنا سر سن کر جی اٹھے ہیں۔''

''چاچا!'' وہ چونکتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔

''پتر جب تو گاتی ہے ناں، سوہنے رب دی اس سوہنے رب کی ثنائی کو اور دل کرتا ہے۔''

''نہ چاچا کتنا بگاڑ نہ کر، تیرے جیسے استاد کے سامنے کچھ بھی نہیں ہوں میں۔'' اس نے اترا ہا

کانوں کو ہاتھ لگایا اور پھر اٹھ کر جگی کی دوسری طرف کا پردہ بھی اوپر اٹھا دیا تاکہ ہوا دونوں طرف سے اندر آسکے، کوئی پھولی جھی پر پڑا کھیس سیدھا کر کے بچھایا اور ان دونوں کو بیٹھنے کے لئے کہا، شام کا وقت بستر کا کنارہ اور سامنے پھیلا خاموش جنگل، چار پانچ جھگیوں کے اردگرد پھیلا یہ منظر کتنا اچھا لگ رہا تھا۔

وہ لوگ میلوں میں گانے بجانے کا کام کرتے تھے اس لئے جگی پر جا بجا موسیقی کے آلات نظر آ رہے تھے، اس کی ماں بستر (ندی) پہ کپڑے دھونے گئی تھی اور اس کے مطابق اب وہ آنے والی تھی، اس کے گھر کوئی نہیں تھا اس لئے چاچا نے مناسب نہ سمجھا کہ جوان لڑکا لے کر میں یوں تنہا اس کے پاس بیٹھوں اس لئے وہ چاہنے کے باوجود واپس آ گیا۔

☆☆☆

کل کی ایک ڈرامہ کمپنی بھی پنڈ کے باہر ڈیرہ ڈال چکی تھی، جس کی مشہور ناچنے والی شمشاد بائی پچھلے ایک سال سے لگاتار میلے پر یہاں آ رہی تھی جس کی بڑی وجہ نمبردار فضل الٰہی تھا ہاں اب جگنی کے جادو کے آگے اس کا جادو کمزور پڑ رہا تھا۔

''منشی اکبر بھی۔'' بیٹھک میں بیٹھے نمبردار کے کامے نے جو بات اس کے کان میں آ کر بتائی تو وہ یوں اٹھ کر کھڑا ہوا جیسے کسی نے نیچے سے سوئی چبھو دی ہو، اس کے لبوں سے بجلی کی تیزی کے ساتھ یہ نام نکلا۔

''میرے ہی گھر میں چوری، میرے ہی سامنے۔'' منشی اکبر نے جیسے نمبردار کے غصے کو آواز دے دی تھی، نمبردار نے اپنے بندے پچھی کے پیچھے لگائے ہوئے تھے جنہوں نے منشی اکبر کا پتہ لگا لیا تھا بلکہ اور محبت سے تعلقات کے بارے

میں بتایا تھا۔
"میرے ساتھ غداری کرتی رہی وہ کڑی۔"
کاما بدر یہ بات بتا کر پیچھے کھڑا تھا، بھی کا کترانا
اب اس کی سمجھ میں آرہا تھا۔
"میرے پتر پر بھی ڈورے ڈالتی ہے اور
منشی اکبر پر بھی۔"
"تیری لاج کا میدان پھسلتا جارہا ہے مگر
تجھے تیرے ہی میدان میں نہ پچھاڑا تو میرا نام
فضل الٰہی نہیں۔" غصے کے مارے اس کا برا حال
تھا بھی نے جیسے اس کے غضب کو آواز دی تھی۔
"سرکار ایک بات اور ہے۔" کاما بدر ایک
قدم آگے کو بڑھتا بولا تو نمبردار نے ماتھے پر
تیوریاں ڈالے مڑ کر اس کی طرف دیکھا، غصے
سے ابھی بھی رگیں تنی ہوئی تھیں، نمبردار کا غصہ
دیکھ جیسے زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی، حوصلہ جتا
نہیں پا رہا تھا۔
"کمبختی بولو، کون سی بات؟" وہ غصے میں
غرایا۔
"زبان ساتھ نہیں دے رہی سرکار۔" وہ
ہاتھ جوڑے کانپنے لگا تو نمبردار کے ماتھے پر فکر کا
پسینہ ننھے ننھے قطروں کی صورت میں ابھر آیا۔
"او بدبختی بول۔" کانپتی ٹانگوں کے
ساتھ اس نے سر نیچے کو جھکالیا۔
"وہ...... اپنے چھوٹے سرکار۔" وہ رک
رک کر بولا۔
"وہ...... وہ...... جی...... قادر بخش گویے کی
کڑی لاجو، اپنے سرکار جی۔" کامے کی بات
پوری ہونے سے پہلے ہی نمبردار کی سمجھ میں آگئی
اور افضل کے انکار کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی۔
"اک گانے والے کی کڑی کی وجہ سے
میرے آگے کھڑا ہو رہا ہے وہ۔" انہوں نے ہاتھ
کا مکا بنا کر دوسری ہتھیلی پر مارا، چہرے پر جانے
کیسے کیسے تیوران کے اندر چھپے غصے پر سے نقاب
اتار رہے تھے، اتنا کچھ میری پیٹھ پیچھے ہو رہا ہے
اور مجھے خبر نہیں، غصہ بار بار ان پر حاوی ہو رہا تھا
انہوں نے قریب پڑے موڑھے کو ٹھڈا مار کر دور
گرا دیا، دانت پیستے وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے کرسی
پر بیٹھ گیا۔
"وہ منشی میرے سامنے کتنا نمانا سا بنا رہتا
ہے اور میری چیز پر ہاتھ صاف کرتا رہا اور مجھے خبر
نہ ہوئی اور اسے ذرا ڈر نہ لگا اور وہ بھی اسے ذرا
خوف نہ آیا، کمینی تیری آگ تو میں ٹھنڈی کروں
گا، میرے پتر پر بس نہ چلا تو میرا منشی۔" ابھی وہ
بیٹھک میں غصے سے بیٹھا تھا کہ منشی اکبر کسی کام
کے سلسلے میں اندر آگیا، قابو میں آتا غصہ جیسے بے
قابو ہونے لگا، نمبردار کا دل چاہا وہ اٹھ کر ابھی اس
کے سینے میں گولی اتار دے، میری پیٹھ میں چھرا
گھونپنے والا یہ انسان کتنی دلیری سے میرے ہی
سامنے کھڑا ہے، نمبردار کا چہرہ تپ کر لال ہونے
لگا، وہ حساب کتاب والی کاپی ہاتھ میں لئے دکان
کی ملکیت کے بارے میں بتانے لگا، نمبردار نے
اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بڑی جانچتی نظروں
سے اس کے بھولے چہرے کے پیچھے چھپے وحشی
انسان کو دیکھنے کی کوشش کی پھر جانے اسے کیا
سوجھی اس نے اپنے کامے کے ہاتھ بھی کو ٹھنڈا
پانی لانے کا پیغام بھیجا، کاما بدر سمجھ دار تھا ہنستا ہوا
باہر نکل گیا۔
تھوڑی دیر بعد بھی شیشے کے گلاس میں ٹھنڈا
پانی لائی، گلابی رنگ کے جوڑے میں نکھرا نکھرا
حسن، نمبردار جیسے چند لمحوں کے لئے سب کچھ
بھول گیا، کتنی سوہنی لگ رہی تھی وہ، تیکھی والی
ناک، ہلکے ہلکے سرمے والی کجراری آنکھیں
سیدھی دل میں اتر گئیں، پاس کھڑا منشی خود کو
سنبھالتے کے باوجود اسے بےتاب نظروں سے

دیکھے بنا نہ رہ سکا، نمبردار کی نظریں بھی خشی کی بے تابی کو بھانپ گئیں، نجمی بھی بڑی ادا سے آن کھڑی ہوئی تھی، نمبردار جو چند لمحوں کے لئے بہکا تھا سنبھل گیا، خشی کو دیکھ کر اس نے ناک سکوڑی پھر گلاس نمبردار کی طرف بڑھا دیا۔

''میرے کا سے کی بات نرالی ہے۔'' اس نے خود سے کہا۔

نجمی پر وہ دل و جان سے مرتا تھا وہ لاکھ اور طرف دل لگاتا تھا مگر نجمی میں دوسری کشش تھی پر اب وہ اندر سے بری طرح ٹوٹا تھا۔

''تو نے میرے ساتھ چنگا (اچھا) نہیں کیا۔'' اس نے بڑے دکھ سے نجمی کے مار دینے والے حسن پر نظر ڈالی اور پھر خشی کو باہر جانے کے لئے کہا۔

دل کے ہاتھوں مجبور اس نے خشی کے باہر جاتے ہی ہاتھ پکڑ کر نجمی کو خود کے قریب کرلیا، بے چارہ دل۔

☆☆☆

نجمی اس کی محبت تھی اس لئے وہ چاہنے کے باوجود اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا اس لئے اس کا شاطر ذہن جانے کیا کیا سوچنے لگا۔

''چوہدری، مجھے پتہ لگ گیا ہے کہ اب مجھ میں وہ بات نہیں رہی جو کبھی تیرا دل دھڑکا کرتی تھی، اب میرے سامنے بھی تو ایسے بیٹھا رہتا ہے جیسے پہلی واری مل رہا ہو۔'' شمشاد کے گلے پر نمبردار کے ہونٹوں پر بڑی پھیکی سی ہنسی آ کر غائب ہوگئی۔

''یہی سچ ہے ناں؟''

''او نہیں شمشاد، تو، تو اب بھی قیامت ہے، بس ایسے کچھ طبیعت ٹھیک نئی رہتی۔'' شمشاد کو جیسے چوہدری کی بات پر یقین نہ آیا، وہ اس کے پاس چلی آئی۔

''پر میرا دل نہیں مانتا، مجھے لگتا ہے جیسے میرا چوہدری کچھ بدل بدل سا گیا ہے۔'' اس نے فضل الٰہی کا چہرہ اپنے ہاتھ سے اوپر اٹھایا تو وہ نظریں جھکا گیا جیسے وہ ان میں چھپی بات پڑھ نہ لے۔

''ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں۔'' مرد کو اپنی طرف اکسانے والی تمام اداؤں سے لیس تھی وہ اور چوہدری تو ویسے بھی اس کا پرانا گاہک تھا، شمشاد کی بھوری آنکھیں پوری طرح پھیلی چوہدری فضل الٰہی کے چہرے کو جکڑے ہوئے تھیں، قیامت پر قیامت برپا کر رہی تھی وہ۔

''تو کیوں اس بات کو اتنا کریدرہی ہے، میں پہلے والا ہی ہوں۔''

''جھوٹے یقین نہ دلا تو مجھے۔'' وہ منہ پھلا کر چہرہ دوسری طرف پھیر گئی، ڈرامہ کمپنی کی وہ سب سے بڑی ناچنے والی تھی بڑے بڑے پانی بھرتے تھے اس کے آگے۔

''لے تو بھی ناں، بھلا میں کیوں تجھے جھوٹے یقین دلاؤں گا، بھلا میں سودائی ہوں۔'' شمشاد کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا آخر گاہے بگاہے اس سے بھی کام پڑتا رہتا تھا۔

''تیری سوچ ہے میں بالکل پہلے والا ہوں۔'' اس نے اپنے پہلے والے انداز میں اس حور کو منانے کی کوشش کی تو شمشاد کو جیسے قرار سا آگیا ورنہ وہ تو کچھ اور ہی سمجھ بیٹھی تھی۔

سچ تھا شمشاد دل سے مرتی تھی اس پر، عمر کا اتنا فاصلہ بھی اسے پیچھے نہ ہٹا سکا، پچھلے ایک سال سے وہ صرف نمبردار فضل الٰہی کی وجہ سے اپنی ڈرامہ کمپنی کو لے کر میلے پر آتی تھی ایک تو کام ہو جاتا تھا دوسرا فضل الٰہی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزرتا تھا مگر اب کی بار وہ زیادہ وقت نہ دینے پر ہی ناراض ہو رہی تھی۔

☆☆☆

''اپنے دل کی بات بتانے میں کیا حرج ہے۔'' بچی دیوار میں پلاسٹک کے گلابی فریم میں لٹکے چھوٹے سے شیشے میں اپنی تھلی والی ناک کو سکوڑتی خود کو دیکھتی وہ خود سے باتیں بھی کر رہی تھی۔

اندر سے وہ نمبردار سے ڈرتی بھی بہت تھی پر کیا کرتی یہ بات دل میں بھی وہ نہیں رہی تھی اور اب وہ سوچ رہی تھی چاہے وہ جو مرضی کہے میں بات کروں گی۔

آج وہ بہت کچھ سوچ کر حویلی جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی، دل اندر سے ڈر بھی رہا تھا اگر بات پھیل گئی تو، تو نمبردار جو کرے گا، وہ سوچ کر ہی لرز گئی، کیا کروں میں، آگے کو بڑھتے قدم ڈر کر پیچھے کو پلٹ گئے، دل کچھ کہہ رہا تھا اور دماغ کچھ اور۔

دل تو بہت بڑا کر رہی تھی پر، یہ جو ڈر تھا اسے ٹھیک طرح سے سیٹ نہیں ہونے دے رہا تھا، نڈر بن کر بھی ڈر نہیں اندر ہولے ہولے جگہ بنا رہا تھا۔

نمبردار فضل الٰہی اپنے حقے کی گڑگڑاہٹ کو تیز کرتا جانے کیا سوچ رہا تھا اس کا خاص کاما بدر بڑی دیر سے اس کے چہرے کے بنتے بگڑتے رنگ دیکھ رہا تھا۔

''سرکار! اگر شان میں گستاخی نہ ہو تو ایک بات کہوں۔'' وہ دونوں ہاتھ جوڑے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''ہاں۔'' وہ جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوبا بولا۔

''مجھے پتہ ہے سرکار آپ اس دن والی بات سے پریشان ہیں۔''

''تو پھر۔'' نمبردار حقہ چھوڑ کے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''میرے چھوٹے سے دماغ میں ایک گل آئی ہے، جس سے سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی سلامت رہے گی۔'' نمبردار کے جیسے کان کھڑے ہو گئے، کاما اس کے بہت پاس آ گیا اور رازداری برتتے ہوئے کان میں کچھ کہنے لگا۔

بات کرتے ہوئے نمبردار کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا، تنی ہوئی رگیں اپنے آپ ڈھیلی پڑ گئیں، چہرے پر بڑی دیر بعد خوشی کا رنگ ابھرا تھا۔

اس نے اسی وقت جیب سے پانچ سو نکال کر کامے بدر کو تھما دیے۔

''یہ تیرا انعام ہے۔'' کامے کی بات جیسے پکی ہو کر اس کے دل میں بیٹھ گئی، سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی۔

☆☆☆

''اپنی ماں کو نہیں بتائے گا کون ہے وہ۔'' افضل اپنے پلنگ پر لیٹا تھا ماں بھی پاس بیٹھی تھی۔

''جب وقت آئے گا سب سے پہلے آپ کو بتاؤں گا۔'' نمبردارنی نے اس کے لئے بنتو کے ہاتھ شربت منگوایا تھا بچی پساری میں کام کر رہی تھی اسے پتہ تھا افضل گھر ہی ہے اس لئے وہ کم ہی باہر آ رہی تھی لیکن آج وہ گھر سے ٹھان کر آئی تھی وہ کام کرے گی ضرور۔

''تیرا ابا پتہ نہیں یا نذیر والی بات بھول گیا ہے، مگر انہوں نے وہ بات نہیں کی۔''

''اچھی بات ہے وہ بات انہیں بھول ہی جانی چاہیے۔'' افضل نے اٹھ کر شربت ہونٹوں سے لگا لیا اور گلاس خالی کر کے بنتو کی طرف بڑھا دیا تو وہ واپس پساری میں آ گئی آگے بچی کپ پرچھتی پر رکھ رہی تھی۔

''لگتا ہے اپنے چھوٹے چوہدری کا دل کسی

پر آ گیا ہے۔'' بنتو کی بات سن مجھی کے ہاتھ سے کپ ٹوٹ کر نیچے زمین پر آ گرا۔

''لے بات میں نے کسی کی کی، تیرے کیوں ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔'' وہ گلاس رکھے ٹوٹے کپ کی کرچیاں اٹھانے لگی۔

''تجھے کس نے بتایا۔'' مجھی بھی ساتھ مل کر کرچیاں اٹھانے لگی۔

''چھوٹے چوہدری کی باتوں سے لگا، سوچتی ہوں کتنے نصیبوں والی ہو گی جسے اپنے چوہدری صاحب پیار کرتے ہیں۔'' کرچیاں اٹھاتے اٹھاتے مجھی کا ہاتھ زخمی ہو گیا اس نے جلدی سے انگلی منہ میں داب لی، دل کے اندر جیسے کوئی شے کانٹوں کی طرح چبھنے لگی۔

☆☆☆

''مجھے دھوکا دینے کا مطلب ہے اپنی جان کو ببول کے کانٹوں پر گھسیٹنا، میں ایسے بندوں کی نسلیں تباہ کر دیتا ہوں۔'' نمبردار بات تو اپنے کسی کامے سے کر رہا تھا مگر پاس کھڑی مجھی پر اس نے بڑی قہر آلود نظر ڈالی تھی جو ادھر کسی کام کی غرض سے آئی تھی، اس کی بات سن خوف سے ٹھنڈی پڑ گئی جانے کیوں اسے لگا جیسے یہ ساری باتیں اس نے صرف مجھے سنانے کے لئے کی ہیں۔

''میں کسی کا لحاظ نئیں کرتا، مت کوئی خیال کرے کہ میری محبت میرے پیروں کی زنجیر بن گئی ہے۔'' مجھی کے دل پر دھاک بٹھاتی اس کی باتیں بڑا اثر کر رہی تھیں، نمبردار جیسا کمینہ انسان کچھ بھی کر سکتا تھا اور افضل کی طرف سے تو ویسے بھی اس کے دل میں چور بیٹھا ہوا تھا وہ پہلے بھی مجھی کو کئی واری سمجھا چکا تھا۔

گھر آ کر وہ بڑی دیر تک ڈری سہمی رہی، وہ تو کچھ بھی کر سکتا ہے، سر میں پیڑ (درد) کا بہانہ کر کے وہ کوٹھری میں جا لیٹی۔

وہ جو افضل کو دل کی بات بتانے والی تھی خوف سے جیسے اس کے پیر لڑکھڑانے لگے، کیا کروں، وہ تو پہلے ہی مجھے منہ نہیں لگاتا اور اگر اس نے میرے اقرار پر رولا ڈال دیا اور بات نمبردار تک چلی گئی، مجھے تو مرنے سے پہلے ہی مرنا پڑ جائے گا۔

افضل کو بتانے والی بات کا فی الحال اس نے ارادہ چھوڑ دیا تھا۔

☆☆☆

''سرکار کوئی کام تھا تو مجھے بلا لیا ہوتا، آپ خود۔'' منشی اکبر جو اپنی مجھی کی ادوائین کسنے میں لگا تھا اچانک نمبردار کو گھر آتا دیکھ کر بوکھلا سا گیا اور ادوائین کو بنا کسے ہی زمین پر چھوڑ کر چلتا ہوا ان کے پاس آ گیا، اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بغیر بتائے نمبردار کیوں غریب کے گھر آ گیا، جب سے وہ نوکری لگا تھا آج پہلا موقعہ تھا کہ نمبردار خود چل کر اس کے گھر آیا تھا، بغیر وجہ کے تو آ نہیں سکتا، وہ ایسے کھڑا ہو گیا جیسے جاننا چاہ رہا ہو۔

''اوئے نئی، میں یہاں سے لنگ (گزر) رہا تھا کہ مصطو نے کہا کہ تو گھر ہی ہے تو سوچا چلو ملتا چلوں۔''

''اچھا اچھا میں سوچا پتہ نئی کیا بات ہے۔''

''اوئے جھلیا تو، تو ڈر گیا، بات کے بغیر بھی تو آ سکتا ہوں میں تیرے پاس۔'' منشی نے آگے بڑھ کر لوہے کی کرسی گھسیٹی اور اپنے پلے سے اسے جھاڑنے کے بعد نمبردار کی طرف بڑھا دی۔

''بیٹھیں سرکار۔''

''اوئے شاباش۔'' نمبردار کرسی پر بیٹھ گیا اور کمرے کا جائزہ سا لینے لگا۔

''لگتا ہے سارے کام خود ہی کرتے ہو۔'' نمبردار نے منجی کی کھلی ادوائین کی طرف دیکھ کر

کہا تو وہ بڑا اتراتا سامنے بیٹھا کر بولا۔

"کوئی کرنے والا جو نہیں، خود ہی کرنے ہیں۔" نمبردار نے بڑے غور سے اس کا منہ دیکھا جتنا اتراتا یہ بنتا ہے اتنا ہے نہیں۔

"یہ بات ہے تو تو اپنے اس کلے پن کو دور کر اور کوئی ووہٹی ڈھونڈ واپنے لئے۔" منشی کے چہرے پر اک رنگ سا لہرا گیا۔

"ووہٹی۔" اس طرف تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا، اس کے ماں باپ کو گزرے چند سال ہو گئے تھے، بہن بھائی کوئی تھا نہیں تو، یہ بات کس نے کرنی تھی اور ویسے بھی پچھی نے جیسے اس طرف سے دھیان ہٹا ہی دیا تھا، اس لئے نمبردار کے منہ سے بیاہ والی بات سن کر وہ اک کٹھی میٹھی سی کیفیت میں جا پہنچا۔

"اس طرف کبھی سوچا نہیں سرکار۔"

"تو اب سوچ لے تمہاری کون سی کوئی بڑی عمر ہو گئی ہے، اچھے خاصے سوہنے جوان ہو، پڑھے لکھے، تمہیں کون اپنی بیٹی نہیں دے گا۔"

"نمبردار جی اب یہ اپنے لے ووہٹی خود ڈھونڈنے سے تو رہا۔" مصطفو کی بات سن کر نمبردار جھٹ سے بولا۔

"تو ہم کس لئے ہیں، تو تیاری کر کڑی ڈھونڈنا ہمارا کام ہے۔" نمبردار کے اتنے اپنے پن پر وہ حیران ہو رہا تھا آخر یہ میرے لئے کڑی کیوں ڈھونڈنے گا۔

اپنی بات کہہ کر نمبردار اسے تسلی دیتا اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پھر مصطفو کو ساتھ لئے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

وہ نمبردار کے اتنی محبت لٹانے پر حیران ہو رہا تھا مگر اس کے دلاسے کا سوچ کر اسے مزہ بھی آ رہا تھا، وہ میرا رشتہ کرائے گا، ویڑے میں دریک کے سائے میں کھردری منجھی پر لیٹا وہ ہولے ہولے ہلتے اس کے پتوں پر نظریں ٹکائے تھا نظریں ادھر تھیں مگر دماغ نمبردار کی باتوں میں الجھا تھا۔

"اور پچھی۔" اس نے ذہن میں کوندتے اس کے خیال کو بڑے عجیب طریقے سے سوچا تھا جس میں نہ محبت تھی اور نہ کچھ اور۔

یکدم ایسا کیوں ہو گیا تھا وہ پچھی جو اس کے لئے تسکین کا باعث تھی آج اسی کے خیال نے اندر کوئی ہلچل نہیں مچائی تھی، خود کو اس نے حیران کر دیا تھا۔

پچھی اسے اچھی لگتی تھی پر شاید گھر والی کے طور پر نہیں، اکیلا بندہ وقت گزاری کے سو بہانے ڈھونڈ لیتا ہے، اک کمینی سی ہنسی ہونٹوں پر آ کر مچل گئی، اس کے ذہن نے دل کو جھٹلانے کی کوشش کی تھی۔

"جو رشتہ اس نے میرے ساتھ اور نمبردار کے ساتھ باندھا ہوا ہے وہ شریف گھروں کی کڑیاں نہیں کرتیں، اور گھر والی کا رشتہ تو چلتا ہی ایمانداری اور حیا پر ہے اور وہ کہیں سے بھی ایماندار اور حیادار نہیں تھی جو نمبردار کو دھوکا دے کر میرے ساتھ میل ملاپ رکھ سکتی ہے وہ تو کچھ بھی کر سکتی ہے۔" دریک کے پتے ہلکی ہلکی ہوا کے ساتھ بھی کبھی ٹوٹ کر زمین پر گر رہے تھے تو کیا پچھی بھی ان ٹوٹے ہوئے پتوں کی طرح اس کے ذہن کی ڈالی سے ٹوٹ کر کہیں بہت نیچے گر رہی تھی، نمبردار کے لارے نے اسے کسی اور ہی پاسے لگا دیا تھا۔

☆☆☆

پچھلے چند روز سے یہ بات اسے ہلکان کیے جا رہی تھی نمبردار کا ہر وقت غصے میں آ کر مرنے مرانے کی باتیں کرنا اسے حقیقت میں پریشان کر رہا تھا، وہ جیسے بھی ہو افضل کو دل سے نکالنے کی

کوشش ضرور کرے گی ورنہ نمبردار سے مرنے کے لئے تیار ہو جائے۔

نمبردار کی باتوں سے اسے اپنے گرد زمین تنگ ہوتی نظر آرہی تھی، نمبردار کو پکا شک ہو گیا تھا وہ جتنا کسی سے محبت کرتا تھا اتنی ہی شدت سے نفرت بھی کرتا تھا۔

نمبردار کے ساتھ رہ رہ کر وہ اس کی عادتوں سے واقف ہو گئی تھی اور اگر منشی کے بارے میں پتہ چل گیا تو اسے جھرجھری سی آگئی۔

افضل کا روکھا پن تو ویسے بھی اس کے پیر روکے ہوئے تھا پر منشی اس کے ساتھ تو جیسے اس کے تعلقات تھے، پچھی کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آگیا، وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی، اب کیا کرے وہ؟

دیوار کا سہارا لے کر وہ کتنی دیر کھڑی رہی، سوچ کر پر کٹ کٹ کر نیچے گر رہے تھے، کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی، اسے پتہ چلا تو وہ کیا کیا نہیں کرے گا۔

اب صرف منشی اکبر تھا جس کی طرف سے وہ خود کو محفوظ پا رہی تھی وہ تو ویسے بھی اس پر جان چھڑکتا تھا اسے لے کر وہ کہیں دور بھاگ جائے گی جہاں نمبردار بھی بھی پہنچ نہیں پائے گا۔

بڑی دیر اس کی غلامی کی تھی چاہے اپنی لالچ یا کچھ اور لیکن پتہ نہیں کیوں دل نمبردار کے غصے سے گھبرا گیا تھا وہ مجھے کہیں کا نہیں چھوڑے گا اس سے پہلے پہلے میں کہیں دور بھاگ جاؤں گی۔

☆☆☆

صبح میلہ تھا اور آج کی شام چراغاں تھا، پنڈ کے سارے گھروں کی چھتوں سے وقت سے پہلے شاموں شام ہی دھوئیں کے بادل اٹھنے لگے تھے کیونکہ ہر کوئی اپنے کام نپٹا کر چراغاں کے لئے درگاہ شریف جلدی جانا چاہ رہا تھا۔

لاجو بھی ابھی کام سے ویلی ہوئی تھی نذیراں کئی وار کی اسے دیوار کے پار سے آوازیں دے چکی تھی، افضل نے اسے جلدی درگاہ آنے کے لئے کہا تھا جہاں وہ مل کر آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی محبت کو گواہ بنا کر چراغ جلائے گا اور وہ روشنی ساری حیاتی کے لئے اس کی محبت کی گواہ بنے گی۔

پا لطیف ابھی ابھی اٹھ کر گیا تھا وہ بڑے دنوں کا لاجو سے کہہ رہا تھا کہ خورشید سے اس کے لئے بات کرے لیکن آج لاجو نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ کسی اور کو دل دے چکی ہے اور وہ کیونکہ اپنا پہلا پیار بھول کر تیرے ساتھ چل سکتی ہے پہلے تو وہ مانا نہیں پھر لاجو کے سمجھانے پر چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا کہ دل پر کسی کا زور نہیں ہوتا۔

چاچا بھی باہر نکلا تھا اسے نمبردار نے کسی کام سے اپنی حویلی بلایا تھا لاجو کو یہ بات پریشان کر رہی تھی پر اسے کھتی (جلدی) تھی درگاہ جانے کی اس لئے وہ مزید پریشان ہوئے بغیر درگاہ چلی گئی۔

پورا پنڈ خوشی سے جھوم رہا تھا اور میلے کی خوشی ہی دیدنی ہوتی ہے، ہر چہرہ خوشی سے کھلا ہوتا ہے، پنڈ کے سارے گھروں پر چونا پھرنے کے بعد ان کے باہری دروازوں پر بنے پھول بوٹے بہت بھلے لگ رہے تھے، ہر کوئی اپنے طریقے سے اور اپنی چادر کے مطابق میلے کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔

حویلی کی عورتیں بھی چراغاں کے لئے گھر سے جا چکی تھیں پر افضل ابھی گھر ہی تھا، لاجو کے بارے میں سوچتے ہوئے اپنے آپ اس کے ہونٹ کھل رہے تھے، اماں کو اس نے رات کو لاجو کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا پہلے تو سن کر غصے سے ان کی رگیں تن گئیں اک گانے والے کی

کنڑی، لیکن پھر افضل کی سچی محبت کے اور اپنی ممتا کے آگے مجبور ہو کر راضی ہو گئیں، جوان جہان لڑکا تھا کچھ کر بیٹھتا تو۔

نجمی ابھی کام میں لگی ہوئی تھی بیگاں بھی ادھر ہی تھی، بیگاں نے بتایا تھا کہ افضل گھر پہ ہے، پاگل دل اک واری پھر زور سے دھڑکا تھا، بیگاں آگے پیچھے ہوتی تو وہ اپنے پاگل دل کا کہا مانتی دور سے اس کی کھڑکی کے رستے کمرے میں دیکھنے لگی جہاں وہ تیار کھڑا شیشے میں خود کو دیکھ رہا تھا۔

لاکھ خود کو سمجھانے کے باوجود دل کے مچلنے کو وہ روک نہیں پا رہی تھی دل تھا کہ پاگل گھوڑے کی طرح سرپٹ اس کی طرف دوڑ رہا تھا نمبردار کا خوف بھی جیسے پل بھر کے لئے دور ہو گیا۔

”شیشے سے کیا پوچھ رہے ہو میرے دل سے پوچھو کیا ہو تم۔“ وہ پاگل ہرنی بنی اسے دیکھ رہی تھی اس کی محبت میں کلانچیں بھرتی جانے کہاں جا رہی تھی لیکن دلدل کے پیروں کے نیچے زمین نہیں ہوتی جو وہ اپنی طرف آنے والوں کو تھام سکے وہ تو صرف اپنے طرف آنے والوں کو اپنے اندر بھر لیتی ہے سانس تک روک دیتی ہے، اس نے اک ہوکا سا بھرا، اس کی بھی تو سانس رک گئی تھی۔

”کاش تیرے باپ سے پہلے تو مجھے مل جاتا۔“ اس نے حسرت سے سوچتے ہوئے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا کہ کہیں اس کی نظر نہ پڑ جائے اور بات نمبردار تک چلی جائے، نمبردار کا خوف تو اس کے اندر کنڈلی مارے بیٹھ گیا تھا جس کا اسے اندازہ نہیں تھا وہ جیسے اپنے دل کو سہارا دیتی واپس مڑ گئی تھی، بندہ اس رستے پہ پیر ہی کیوں رکھے جو کہیں جاتا نہ ہو، اس نے کسی تکلیف کے احساس تلے دبی آنکھیں موند لیں تو اسے اپنا پہلا رستہ یاد آ گیا جہاں اس نے منیر کے ساتھ پیر رکھے تھے لیکن اس راستے کو آگے چل کر جیسے کسی نے اپنے ہاتھوں سے توڑ کر دیے تھے اور بھلا کٹے ہوئے راستے بھی کسی کو منزل دیتے ہیں بلکہ وہ تو نیڑے (قریب) آئی منزل بھی دور کر دیتے ہیں اور پھر اپنے لئے اور دوسرے رستے تلاشتی وہ جانے کس کس دلدل کا حصہ بنتی گئی، کہیں مرضی سے کہیں زبردستی اور کہیں دل کی مرضی ہونے کے باوجود کچھ نہیں کر سکتی تھی، وہ پیاری میں آ کر اپنی پیڑھی پہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی، اب اسے اپنے لئے کچھ سوچنا تھا، وہ نجمی سے بات کرے گی اور شادی کر کے کہیں بہت دور چلی جائے گی۔

اس نے اپنی مرضی سے سب کچھ خود ہی طے کر لیا تھا اور آنکھیں بند کیے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لی۔

نجو کی آواز پہ اس نے آنکھیں کھول دیں اور اس کے یاد کروانے پر اسے یاد آیا کہ اس نے چراغاں کے لئے درگاہ جانا ہے، اپنا تھکا ہوا وجود اٹھاتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی، زخمی تن بدن کے ساتھ وہ کہاں تک دوڑ سکتی تھی۔

☆☆☆

دیا ہاتھ میں اٹھائے وہ درگاہ کے باہر آندھی کے زور سے ٹوٹے پیڑ کے بڑے سے تنے پہ بیٹھی درگاہ کی طرف آنے پر راستے پہ نگاہ لگائے ہوئے تھی، یہ دیا وہ خود گھر سے بنا کر لائی تھی، محبت کے آٹے سے گندھا ہوا یہ دیا وہ افضل کی محبت کی روشنی سے روشن کرنا چاہ رہی تھی۔

”اڈیک اڈیک کر میری تو آنکھیں دکھنے لگی ہیں افضل۔“ درگاہ پہ رش بڑھتا جا رہا تھا جوق در جوق مرد اور عورتیں اپنی مرادیں لئے درگاہ پہ حاضری دینے آ رہے تھے، میلہ ایک کھلے

سے میدان میں بچ چکا تھا، جھولے، ٹھیلے، موت کا کنواں، ہر قسم کے سامان کی عارضی دکانیں سجائی جا چکی تھیں، اندھیرا پھیل رہا تھا، شام کے سائے رات کے سیاہ آنچل میں ستارے ٹانکنے کے لئے جانے کہاں کہاں سے سفید نقرئی موتی اٹھائے بھاگے چلے آ رہے تھے، پیڑوں کی شاخوں پر بنے گھونسلے اپنے مکینوں کے انتظار میں آنکھیں بچھائے راستوں پر نظریں ٹکائے سراپا انتظار بنے ہوئے تھے اور وہ بھی سارے دن کے تھکے ہارے اپنے لئے کسی ایسی ہی محبت بھری پناہ کی چاہ لئے اڑتے چلے آ رہے تھے۔

دور برگد کا بڑا سا پرانا پیڑ بھی ایسے ہی کئی پرندوں کی رہائش گاہ تھا جس کی نیچے کو ڈھلتی شامیں تھوڑی دیر بعد اندھیرے میں گم ہونے والی تھیں، اردگرد بے پناہ پیڑ ہونے کی وجہ سے ان پر بیٹھے پرندوں کا شور ہولے ہولے بلند ہونا شروع ہو چکا تھا۔

گھر واپس آنے کا احساس ہر ایک کے لئے ایک سا ہوتا ہے اور اس خوشی کا اظہار کوئی خوش ہو کر کرتا ہے اور کوئی شور کر کے، پر لاجو کا دل افضل کے نہ آنے پر دکھی ہو رہا تھا، نذیراں چند کی باقی کڑیوں کے ساتھ درگاہ کے اندر گئی تھی۔

ڈرامے والوں کا تمبو بھی ایک طرف گول دائرے کی شکل میں کھڑا تھا، گول دائرے کے اندر زمین پر دریاں بچھائی جا چکی تھیں، اسٹیج بھی بچ چکا تھا، ہیر رانجھا کا تاریخی کردار نبھانے کے لئے مختلف اداکار اپنی تیاریوں میں مصروف تھے۔

شمشاد بار بار پردے کے پیچھے سے باہر جھانک رہی تھی اس کا چوہدری اسے نظر نہیں آ رہا تھا اس نے آنے کے لئے کہا تو تھا، وہ ہیر کا کردار نبھانے کی تیاری کر رہی تھی کیونکہ چراغاں کے بعد رات کو اس تمبو کے اندر اک چاند ابھرنا تھا جس کی روشنی کئی دلوں پر بجلی بن کر گرنے والی تھی نمبردار فضل الٰہی کو اپنی زلفوں کے پیچوں میں باندھنے کے لئے وہ اپنی تیاری پر ایڑھی چوٹی کا زور لگا رہی تھی، جائے تو جائے گا کہاں، پر اسے کیا پتہ تھا کہ اس کے جادو کے ساتھ ساتھ فضل الٰہی پر کسی اور کا جادو بھی کام کر گیا ہے، پچھی سی بنی اس کی عمر کے ڈھلتے پن کو اپنے پیار سے نئی زندگی نیا پن دے گئی تھی اس کے ہاتھوں کے جادو نے نمبردار کے جذبوں کو اک نیا رستہ دے دیا تھا لاکھ شمشاد سکی پر وہ پچھی کے آگے بے بس تھا اس نے پچھی کو صرف ڈرایا تھا کہ وہ ادھر اُدھر منہ مارنا بند کر دے، ورنہ وہ جس نظر سے اسے دیکھتا تھا وہ ہر ایک کے لئے نہیں تھی، نذیراں درگاہ سے باہر نکلی تو آگے وہ چپ چاپ بیٹھی تھی۔

''کیا ہوا...... ابھی تک۔'' وہ آگے کچھ بولتے بولتے رک گئی کیونکہ دور کھڑا افضل لاجو کو اشارے سے درگاہ کی دوسری طرف آنے کا کہہ رہا تھا۔

''اچھا چل جا، میں تجھے ادھر ہی اڈیک رہی ہوں۔'' نذیراں اسی پیڑ کے تنے پر بیٹھ گئی، وہ دیا اسے پکڑا کر آتے جاتے لوگوں سے بچتی بچاتی ادھر کو ہولی، تھوڑی دور جا کر دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

''اماں کو سب کچھ بتا دیا ہے میں نے۔'' چلتے چلتے لاجو کا دل جیسے سینے سے باہر بھاگنے لگا۔

''اماں کو، اب تو بات کھل جائے گی۔'' لاجو نے جھرجھری سے لیتے ہوئے قریب کھڑے پیڑ کا سہارا لے لیا، گری جو تھی وہ ہوکی پر ڈر سے اس کے پسینے چھوٹنے لگے، افضل اس چڑیا سا دل رکھنے والی کڑی کو ڈرتے دیکھ ہلکا سا مسکرایا۔

”تو...تو ڈر گئی ہے۔“ وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

”اب کیا ہو گا؟“

”اب کیا ہونا ہے، بس بیاہ ہو گا تیرا میرا۔“ افضل نے شرارت سے اسے چھیڑتے ہوئے اس کا ڈر بھگانے کی کوشش کی۔

”تو بھی ناں، میرا سن کر برا حال ہو گیا اور تجھے مذاق سوجھ رہا ہے۔“

”کون سودائی تیرے ساتھ مذاق کر رہا ہے، میں تو سچ بول رہا ہوں۔“ اس نے لاجو کو ہاتھ سے پکڑ کر خود کے قریب کر لیا۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے افضل کہیں کچھ ہو گیا تو؟“

”اب تو کچھ نہیں ہو گا یا تو ساتھ جئیں گے یا ساتھ مریں گے تیرے بغیر زندگی کا کوئی مزہ تو نہیں ہے ناں۔“ اس نے لاجو کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

”میرے ہوتے ہوئے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، میں نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ پرسوں میں شہر جا رہا ہوں، میری کلاسیں شروع ہو رہی ہیں، دو ڈھائی مہینے لگ جائیں گے اماں سے بات کی ہے واپس آ کر ابا سے بات کروں گا۔“ اس کے جانے کی بات سن کر لاجو کی آنکھیں یکدم پانیوں سے بھیگ گئیں۔

”پھر شہر، میں اکیلی یہاں، مجھے پہلے ہی ڈر لگ رہا ہے اور تم بھی شہر جا رہے ہو۔“

”سودائن نہیں بنتے، میری پڑھائی کا ہرج ہو جائے گا میرا جانا بہت ضروری ہے ورنہ میں تجھے چھوڑ کبھی نہ جاتا۔“

”افضل!“ فکر مندی نے اس کا رنگ زرد کر دیا تھا وہ اس کے ساتھ لگی زور زور سے رونے لگی۔

”کیوں روتی ہے تو، میں یہاں نہ ہو کر بھی تیرے پاس ہوں۔“ پر پتہ نہیں کیوں اس کا دل بہت دکھی ہو رہا تھا۔

چراغاں کرتے ہوئے بھی اس کی آنکھیں پانیوں سے بھری ہوئی تھیں، کبھی بھی درگاہ کے اندر موجود کبھی لاجو کو دیکھ اس کا دل کچوکے سے لگنے لگا، افضل بھی دور نویہ کے پاس کھڑا لاجو کو دکھی ہوتا دیکھ رہا تھا، کبھی افضل کے چہرے پر پھیلی بے چینی اور بے قراری دور سے بھی دیکھ رہی تھی، لاجو کی قسمت پر رشک کرتی وہ باہر نکل گئی کہ یہ منظر زیادہ دیر دیکھنے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔

درگاہ سے باہر آئی تو آگے نشی پکوڑوں والے ٹھیلے کے پاس کھڑا نظر آیا جو پکوڑے تلوا رہا تھا، کبھی کو اپنے پاس آتا دیکھ کر وہ بڑی پھیکی سی ہنسی ہنس دیا، پکوڑے والے کے پاس بڑا رش تھا، اس نے کاغذ میں پکوڑے رکھوائے اور دوسری طرف کبھی کو آنے کا اشارہ کرتا خود بھی ادھر کو ہو لیا، بچوں نے تو اودھم مچا رکھا تھا، اندھیرے سے خوف کھائے بغیر وہ بھاگ دوڑ رہے تھے، رش بہت زیادہ تھا ٹھیک طرح سے بات نہیں ہو رہی تھی اور کچھ لوگ بھی بہت تھے اس لئے نشی نے اسے ٹھہر کر گھر آنے کو کہا تھا۔

وہ وہاں سے سیدھی اپنے گھر آ گئی، چاچا عشاء کی نماز پڑھ کے گھر واپس آ چکا تھا پر اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی مشکل سے ہی چل پھر رہا تھا، بے بے چاچے کو کھانا کھلا چکنے کے بعد اس کے لئے بستر بچھا رہی تھی وہ دونوں سے بات کیے بغیر کوٹھری میں آ گئی اور جلدی سے وہ سوٹ ڈھونڈنے لگی جو نشی نے اسے دیا تھا۔

”کیا ڈھونڈ رہی ہو؟“ بے بے کے اچانک آ جانے پر وہ شپٹا سی گئی اور سوٹ کا بتاتی پھر مصروف ہو گئی۔

''اس وقت کیا ضرورت ہے تجھے کپڑوں کی، سویرے ڈھونڈ لیتا۔''

''میں نے فیقر جانا ہے میلے پر۔''

''پر ابھی تو تو آئی ہے فیقر۔''

''ساری کڑیاں جا رہی ہیں ڈنگی کا کھیل دیکھنے۔''

''تیرا باپ ٹھیک نہیں ہے کبھی اسے بھی پوچھ لیا کر کہ چاچا تو زندہ ہے کہ مر گیا۔'' وہ بھری پڑی رو دیں اس کی بے حسی پر۔

''بے بے یہ وقت ہے ان باتوں کا، سویرے کر لینا، کپڑے ڈھونڈنے دے۔'' بے بے نے بڑے افسوس میں سر کو جھٹکتے ہوئے اس کڑی کی عقل پر ماتم کیا اور باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

لاجو کے گھر آنے پر چاچا گھر آ چکا تھا، بھیگی آنکھوں کے ساتھ وہ چاچے کے لئے بستر لگا رہی تھی۔

''کیا بات ہے پتر تو ٹھیک تو ہے۔'' چاچے کو پوچھنے پر اس نے جلدی سے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

''ہاں میں ٹھیک ہوں چاچا۔''

''بلا پتر۔'' چاچا منجھی پر لیٹ گیا تو وہ منجھی کی ادوائین پر بیٹھتی چاچے کی ٹانگیں دبانے لگی۔

''نہ میرا پتر۔'' چاچا اس کے یوں ٹانگیں دبانے پر اٹھ کے بیٹھ گیا اور اسے گلے سے لگا کر رونے لگا وہ بھی پریشان پہلے ہی تھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''نہ عادی بنا مجھے ان باتوں کا، ایسے ہی رہنے دے تیرے بعد کون ہے جو رکھے گا میرا خیال نہ میرا پتر۔'' چاچے نے پیار سے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

''تو...... تو میری بڑی سوہنی دھی ہے، تیری جیسی دھی رب سوہنا سب کو دے، میری شرمیں لاجیں رکھنے والی دھی۔'' چاچے کی بات سن کر لاجو کا دل بند ہونے کو تھا، اس نے بھیگی آنکھیں اٹھا کر چاچے کی طرف دیکھا، کتنا مان تھا ان کی باتوں میں اور اب اگر انہیں پتہ چلے تو۔

''اوے میرے ربا۔'' اس نے شرم سے نظریں جھکا دیں۔

''میں تو رب کا لکھ لکھ واری شکر ادا کرتا ہوں جس نے تجھے مجھ غریب کی جھولی میں ڈالا اور اب اس دھی کو اپنے ہاتھوں رخصت کرنے کا وقت آ گیا ہے۔'' چاچے کی بات سن کر اس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ سر اوپر اٹھایا۔

''کیا مطلب ہے چاچا؟''

''تجھے ساری زندگی تھوڑی بٹھائے رکھنا ہے یہاں میں نے، تجھے تیرے گھر بھی تو بھیجنا ہے۔'' چاچے کی باتیں سن اس کے اندر کچھ کھٹکا۔

''تو کہاں گیا تھا چاچا۔''

''نمبردار نے بلایا تھا۔'' بات کرتے ہوئے وہ دوبارہ منجھی پر لیٹ گیا اور وہ چاہ کر بھی چاچے سے کچھ اور نہ پوچھ سکی۔

''کیا بات ہو سکتی ہے؟'' یہی باتیں سوچتی وہ اپنی منجھی تک آ گئی۔

☆☆☆

بھی پوری تیاری کے ساتھ منشی اکبر کے گھر آئی تھی، اب اس کے لئے سارا کچھ منشی ہی تھا اور آج وہ سارا کچھ اسے بتا دے گی، منشی کے حوالے سے بھی ابھی اس کے دل میں نمبردار کا خوف نہیں اترا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ منشی کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا بھی کا خیال تھا کہ منشی سے نکاح کر کے وہ اس پنڈ کیا اس شہر سے بھی دور بھاگ جائے گی، پیچھے کوئی حوالہ ہو گا تو وہ اس تک پہنچے گا ناں اور ویسے بھی اسے شک افضل کے حوالے سے تھا،

منشی کا تو اسے جیت جتنا بھی نہیں ہوگا پچھی کو دیکھ منشی پر تو جیسے بجلی گر گئی، اس کا سوہنا من موہنا حسن منشی جیسے نمبردار کے لارے کو فی الحال بھول ہی گیا۔

"میں نے تیرے ساتھ اک بات کرنی تھی۔" وہ اس کے بہت قریب بیٹھ گئی آ کر۔

"یہ وقت باتیں کرنے کا نہیں ہے۔" منشی کے ہونٹوں پر بڑی خبیث سی ہنسی چل رہی تھی، اسے تو من مانگے ہی مرادیں مل رہی تھیں، نمبردار اس کا رشتہ کسی اچھے گھر کرا دے گا اور پچھی وہ تو ویسے بھی مفت مال کی طرح تھی ایسا مال جسے خرچ کرتے ہوئے دل بے رحم ہو جاتا ہے وہ تو خود اپنا آپ اسے تحفے میں دے رہی تھی تو بھلا وہ کیوں ہاتھ پیچھے کرتا۔

"گل تو سن میری۔" پچھی نے جیسے اسے ہوش دلانے کی کوشش کی پر وہ تو آنکھوں میں جانے کون سا نشہ لئے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تجھے جو بھی کہنا ہے مجھے سب منظور ہے تو کوئی گل نہ کر بس۔" اس نے پچھی کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور وہ جو بات کہنے آئی تھی وہ اس کے اندر سے اٹھتے جذبوں کی نذر ہو گئی، منشی پاگل پاگل ہو رہا تھا اور بھلا پاگل کسی کی بات سنتے ہیں۔

☆☆☆

پچھلے دنوں وہ میلے کے لئے جتنی اتاولی ہو رہی تھی میلہ آنے پر اتنی ہی بے چین و پریشان ہو گئی تھی۔

"جانے نمبردار نے چاچے سے کیا کہا۔" وہ پریشانی سے بار بار اپنا ماتھا سہلا رہی تھی۔

"افضل بھی تو بتا رہا تھا کہ اس نے نمبردارنی کو سب کچھ بتا دیا ہے۔" اس نے زور سے ماتھے پر ہاتھ کا مکا بنا کر مارا۔

"ہو سکتا ہے اس نے نمبردار کو سب کچھ بتا دیا ہو، اس لئے اس نے چاچے کو بلایا، اب کیا ہو گا؟"

سویرے سویرے ہی میلے میں رونقیں لگ گئی تھیں، موت کے کنویں میں بجتا گراموفون دور دور تک اپنے سر بکھیر رہا تھا، نور جہاں کی سریلی آواز دلوں پر بجلی بن کر گرتی انہیں میلے کی طرف آنے پر مجبور کر رہی تھی۔

"سر دلوں پر راج کرتے ہیں جن کے بغیر زندگی بے رنگ و بے سری ہے۔" چاچے کی بات یاد کر کے وہ اور دکھی ہو گئی۔

"تو کیا انہوں نے چاچے کو سب بتا دیا ہو گا؟" اسے جھرجھری سی آ گئی۔

"پر چاچے نے اس پر ایسا کچھ ظاہر نہیں کیا تھا۔" دل ڈوبتا ابھرتا اسے نئے نئے وہموں میں دھکیل رہا تھا اسے چین نہیں لینے دے رہا تھا۔

"اگر انہیں پتہ چل گیا تو کیا وہ مجھے شرموں لاجوں والی دھی سمجھیں گے۔" اس کی آنکھیں شرمندہ سی نیچے کو جھک گئیں، اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی وہ کیا کرے، افضل ہی میرے دل کا بوجھ کم کر سکتا ہے، چاچے کا سوچ سوچ کر دل پریشان ہو رہا تھا۔

نذیراں لال گوٹے والی چنی اوڑھے جب آئی تب وہ پچھی پر چپ چاپ بیٹھی تھی۔

"ہائے نی کملیئے تو ابھی ایسے ہی بیٹھی ہے۔" اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا، نذیراں کو ہاتھ مارتی دیکھ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی پر بولی کچھ نہیں۔

"کیا ہوا، سودائن ہے تو بھی۔" اس کے کچھ نہ بولنے پر اس نے بازو سے پکڑ اسے ہلایا جیسے ہوش میں لا رہی ہو، وہ واپس منجھی پر بیٹھ گئی اور پھر نذیراں کو کچھ بتا دیا۔

"تو چل، افضل سے خود ہی بات کر لیتے

ہیں، چل جلدی کر۔'' اس نے جلدی سے قریب رکھے اس کے کپڑے اس کے ہاتھ میں پکڑا دیئے۔

آگے میلہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ رواں دواں تھا، چنڈ کی کڑیاں رنگ برنگے کپڑے پہنے جتھے کا جتھا بنی، ہنستی کھلکھلاتی گلیوں کی دھول اڑاتی میلے میں جا رہی تھیں، گرمی کے بڑھتے سایوں نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، اونچے اونچے جھولوں پر بیٹھے ننگے تڑنگے بچے خوشی سے جھوم رہے تھے، گرمی کے ماروں نے برف کے گولوں والے کے گرد گھیرا تنگ کر رکھا تھا، پکوڑوں اور جلیبیوں والی عارضی دکانوں سے اٹھتی خوشبوئیں پیٹ کی بھوک کو ہوائیں دے رہی تھیں۔

مختلف گانے والوں کی ٹولیاں گلے میں ہارمونیم لٹکائے ڈھولک لٹکائے گا گا کر لوگوں کو تفریح پہنچا رہی تھیں، موت کے کنوئیں کے باہر کھڑی خواجہ سراؤں کی ٹولی زنانہ کپڑے پہنے نور جہاں کے گانوں پر ناچتی لوگوں کو اپنی طرف بلا رہی تھی۔

لاجو کی پریشان آنکھیں جگہ جگہ افضل کو ڈھونڈ رہی تھیں اتنے رش میں وہ جانا پہچانا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا، بے چین و بے قرار دل سینے سے باہر بھاگا نکلا جا رہا تھا، ہائے کوئی سنبھالے اسے، افضل کی اک جھلک دیکھنے کے لئے وہ ہر چہرے کو بڑے دھیان سے دیکھ رہی تھی۔

وہ نذیراں کے ساتھ جہاں کھڑی تھی وہاں سے تھوڑی دور خورشید اور اس کے گھر والے اینٹوں کا عارضی تھڑا بنائے اس پر تین چار بوریاں بچھائے اپنے ساز و سامان کے ساتھ موجود تھے، باپ ہارمونیم اور بھائی ڈھولک بجا رہا تھا ماں پاس بیٹھی اداس و پرملال خورشید دکھی دل کے ساتھ خوشی والا گیت جانے کس دل سے گا کر لوگوں کو اپنی اور بلا رہی تھی، وہاں رش زیادہ نہیں تھا جو سر کے قدر دان تھے چاچے اور پا لطیف کے سمیت وہاں موجود تھے۔

اس نے بڑی حسرت سے پا لطیف کی طرف دیکھا جو جانے کیسی آس لگائے اسے دیکھ رہا تھا، پتہ نہیں اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے، اک بنجارن کا پیار یا ساری زندگی کی خواری۔

نذیراں اسے کھینچتی ہوئی چوڑیوں والے ٹھیلوں تک لے آئی، جہاں کڑیاں من چلے نوجوانوں کے ہاتھوں میں اپنی گوری گوری کلائیاں تھماتی کانچ کی لال ہری چوڑیاں چڑھا رہی تھیں، نذیراں نے بھی اپنی کلائی ایک نوجوان کے آگے کر دی، پاس ہی کھڑی تھی جو دونوں کلائیوں میں چوڑیاں پہننے کے بعد اک طرف ہو کر کھڑی تھی، لاجو کو حسرت کی تصویر بنی دیکھتی جا رہی تھی اور اس میں وہ گن تلاش کر رہی تھی جس کی بنا پر افضل جیسے یکتا مرد نے اسے اپنے لئے چنا تھا، جواب تو اس کے پاس تھا مگر اپنی برائی کون کرتا ہے، افضل کے بارے میں وہ اتنا تو سمجھ ہی گئی تھی کہ وہ ایک ایسا بند کمرہ ہے جس کی کنجی لاجو کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا اس کی طرف بڑھنا نمبردار کے عتاب کو آواز دینا ہے سو اس سے بہتر ہے بندہ اسی راستے پر چلے جو ساری زندگی ساتھ دے، اس نے ٹھنڈے گولوں والے کے پاس کھڑے منشی پر نظر ڈالی، میری منزل یہی بندہ ہے، اس نے ٹھنڈی سی آہ بھری اور وہاں سے آگے پیچھے ہو گئی۔

برف کے گولوں والے کے پاس کھڑا منشی کسی کے ساتھ کان میں کھسر پھسر کر رہا تھا ابھی نذیراں نے چوڑیاں پہنی نہیں تھیں کہ وہ نمبردار کے کامے بدر کے ساتھ وہاں آن موجود ہوا، لاجو

تو پہلے ہی آپے سے بے خبر افضل کی تو وہ میں تھی، نظریں بچاتے ہوئے بدر نے منشی کو لالاجو کی طرف اشارہ کیا جو ہلکے آسمانی رنگ کے کپڑوں میں بڑی جچ رہی تھی، سرخ وسفید رنگت پر کھلتا وہ رنگ، منشی تو جیسے بولنے کی طاقت سے بھی گیا، بڑی دنیا دیکھی تھی پر پہلی واری ایسا با حیا حسن دیکھا تھا کہ مانو ہیرا تھا جس نے اس کی آنکھیں چندھیا دی تھیں ہر طرف وہی چہرہ نظر آنے لگا تھا، نمبردار نے تو جیسے چاند آسمان کے سینے سے توڑ کر اس کی جھولی میں ڈال دیا تھا، یہ کڑی اسی پنڈ کی رہنے والی ہے اور مجھے پتہ ہی نہیں، منشی نے ہنستے ہوئے سوچا۔

بچھی جانے کہاں غائب ہو گئی تھی، اب دنیا چاہے ادھر کی ادھر ہو جائے اگر یہ کڑی نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

نذیراں پکوڑوں والا کاغذ ہاتھ میں پکڑے اس کے پاس آن رکی۔

''یہ کھا۔''

''میرا دل نئی چاہ رہا۔'' وہ افضل کے نظر نہ آنے پر دکھی سی بولی۔

''تیرا دل جیسے چاہ رہا ہے ناں وہ تو شہر چلا گیا۔'' نذیراں کی بات پر وہ یوں اس کی طرف پلٹی جیسے اس نے دل میں چھری گھونپ دی ہو۔

''تیری سونہہ، مجھے بچھی نے بتایا کہہ رہی تھی چھوٹے چوہدری صاحب تو سویرے سویرے ہی چلے گئے تھے۔''

''وہ مجھے ملے بغیر کیسے جا سکتا ہے۔'' جانے کی بات سن تکلیف سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اس نے اک نظر اپنے آپ پر ڈالی، کتنا تیار ہو کر آئی تھی وہ، وہ قریب پڑے لکڑی کے اسٹول پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ لے لیا، وہ تو پہلے ہی اتنی پریشان تھی اوپر سے وہ بھی۔

اس نے چہرہ اوپر اٹھایا لال سوئی آنکھیں اندر پھیلی ویرانی کی گواہ بنی ہوئی تھیں، یہی میلہ یکدم اسے ویران ویران لگنے لگا تھا کیا رہ گیا ہے یہاں، اس نے اپنے آنسو دوپٹے سے صاف کیے اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

چاچا گھر نہیں تھا اور اس چیز کا اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا، میلے میں رکے آنسو گھر آتے ہی ہاڑ (سیلاب) کی صورت اس کی آنکھوں کے نالوں سے بہنے لگے وہ جی بھر کے روئی۔

سارا دن گرمی بھی خوب پڑی تھی اور اب ہوا جیسے آندھی کی صورت اختیار کرنے لگی تھی پر اس کو تو ہوش ہی نہیں تھا، وہ تو لکڑی کے پٹ آپس میں ٹکرائے تو وہ چونکی پھر اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کی پوروں سے آنسو صاف کیے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

کیا پتہ اس کی کوئی مجبوری رہی ہو جو وہ بتا نہ سکا دل نے جیسے اپنے تئیں اسے دلاسہ دینے کی کوشش کی اور وہ دکھی دل کے ساتھ اس دلاسے کو سینے سے لگائے باہر ویڑے میں آ گئی جہاں جامن کے پتوں نے سارے ویڑے میں گند مچا رکھا تھا، لگتا ہے آج مینہ ضرور برسے گا، اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔

☆☆☆

منشی پہلی فرصت میں ہی نمبردار کے پاس پہنچا تھا مگر اس کے کامے نے بتایا تھا کہ وہ ڈرامے والی شمشاد کے پاس ہے۔

میلہ ختم ہونے کے بعد شمشاد نمبردار کی اس حویلی میں تھی جو جنگل کے بیچ تھی، نمبردار ارد گرد کے کام بھولے اس وقت شمشاد کی گود میں سر رکھے ہوئے تھا۔

''تیرے سے تو تیری یادیں بھلی ہیں چوہدری جو میرے پاس تو رہتی ہیں۔'' شمشاد

بڑے پیار سے اس کی خضاب لگے بالوں میں ہاتھ پھیرتی بولی تو وہ اس کا ہاتھ کھینچ اسے اپنے بہت قریب لے آیا۔

"اس وقت کیا میرا فرشتہ تیرے پاس ہے۔"

"اسی وقت ہوناں، کتنے کتنے دن تم میری خبر نہیں لیتے۔" وہ ناراضگی والا منہ بنائے نمبردار کو بڑی سوہنی لگی۔

"ہر گاہک میں مجھے تو ہی نظر آتا ہے، مجھے تو کچھ نہیں آتی تو ہر وقت میرے خیالوں پے کیوں چھایا رہتا ہے۔"

"میری سوہنی یہ اپنے دل سے پوچھ، جو میرے پیچھے پاگل ہو رہا ہے۔" اس نے شمشاد کے ہاتھ پر بوسہ دیا تو وہ بڑی آس سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"اور تو۔" اس کے سوال پر نمبردار اک لمحے کے لئے خاموش ہو گیا یہاں وہ اسے کیا جواب دیتا وہ جس کے پیچھے پاگل تھا اس کی بے وفائی تو اسے دوبارہ شمشاد کے پاس لے آئی تھی پر دل پھر بھی اسے ہی کھوج رہا تھا، نمبردار نے اپنے دل پر بوجھ سا محسوس کیا اور آنکھیں بند کر لیں، تبھی کا وہ گداز بدن جیسے جھوم کر اس سے لپٹ گیا، اس نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں تو شمشاد کا سوالیہ چہرہ اسے اپنے اوپر جھکا ہوا ملا وہ اب کیا کہے اسے دل تو اس پر کبھی آیا تھا کبھی۔

"پاگل ہوں اس لئے تو یہاں ہوں۔"

"تو..... تو مجھے مار ہی دے گا چوہدری۔" شمشاد اس کے جواب پر واری واری جانے لگی تھی۔

"تیرے سے الگ ہوئی تو مر جاؤں گی۔"

"اتنا پیار کرتی ہے تو مجھ سے۔"

"تیری سونہہ بہت زیادہ۔" نمبردار کی آنکھوں میں تبھی کی پرچھائی سی لہرا گئی ایسی باتیں وہ بھی بہت دفعہ اسے کہا کرتی تھی، تو کیا وہ سب فریب تھا یا مجھ سے زیادہ اچھے اور جوان کی چاہ اسے مجھ سے دور لے گئی، اس نے مکا سا بنا کر پلنگ پر مارا۔

"کیا ہوا؟" شمشاد چونکی۔

"کچھ نہیں، لگتا ہے باہر بارش ہونے لگی ہے۔" کن من کن من کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔

"ہاں شور تو ہو رہا ہے۔" شمشاد اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلی آئی اور باہر جھانکنے لگی، تبھی بارش کی تیز بوچھاڑ اس کا منہ گیلا کر گئی، وہ یکدم بارش کی اٹھکیلی پر مسکراتی ہوئی پیچھے کو ہٹ گئی۔

رات کا وقت اور اندھیرے میں درختوں کے پتوں پر گرتی بارش کا شور، کتنا سہانا منظر تھا، شمشاد نے پلٹ کر منہ پر گرتی بارش کی بوندوں کو پلو سے صاف کیا، فضل الٰہی مسکراتا ہوا اسے ہی دیکھ رہا تھا، جانے کیا ہوا تھا اسے وہ بھی چند ثانیے کے لئے خاموش دیکھتی رہی، پلنگ اور کسی مرد کا ساتھ، یہ تو روز کی باتیں تھیں پر بدن کے ساتھ من کے سکون کا ہونا بھی بہت ضروری ہوتا ہے اور یہ سکون صرف فضل الٰہی کے پاس آ کر ہی ملتا تھا ہر شے کی ایک بھوک ہوتی ہے جیسے آنکھوں کی بھوک من چاہا منظر مٹاتا ہے کانوں کی بھوک من چاہی بات مٹاتی ہے اس طرح دل کی بھی ایک بھوک ہوتی ہے اور دل کی بھوک تب تک نہیں مٹتی جب تک اسے سکون نہ ملے اور سکون بھی بہت سی قسموں کا ہوتا ہے پر جو سکون چاہنے والے کو اپنے چاہنے والے کے پاس آ کر ملتا ہے حقیقت میں وہی سکون دل کو جینے کے لئے کافی ہوتا ہے، سکون۔

☆☆☆

سارا زمانہ آرام و سکون سے آنکھیں موندے لمبی تان کر سو رہا تھا مگر اسی پنڈ کی اک کڑی بے چین و بے قرار کھڑکی کے ساتھ سر لگائے باہر گرتی بارش سے اپنے دل کا سکون مانگ رہی تھی جو اس کے پاس بھی نہیں تھا۔

چاچا تھوڑی دیر پہلے اس کے پاس سے گیا تھا اور جو بات اس سے کر کے گیا تھا اس نے دل کا رہا سہا چین بھی چھین لیا تھا اور اب وہ رو رو کر اپنے رب سے دعائیں مانگ رہی تھی کہ یارالٰہی اس رحمت کے ساتھ تو اس دل کو سکون بھی واپس کر دے افضل کی شکل میں۔

چاچے نے اسے نمبردار فضل الٰہی کے پاس جانے کا مقصد بتایا تھا اور وہ اس بات سے زیادہ دکھی اور پریشان ہو رہی تھی کہ اس بات میں اس کا چاچا بھی راضی تھا۔

''پتر کلا کارا منڈا ہے اور سب سے بڑی بات کہ نمبردار اس کی ذمے داری لے رہا ہے کہ وہ پنڈ میں ہی رہے گا، پتر میں تیرا وچھوڑا نئی سہہ سکدا۔'' چاچے کی باتیں اس پر کسی تیز دھار کی طرح پڑ رہی تھیں۔

اب بھی وہ اس کی باتیں یاد کرتی لوہے کی سلاخوں پر سر مار رہی تھی جیسے وہ کسی قید میں ہے اور آزادی چاہ رہی ہے رات کے اندھیرے میں ہوا کے زور سے جھولتی جامن کی شاخوں پر گرتے بارش کے موٹے موٹے قطرے اسے اپنے دل پر پتھروں کی طرح برستے معلوم ہو رہے تھے، وہ کالی بدلیاں آسماں نہیں اس کے دل پر کنڈلی مار کے بیٹھ گئی تھیں، اس اندھیرے میں باہر نکلنے کی کوئی بھی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی، میں کیا کروں میرے سوہنا ربا۔

افضل کے سوا کسی دوسرے مرد کو سوچنا بھی اسے گناہ لگ رہا تھا، پر وہ اپنے چاچے کو کس طرح نہ کرے، یہ کیسے دو رستے تھے جن میں سے اسے کسی ایک کو چننا تھا۔

چھاجوں برستا مینہ اور اس کی آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے اتھرو، کیا فرق تھا دونوں میں، آسمان کے سینے میں ہوتی گھن گرج اور اس کے سینے میں اتھا ارمانوں کا شور، کیا فرق تھا۔

کوئی فرق نہیں تھا، آسمان سے گرتی بارش کے برستے بھی زمانہ چین سے سو رہا تھا اور اس کے بہتے اتھرو بھی کسی کے آرام میں خلل نہیں ڈال رہے تھے، بے چین تھا تو کھلا آسمان اور اس کا مجبور دل۔

افضل نے ابھی بہت دن بعد آنا ہے وہ اپنے ہاتھوں سے چہرہ مسلنے لگی۔

دل اک بے چین سمندر بنا ہوا تھا جو اسے ایک جگہ بیٹھنے نہیں دے رہا تھا وہ چلتی ہوئی اپنی بھی تک آگئی چاچا دوسرے کمرے میں تھا، بجھی پر لیٹنے سے بھی چین نہ آیا اور اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر واپس کھڑکی میں آگئی۔

دور آسمان کے سینے میں کڑکتی بجلی کے لشکارے سے گزری یادوں کے در کھول دیے تھے، افضل کے ساتھ گزری یادوں کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا اور دور چمکتی بجلی کے لشکاروں نے خوبصورت گزرے لمحوں کو آواز دے دی تھی جو اس آواز پر دوڑے چلے آئے تھے۔

برسات کے دن تھے آموں کے باغ میں پنڈ کی کڑیوں نے مالی سے پوچھ کر آموں کے موٹے تنوں پر جھولے ڈالے تھے اور یہ برسات اور ساون کی برسوں پرانی ریت تھی جسے لوگ اب تک نبھا رہے تھے۔

نکی، نکو، کوثر، بلقیس، چاچی خالدہ کی شبانہ، نمو اور تائی زلیخا کی کبری ساری کڑیاں وہاں موجود تھیں۔

لاجو جھولے پر بیٹھی ہواؤں کے ساتھ اڑ رہی تھی افضل کا مست خیال اسے سنبھالا دیئے ہوئے تھا۔

"جھولے جھولے ہوا کے ساتھ خود بھی نہ اڑ جانا۔" کمو نے اس کے جھولے کو پکڑنے کی کوشش کی مگر پکڑ نہ سکی۔

"جو میرے ساتھ ہے وہ مجھے گرنے نہیں دے گا۔" وہ ہولے سے بولی تھی جسے کمو سن نہیں پائی تھی، یوں تو وہ ان کڑیوں کے ساتھ تھی پر دل تو کہیں افضل کو کھوج رہا تھا، کاش اس وقت وہ مل جائے۔

بارش ختم ہو چکی تھی بس بھیگے ہوئے آموں کے پیڑوں کے پتوں پر ٹکا پانی قطروں کی صورت میں زمین پر گر رہا تھا، جیٹھ اور آساڑھ کی آندھیوں کی گرد سے اٹے پیڑوں کے پتوں کو برسات کے پہلے چھلے نے دھو کر رکھ دیا تھا، گہرے سبز رنگ کے پتے نکھر نکھر گئے تھے، ہوا پہلے سے تیز ہو گئی۔

دل کو دل سے راہ ہوتی ہے افضل بھی جانے کہاں سے ادھر آن نکلا تھا دور سے لاجو کو جھولا جھولتے دیکھ دل خوشی سے اچھلنے لگا، لاجو بھی اسے دیکھ چکی تھی دونوں کی آنکھیں سچے موتیوں کی طرح چمکنے لگیں، جھولا اپنے آپ ہی دھیما پڑ گیا، ساری کڑیاں ہنسی مذاق میں تھی اپنے آپ میں مگن تھیں صرف نذیراں تھی جس نے اس کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ لئے تھے اور پھر اس کی نظروں کی سمت دیکھا، ہنسی ہونٹوں پر مچل گئی۔

"لے تیری دعا تو قبول ہو گئی، اب جمعرات کو درگاہ پر میٹھے روٹ بانٹنا ضرور۔" نذیراں کی بات پر وہ برسات کی میٹھی پھوار کی مانند کھل سی جا رہی تھی جس کے ساتھ کی دل دعائیں مانگ رہا تھا وہ سامنے کھڑا تھا، کیا دعائیں ایسے بھی قبول ہوتی ہیں، اپنی خوش قسمتی پر اسے یقین نہیں آ رہا تھا، رب سوہنا اتنا نیڑے ہو کر اس کی دعائیں سن رہا تھا۔

"اچھا اب چل ہٹ۔" نذیراں نے مصنوعی غصہ دکھایا، وہ نذیراں کی نگرانی میں سب کڑیوں نے بچتی بچاتی ادھر کو چلی گئی۔

افضل کو اس نے ہلکے ہلکے بھیگے جلیے میں پہلی بار دیکھا تھا، نظر نہیں ہٹ رہی تھی، وہ دونوں ایک بڑے سے آم کی اوٹ میں ہو گئے۔

"یہ دل تمہیں کھوجتا کھوجتا ادھر کو نکلا اور دیکھ لو اس نے تمہیں کھوج ہی لیا۔" افضل نے اس کے بھیگے ہوئے سراپے پر اک نظر ڈالی وہ شرما کر نظریں نیچی کر گئی۔

افضل نے جیسے ہی اس کے ٹھنڈے گلابی گال کو چھوا تو گئے بادل یکدم جانے کہاں سے دوبارہ آن دھمکے اچانک بارش نے جیسے ہر طرف اک سفید چادر سی کھڑی کر دی، پیڑوں میں گھنگھروں ڈالے چھم چھما چھم کرتی بارش پیڑوں کی شاخوں پر ناچنے لگی، پل میں یوں لگا جیسے اک چھنگاری سی سارے میں گونجنے لگی ہو، بارش کا پانی مستیاں کرتا نالیوں کی صورت گیلی زمین پر بہنے لگا۔

لاجو یکدم برسنے والی اس بارش سے گھبرا کر افضل کے ساتھ جا لگی، کڑیاں جھولوں پر بیٹھی زور زور سے ہنسی بارش میں بھیگ رہی تھیں، بارش کے پانی میں بھیگنا کتنا اچھا لگ رہا تھا۔

بارش کا پانی آموں کے پتوں پر سے پھسلتا ہوا ان دونوں کو بھگو رہا تھا، لاجو اس سے الگ ہوئی سر نیچا کیے مسکراتی ہوئی شرما رہی تھی اس کی سیدھی مانگ سے پانی بہہ کر ماتھے سے ہوتا ناک کی سیدھ سے نیچے گر رہا تھا، پانی کے قطرے سرخ و سفید گالوں پر مچل مچل رہے تھے اور کئی

قطرے پل کے لئے پلکوں پر ٹھہر کر نیچے کو لڑھک رہے تھے، کالے بالوں کی سیاہ لٹیں بھیگ کر گالوں سے چپک رہی تھیں۔

حسن کا ایک سمندر تھا جو افضل کے سامنے موجود تھا اور اس سمندر میں کون کافر تھا جو ڈوبنا نہیں چاہتا تھا۔

افضل کا چھ فٹ لمبا بھیگا وجود لاجو اپنی آنکھوں میں سما نہیں پا رہی تھی، لاجو کی ایک طرف کو ڈھلکی چنی افضل نے ٹھیک کر کے سر پر جما دی تھی ایسا کر کے اس نے اپنے مچلتے جذبات کو سنبھالا دیا تھا، لاجو نے بڑی محبت اور ارمان سے افضل کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں دعا کی کہ ساری حیاتی یہ یونہی مجھے سنبھالا دیے رکھے۔

بجلی زور سے کڑکی تھی کھڑکی کی ٹھنڈی سلاخوں کے ساتھ ٹکا سر اوپر کو اٹھا، یادوں کے در جیسے بند ہو گئے۔

''افضل میں نے کیسے کیسے سفنے دیکھے تھے کیا وہ پورے ہوں گے۔'' وہموں سے لپٹے دل نے جانے کیا جواب دیا کہ اس نے زور زور سے روتے ہوئے کھڑکی کا پٹ کھٹ سے بند کر دیا اور منجی پر اوندھے منہ آ گری۔

☆☆☆

منشی کی ہاں پر نمبردار نے چاچے کو اپنے پاس بلایا تھا اور چاچا تو پہلے ہی راضی تھا۔

''جاؤ نمبردارنی سے کہو میرے لئے ٹھنڈا گلاس لسی کا بھیجے۔'' نمبردار نے اپنے کامے سے کہا اور خود نواڑی پلنگ پر دراز ہو گیا تھوڑی دیر بعد پھپھی لسی کا ٹھنڈا گلاس اٹھائے اندر آ گئی۔

ڈری ڈری سی، پہلے والی کوئی شوخی دکھائی نہیں دے رہی تھی، نمبردار نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا حسن سے مالا مال، وہ کافی دیر اسے چپ چاپ دیکھتا رہا، پھر بڑی فاتحانہ ہنسی ہونٹوں پر لا... ہوئے اسے وہاں سے جانے کے لئے کہا۔

''سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی سلامت ہے۔''

لسی کا گلاس خالی کر کے وہ اٹھا اور اپنے کمرے میں آ گیا آگے نمبردارنی اپنی چھوٹی نو زلیخا کے ساتھ کسی بات پر بحث کر رہی تھی سسر کو آتا دیکھ کر وہ جلدی سے بچہ گود میں اٹھائے سلام کرتی باہر نکل گئی۔

''کیا کہہ رہی تھی یہ۔'' دروازے کی طرف دیکھتا وہ آگے بڑھا آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا نمبردارنی بھی اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

''کبھی آپ نے بھی پوچھ لیا کرو کہ میں کیا کر رہی ہوں۔'' نمبردارنی کو جانے کیا سوجھی تھی جو یہ سوال کر بیٹھی تھی ورنہ آگے پیچھے بچوں میں مصروف ہوتے ہوئے وہ اتنا پاس نہ آ سکی تھی کہ بیٹھ کر دو پل پیار کی باتیں ہی کر لیں۔

''میں نے پوچھا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔'' نمبردار اپنے ازلی اکھڑ موڈ میں ہی تھا اس کا پیار پر ذرا بھی نہ پگھلا تو وہ ٹھنڈی سی آہ بھر کے تھوڑا پیچھے کو سرک گئی۔

''میکے جانے کا کہہ رہی تھی، مہینے بھر کے لئے۔''

''تو؟''

''مختار روک رہا ہے، مجھے سفارش کے لئے کہہ رہی تھی۔''

''تو ٹھیک کر رہا ہے وہ مہینہ بھر کون رہنے دیتا ہے بھلا۔'' نمبردار کی بات سن کر بھی وہ چپ ہی رہی بھلا اتنی بھی بے حسی کیا ہوئی میں بیوی ہوں۔

''نذیر آج پھر آیا تھا میرے پاس، میں نے ہاں کہہ دی ہے، افضل شہر سے واپس آئے تو منگنی کی تیاری کرو۔'' نمبردارنی جو اس کے رویے پر
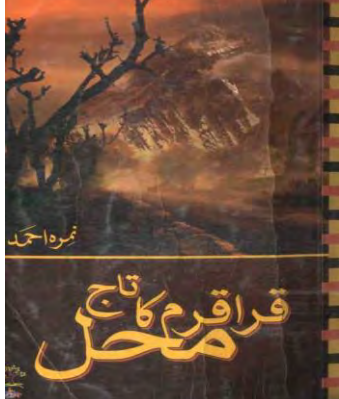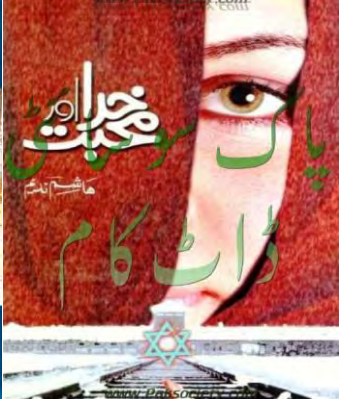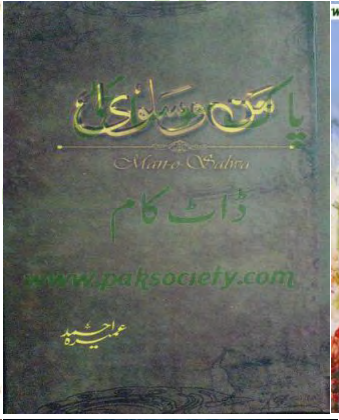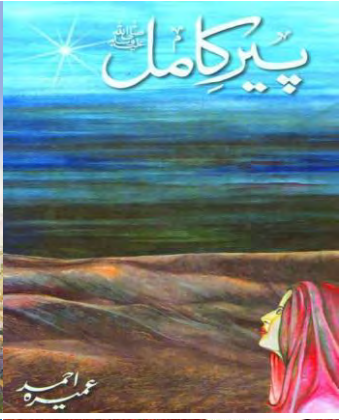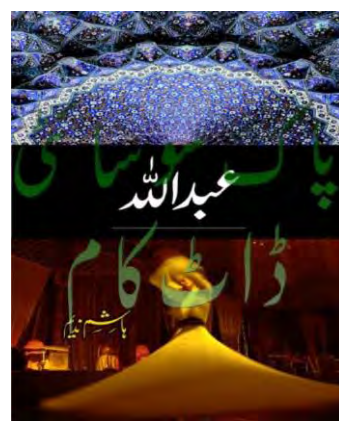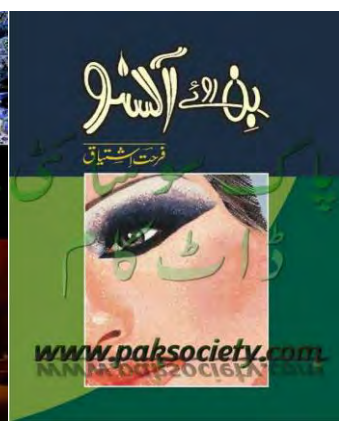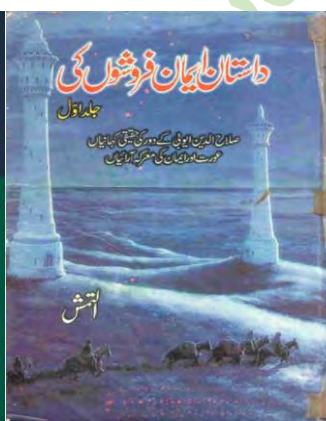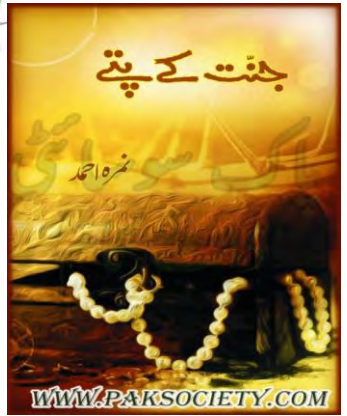
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

بد دل سی بیٹھی تھی، نمبردار کی بات سن کر اٹھ کھڑی ہوئی، نمبردار اسے یوں حیران و پریشان ہو کر اٹھتا دیکھ غصے میں آ گیا۔

"کیا ہوا ہے ایسا کیا کہہ دیا ہے میں نے۔"

"افضل نہیں مان رہا۔" وہ ایک ماں تھی اپنے بیٹے کی پسند کو مان دینا چاہ رہی تھی۔

"نہ مانے پر بیاہ اس کا وہیں ہوگا جہاں میں چاہوں گا۔" وہ کرسی کے بازوؤں پر زور سے ہاتھ مارتا اٹھ کھڑا ہوا، نمبردارنی گھبرا کر پیچھے کو ہٹ گئی، خوف آتا تھا اسے اس کے غصے سے، پر یہاں بات اس کے بیٹے کی تھی اسے ہمت کرنا تھی، وہ کچھ دیر کھڑی خود میں ہمت جتاتی رہی پھر ایک قدم آگے کو بڑھ آئی۔

"تو ضد کیوں کر رہا ہے، وہ نہیں چاہتا تو تو رہنے دے۔"

"وہ سب تیری شہہ پر کر رہا ہے، جو وہ چاہتا ہے میں ایسا اسے کرنے نہیں دوں گا، ایک گانے والے کی بیٹی کے لئے میرے ساتھ اڑ رہا ہے وہ۔" اس نے غصے سے نمبردارنی کی طرف انگلی اٹھائی۔

"اچھا تو یہ سب جانتے ہیں اس لئے۔" نمبردارنی نے سوچا۔

"گانے والے کی کیا عزت نہیں ہوتی۔" وہ بڑے کرب سے بولی آخر کو وہ اس کے بیٹے کی پسند تھی۔

"میں نے تیری دلیلیں نہیں مانگیں، جو کہہ دیا کہہ دیا۔" وہ بڑے حتمی لہجے میں بولا۔

"تو اچھا نہیں کر رہا، وہ ہمارے پتر کی پسند ہے، حیاتی سمجھتا ہے وہ اسے اپنی، وہ خوش نہیں رہے گا وہ اس کے بنا۔"

"خوش رہنا پڑے گا اسے کیونکہ وہ کڑی اب منشی اکبر کی منگ ہے۔" وہ نمبردارنی کو کرنٹ کا جھٹکا دے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

"منگ۔" نمبردارنی پر تو جیسے یکدم کوئی دیوار سی آن گری، منشی اکبر کی منگ، افضل تو کہہ رہا تھا، وہ پریشانی سے ادھر اُدھر چکر کاٹنے لگی، نمبردار کی ساری چالاکی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

افضل نے ابھی اتنے دن بعد آنا ہے اس کے پیچھے یہ سب ہو گیا، میرے بچے کی تو خوشیوں کو آگ لگ جائے گی۔

پہلے تو انہوں نے بھی اس کی چھوٹی ذات کا نقطہ اٹھایا تھا، اک چوہدری کے ساتھ ایک گانے والی کا کیا جوڑ ہو سکتا ہے، پھر انہوں نے افضل کو لوگوں کی باتوں کا واسطہ دیا زمانہ کیا کہے گا، مگر وہ کسی کی نہ مانا، اس کے لئے اول و آخر زاجو ہی تھی اور اگر وہ نہ ملی تو ساری زندگی بیاہ نہیں کرے گا، گھر سے چلا جائے گا اور کبھی کسی کو منہ نہیں دکھائے گا، وہ ایک ماں تھی اس کی باتوں میں آ گئی۔

☆☆☆

پھپھی نمبردار کی حویلی جانے کے لئے تیار کھڑی تھی جب اس کی بے بے اسے کھڑا دیکھ اس کے پاس چلی آئی، جو بالوں میں کنگھی کر کے دوپٹہ سر پر جما رہی تھی۔

"کتنی سوہنی ہے میری بیٹی پر نصیبوں کے ساتھ نہ دیا، روڑی کے کتے سے بھی بدتر ہے اس کی قسمت۔" ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"کیا بات ہے بے بے۔" وہ یوں انہیں روتا دیکھ گھبرا گئی۔

"کچھ نئی، بس ایسے ہی تجھے دیکھ کر دل بھر آیا کہ تو کب تک ایسے ہی رہے گی۔"

"تو دل پر نہ لے بے بے سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

"تو دیکھ کیسے میری قسمت جاگتی ہے۔" وہ بے بے سے بات کرتی رتی باہر نکل گئی اسے حویلی سے دیر ہو رہی تھی، بے بے نے بڑی حسرت سے اسے جاتا دیکھا، کیا پتہ سب ٹھیک ہو ہی جائے کہ تیرے نصیب جاگ جائیں پر جن کی قسمت میں پہلے دن سے بربادی لکھی ہو وہ بھی ہری نہیں ہوتی، بچھی جو اپنے لیے خوابوں کے یہ بڑے بڑے محل بنا رہی تھی اسے پتہ ہی نہیں تھا کہ یہ محل بھربھری ریت کی طرح ایک پل میں ہی زمین پر ڈھیر ہو جائے گا، وہ جو منشی کو اپنانے کا اتنا بڑا فیصلہ کر رہی تھی اسے پتہ ہی نہیں تھا کہ لاجو کو دیکھ کر منشی کب کا اسے اپنے ذہن سے اتار چکا ہے۔

بچھی کیا تھی نمبردار کے ہاتھوں بنا ایک کھلونا جس سے تھوڑی دیر کے لئے اس نے بھی دل بہلا لیا تھا اور ضروری نہیں ہوتا جس چیز سے دل بہلایا جائے اس کو دل کی حکومت بھی سونپی جائے، دل تو ایک ایسا گھر ہے جس میں صرف وہی سما سکتا ہے جو اس قابل ہو جس پر وہ فخر کر سکے اور بچھی میں فخر لائق کیا چیز تھی، لالچ، خود غرضی، فحاشی، یہ تین لفظ تھے جن سے گندھی تھی وہ۔

وہ حویلی کے اندر داخل ہوئی پہلی نظر منشی پر پڑی دل گلاب کی طرح کھل اٹھا، یہ کیسا دل تھا جو افضل کی محبت میں ڈوبا اور کبھی نمبردار کی اک جھلک دیکھنے کے لئے بے تاب رہتا تھا اور اب منشی کو دیکھ گلاب کی طرح کھل گیا تھا۔

نمبردار کے پاس وہ اپنی لالچ کے لئے جاتی تھی اور افضل، کیسی محبت تھی یہ، جو ڈر اور خوف سے کہیں دور جا چھپی تھی، محبت جو ہوتی ہے وہ نہ تو خوف اور نہ ڈر سے پیچھے ہٹتی ہے پھر وہ نمبردار کے خوف سے پیچھے کیوں ہٹ گئی، حقیقت میں اسے کسی سے محبت تھی ہی نہیں، بس وقت کے ساتھ ساتھ جس میں رشتے کی ضرورت اسے پڑی اس نے اسے اپنا مان لیا اب بھی اگر کوئی اسے کہے کہ اسے منشی سے محبت تھی تو یہ غلط تھا، منشی اس کی محبت نہیں مجبوری تھا کیونکہ پانی میں بہتے ہوئے چاہے تنکا ہی ہو وہی سہارا بن جاتا ہے، اب منشی ہی اسے زمانے کی نظروں میں معتبر۔

منشی نمبردارنی کے پاس بیٹھا تھا اس کی پیٹھ بچھی کی طرف تھی، وہ چلتی ہوئی ان کے پاس سے گزرتی پیاری کے دروازے تک آ گئی۔

"نمبردار جی کا بڑا احسان ہے مجھ غریب پر۔" منشی کی آواز اس کے کانوں تک آئی، وہ وہیں رک گئی۔

"تو...... تو راضی ہے ناں۔" نمبردارنی بھی بولی۔

"ہاں جی راضی ہوں۔" وہ کسی بات پر بڑا راضی اور خوش خوش لگ رہا تھا، بچھی کو جیسے کچھ کھٹکا وہ ان کے پاس آ گئی۔

"سلام نمبردارنی جی۔" بچھی کی آواز سن کر منشی نے یکدم پلٹ کر پیچھے مڑ کر دیکھا بچھی نے اس کے یوں حیرت سے پلٹنے پر بڑے غور سے دیکھا تو وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر تیز تیز پیر مارتا باہر چلا گیا۔

"وعلیکم السلام! اسے کیا ہوا، فٹا فٹ نکل گیا، میرے لئے اس کی نظروں میں اتنی بیگانگی دل جیسے بجھ سا گیا، کیا یہ وہ منشی ہے جو مجھے دیکھنے کے لئے بے تاب رہتا تھا نظر نہ آتی جو جھلوں کی طرح مجھے ڈھونڈتا پھرتا، آج کیا ہوا ہے اسے۔"

"تو کن سوچوں میں گم ہو گئی ہے، چل جا اندر جا کے کام کر۔" نمبردارنی کا برتاؤ بھی عجیب سا تھا، وہ چپ چاپ پیاری میں چلی آئی آگے بشو آٹا گوندھ رہی تھی۔

"تو کہاں رہ گئی تھی۔" وہ کند (دیوار) کے ساتھ رکھی پیڑھی کو سیدھا کرتی اس پر بیٹھ گئی۔

"اے تھے ہی سی۔" (ادھر ہی تھی)

"کیا بات ہے تو ٹھیک تو ہے۔" بجو نے آٹا گوندھ کر کنالی پر کپڑا دے دیا اور پھر اس جگہ پر گرے آٹے کے سفوف کو گندے کپڑے سے صاف کرنے لگی۔

"بجو نی بجو۔" پھاتاں کی آواز پر دونوں چونک گئیں اور پساری کے دروازے کی طرف دیکھنے لگیں۔

"کہاں مر گئی ہے تو، آ تجھے اک خبر سناؤں۔" پھاتاں پساری کے دروازے سے اندر آتی بولی۔

"ارے بچی تو بھی ادھر ہی ہے۔" بچی نے بھینسی والی ناک اوپر اٹھائی۔

"لے بے بے تو رہ ابھی کنواری، تیرے پاس سے لوگوں کے رشتے ہو گئے؟" پھاتاں نے بجو کے زخموں پر نمک چھڑکا، بے چاری چوبیس پچیس کی ہونے والی تھی اس کی عمر کی دو دو تین بچوں کی مائیں تھیں پر اس کا ابھی رشتہ بھی نہیں ہوا تھا کیا کرتی وہ شکل کی پوری پوری سے بھی کم تھی اس لئے ابھی تک اس کا رشتہ نہیں ہوا تھا، جب بھی پنڈ میں کسی کا رشتہ ہوتا پھاتاں آن پہنچتی، بے چاری کے زخموں پر نمک چھڑکنے، وہ بد صورت تھی تو اس میں بھلا اس کا کیا قصور۔

"تیرے سے اچھا تو اپنا وہ منشی ہے جس کا رشتہ تیرے سے پہلے ہو گیا۔" بچی جو پہلے ہنس رہی تھی اس کی بات سن اسے لگا جیسے کسی نے کھولتا ہوا پانی اس کے اوپر ڈال دیا ہو، اس کا ماس جسم سے چھلکے چھلکے بن بن کر اترنے لگا، دماغ چکرا سا گیا، پساری کی ساری چیزیں اس کی نظروں کے سامنے آپس میں گڈمڈ ہونے لگیں، بولنے اور سننے کی اسے جیسے ہوش نہ رہی، پھاتاں آگے کیا بول رہی تھی اسے کچھ پتہ نہ تھا وہ ویسے ہی پیڑھی پر بیٹھی گم صم کی چہرے دیکھے جا رہی تھی۔

اس کے کانوں نے آج یہ کیا سن لیا تھا کہ اسے اپنا سب کچھ لٹتا نظر آنے لگا، ایک منشی ہی تو تھا جسے وہ اب اپنے لئے آخری راہ سمجھ رہی تھی وہ بھی اسے بیچ راستے میں چھوڑ کسی اور کا ہو رہا تھا۔

چپ چاپ بے تاثر چہرے کے ساتھ وہ خالی زمین کو دیکھ رہی تھی ایسی زمین جو یکدم اس کے پیروں کے نیچے سے کھسک گئی تھی اسے اپنا وجود اس مٹی کی طرح لگنے لگا جس پر اگر پانی گر جائے تو وہ زمین کے سینے پر گارے کی شکل میں پھیل جاتا ہے ہر کوئی گندا ہو جانے کے ڈر سے اپنا آپ بچا کر چلتا ہے، اور آج، آج منشی بھی اپنا آپ بچا کر چل دیا تھا۔

گھر آ کر نہ اسے رونا آ رہا تھا نہ کچھ اور جل رہا تھا تو صرف اس کے اندر دہکا ہوا الاؤ جس میں وہ سب کچھ جلا کر راکھ کر دینا چاہتی تھی، مجھے اس نے اس بوتل کی طرح سمجھا جسے لوگ نشہ حاصل کر کے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیتے ہیں، لیکن میں وہ خالی بوتل نہیں ہوں، اس نے بہت زور سے ہاتھ سرہانے پر دے مارا، اندر دہکا الاؤ باہر آنے کو مچل رہا تھا۔

"میں اس کے ساتھ زندگی بھر کا رشتہ جوڑنا چاہ رہی تھی اور وہ، مجھے برباد کرنے والے میں تجھے چھوڑوں گی نہیں۔" وہ زخمی ہرنی بنی اندر ہی اندر جل رہی تھی۔

☆☆☆

چاچا گھر آیا تو وہ آگے پساری میں بیٹھی چولہے میں لگے اپلوں کو دھوکنی کے ساتھ پھونکیں مار مار کر جلانے کی کوشش کر رہی تھی یہ آگ جلانا اس کے لئے مشکل نہ تھا یہ تو روز کا کام تھا، بس یہ

آنکھیں کہیں چاچے سے دل کا حال نہ کہہ دیں اس لئے دھوئیں کا بہانہ کرتی وہ دھونکنی سے پھونکیں مار رہی تھی، چاچا خود پریشان تھا اس لئے اس نے زیادہ دھیان نہیں دیا اور چاچے کی پریشانی کی وجہ تھی ان بنجاروں کا پنڈ سے چلے جانا۔

"میلے کی وجہ سے آئے تھے وہ گیا ہم بھی گئے۔" خورشید سویرے ہی لاجو سے مل کر گئی تھی، ایک دفعہ جہاں وہ جاؤ تھوڑی دیر ہی جاہے تو اس زمین سے انس سی ہو جاتی ہے، وہ بھی جاتے ہوئے بہت روئی تھی اور کچھ چاچے کے ساتھ وہ اپنے باپ جیسی محبت کرنے لگی تھی شکیت کا ساتھ تھا، لاجو اس کے دکھ میں اپنا غم یاد کر کے روتی رہی۔

پالطیف کے ذکر پر اس نے کہا تھا۔

"دل وہ جسے دے بیٹھی ہے اس کے ساتھ وہ بے وفائی نہیں کر سکتی، ملنا نہ ملنا تو نصیب کی باتیں ہیں یہ دل کسی اور کے آگے جھکتا ہی نہیں۔"

"لا مجھے دے۔" چاچے نے اس کے پاس بنے پر بیٹھتے ہوئے دھونکنی اس کے ہاتھ سے لے لی اور چولہے کے پاس جا کر اسے پھونک مار کر آگ کو جلانے کی کوشش کی اور وہ کوشش میں کامیاب بھی ہو گیا، وہ پسینے میں پوری طرح بھیگ گئی تھی پر اسے کوئی احساس نہیں ہو رہا تھا اس کا دل اور دماغ دونوں کہیں افضل کے پیچھے دوڑے لگائے ہوئے تھے، چاچا آگ جلانے کے بعد بنے کو پیچھے کی طرف گھسیٹتا مٹی کی کچی دیوار کے ساتھ کمر ٹکا کر بیٹھ گیا، گرمی کی تپش نے اسے بھی تپا رکھا تھا، چاچا "اوے" کہتا پیچھے کو ہٹ گیا اور ماتھے پر آیا پسینہ صاف کرنے لگا۔

لاجو کی آنکھیں رو رو کر لال انگارے بنی ہوئی تھیں، اور چاچا دھونکنی کو دوش دے رہا تھا۔

"وہ کیا حال کر لیا آنکھوں کا، تو جیتی میں تجھے ہی آگ جلا دیتا، چل اٹھ جا کے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار آنکھوں میں۔" چاچے کی بات سنتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر چھینٹے مارنے کے بعد واپس پیڑھی پر آن بیٹھی۔

دوپہر کا وقت تھا چاچا کوٹھری میں جا چکا تھا جہاں اندھیرا ہونے کی وجہ سے ٹھنڈک کا احساس رہتا تھا وہ کام سے ویلی ہوئی تو چاچے نے اپنے پاس بلا لیا۔

"بنجارے کیا گئے ہر طرف ویرانی پھیلا گئے، خورشید پتر تھی تو جب دل چاہتا اس سے جا کر کوئی گیت سن آتے تھے، اب جانے کون سا دیس بسائیں گے وہ لوگ۔" ہاتھ والے پنکھے سے وہ چاچے کو ہوا دے رہی تھی، چاچا باتیں کیے جا رہا تھا پر وہ افضل کے تاروں میں الجھی ہوئی تھی، یہ کیسا رشتہ تھا جو دل نے دل کے ساتھ باندھا تھا بیٹھی وہ کہیں ہے پر دل کچے دھاگے کی طرح اپنے پیار کے ساتھ بندھا اسی کی طرف کھینچا چلا جا رہا ہے۔

وہ اپنے خیالوں میں مگن تھی کہ چاچا یکدم کچھ یاد آنے پر ماتھے پر ہاتھ مارتا منجھی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میری تو مت ہی بج گئی ہے، آج تو نمبردار نے گھر آنے کو کہا تھا۔" چاچے کی بات سن کر اس کا رنگ ہلدی جیسا زرد ہو گیا۔

"آج۔"

"ہاں آج، اس نے منگنی کی تاریخ طے کرنے آنا ہے، میں تو سوچتا ہوں میں کیسے احسان اتار پاؤں گا اس کا، جیسا رشتہ میں چاہتا تھا ویسا مل گیا، تو میرے پاس اس پنڈ میں رہے۔" چاچے کی آنکھوں میں تیرتے اتھرو جیسے اسے اندر تک ہلا گئے۔

"میں روز تجھے آتا جاتا دیکھوں، میری آنکھوں کو ٹھنڈ پڑتی رہے۔" چاچے کی بات سنتی وہ ان کے گلے سے لگی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"نہ میرا پتر، تیرے اتھرو مجھے بڑی تکلیف دیتے ہیں، تیرے یہ اتھرو نکلیں اس لئے میں تجھے اپنے پاس ہی رکھ رہا ہوں۔"

"وہ اکبر بڑا سمجھدار منڈا ہے کہہ رہا تھا چاچا جی آپ فکر نہ کریں میں ہمیشہ کا تابعدار رہوں گا، پتر پوری بارہ جماعتیں پاس ہے۔"

چاچے نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

لاجو کو اس وقت اپنا آپ بڑا ہی خود غرض سا لگا، اتنا پیار کرنے والا باپ، میں اس کے ساتھ کیا کر رہی ہوں، وہ ان کے گلے سے ہٹی دوبارہ منجی پر آبیٹھی اور چاچا اپنا پٹکا پکڑتا باہر نکل گیا۔

اس کی حالت اس پنچھی کی سی ہو رہی تھی جو پرتول کر اڑنا بھی چاہ رہا تھا اور وہ قید اسے عزیز بھی بہت تھی۔

"کیا کروں میں، کیسے بتاؤں، دل کا گھر پریشانیوں کا گھر بن چکا تھا، کیسے کہوں۔" یہ ایسے سوال تھے جنہوں نے اسے اپنے آپ میں قید کر رکھا تھا۔

وہ دوپٹہ کرینے سے سر پر جماتی اٹھ کھڑی ہوئی، پیر اس کے نذیراں کے گھر کی طرف چلنے کو تیار ہو گئے۔

وہ آگے نیاری میں بیٹھی ٹوٹے ہوئے مٹی کے کچے چولہے کی توکیں لیپ کر رہی تھی، رات کے کھانے میں ابھی وقت تھا، دھوپ بہت تیز تھی، لاجو کی لال سوئی آنکھیں دیکھ اس کا دل دہل سا گیا اور پھر اس کی باتیں سن وہ بھی پریشان ہو گئی۔

"نمبردار آج گھر آرہا ہے اب کیا ہوگا؟"

"تیرے پاس اسی لئے تو آئی ہوں۔" آدھے سے زیادہ چولہا اس نے لیپ کر لیا تھا باقی کام بھی جلدی جلدی نپٹاتی وہ مٹی والے ہاتھ نلکے پر صاف کرنے کے بعد اسے لے کر اندر آگئی۔

"تیری باتیں سن لاجو میرا تو دل ڈر گیا ہے، نمبردار گھر آرہا ہے تو سمجھو رشتہ ہو گیا۔"

"میں کیا کروں نذیراں، افضل کے آنے میں ابھی بہت دن پڑے ہیں، تب تک جانے کیا ہو جائے۔" وہ اس کے گلے سے لگی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"مہر، لاجو مجھے بڑا دکھ ہے تیرا، تو ہی بتا میں کیا کروں۔" وہ اس کے گلے سے لگی خود بھی روئے جا رہی تھی۔

"افضل میری جند میری جان ہے میں کسی دوسرے بندے کو خود پر حرام سمجھتی ہوں، میں یہ سب کیسے کروں گی، نہ نذیراں نا۔" نذیراں ہی تھی جس کے سامنے وہ کھل کر رو لیتی تھی ورنہ چاچے کے سامنے دم گھٹ گھٹ جاتا تھا، خود کو بہت سنبھال کر رکھنا پڑتا تھا، نذیراں خود کے اتھرو صاف کرتی اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"تیرے پاس افضل کے جو خط ہیں۔" نذیراں کو جیسے یاد آیا۔

"اس پتے پر تو اس کو خط لکھ دیکھ کیسا دوڑا چلا آتا ہے۔"

"یہی تو دکھ ہے، اس نے جگہ بدل لی ہے وہ اب کہیں اور رہنے لگا ہے خط کہاں لکھوں اسے میں۔" نذیراں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

بات کا کوئی حل نہیں نکل رہا تھا اور نمبردار کے گھر آنے کا وقت بھی نیڑے آ رہا تھا۔

☆☆☆

نمبردار گھر آ کر بات پکی کر گیا، چاچا خوش

خوش گھر میں پھرتا راگ مال کونس گنگناتا رہا اور لاجو بے بار اگ کی تصویر بنی گم صم چاچے کے سامنے رو بھی نہ سکی، نذیراں گھر آئی تو آگے وہ منہ سر لپیٹے اوندھے منہ منجی پر لیٹی تھی۔

"اس طرح منہ لپیٹنے سے کیا ہوگا، اب اگر کچھ نہ کیا تو یونہی ساری حیاتی روتی رہو گی۔" نذیراں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر بیٹھا دیا۔

"یوں منہ لپیٹ کر رونے سے کیا افضل آ جائے گا اور آئے گا تو کیا سوچے گا کہ تم نے چپ چاپ رشتہ کروا لیا اور میرا کچھ نہ سوچا۔" نذیراں کو تو غصہ سا آ گیا۔

"کچھ کرنے سے ہی کچھ ہوتا ہے۔"

"کیا کروں کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں اسے۔"

"میری مان تو بھاگ جا۔" نذیراں کی بات سن اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی۔

"تو میری سکھی ہے یا دشمن جو ایسے مشورے دے رہی ہو۔"

"سچی کہہ رہی ہوں اس سے پہلے چپ چاپ چلی جا وہاں سے اپنے آپ پتہ چل جائے گا وہ کہاں رہتا ہے۔" نذیراں کا وہ بے خوف سا انداز اسے حقیقت میں ڈرا گیا۔

"نہ کبھی بھی نہیں اپنی خوشیاں پانے کے لئے میں اپنے چاچے کو بدنامی کے کنوئیں میں دھکیل دوں میرا چاچا، جس کے لئے میں ہی سب کچھ ہوں میں کیسے اسے موت کے منہ میں دے سکتی ہوں" اس کا اندر سے خون کھولنے لگا تھا۔

"تو پھر بیٹھی روتی رہ یہاں۔" وہ سر پر ہاتھ مارتے منہ دوسری طرف کر کے بیٹھ گئی۔

"تجھے افضل سے پیار ہے ہی نہیں۔"

"اپنے آپ سے بھی زیادہ پیار ہے مجھے افضل سے، پر میں ایک وچن بھی ہوں اس باپ کی جس نے اپنی ساری جوانی مجھے جوان کرنے میں برباد کر دی اور آج میں اسے یہ ثابت کروا دوں کہ جو اس نے قربانی دی تھی وہ غلط تھی، نہیں نذیراں نہیں، میں نہ اس شخص سے شادی کروں گی اور نہ اپنے باپ کے شملے پر داغ لگاؤں گی۔" وہ چاچے کو باہر ویڑے میں خوشی خوشی پھرتے دیکھ رہی تھی۔

"میں نے بہت سوچا ہے نذیراں میرے پاس صرف ایک راہ ہے اور وہ ہے موت، میں ان دونوں کاموں میں سے کوئی بھی نہیں کر سکتی دے سکتی ہوں تو صرف اپنی جان۔" لاجو نے اپنی طرف سے بات کہہ دی جسے سن نذیراں کو خوف کے مارے پسینہ آ گیا۔

☆☆☆

"آ جا منشی لسی پی لے آ کے۔" بچی ہاتھ میں لسی کے دو گلاس پکڑے کھڑی تھی، نمبردار کی فاتحانہ نظریں پوری طرح اس کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔

"آ گیا سرکار۔" غصے کی چنگاریاں سی اس کے اندر پھوٹ رہی تھیں منشی بھی ڈھیر سا نمبردار کے گوڈے دبانے لگا آ کے۔

"اوئے رہنے دے، اور لسی پی، بچیئے دے گلاس منشی کو۔" منشی نے نظریں چراتے ہوئے لسی کا گلاس لے لیا، زہر کے گھونٹ پیتی وہ وہاں سے جانے لگی تو پیر نمبردار کی آواز پر رک گئے اس نے نفرت سے آنکھیں بند کر لیں، چہرہ اس کا دروازے کی طرف تھا۔

"تو منشی سے کچھ مٹھا نہیں کھائے گی۔" انداز اسے جلانے والا تھا۔

"او یاد ہی نہیں آیا تجھے بتانا، منشی کا رشتہ ہو گیا اپنے قادر بخش کی دھی لاجو کے ساتھ۔" بچی

کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے ہی کہیں کھائیوں میں جا گرا، "لاجو" یہ نام بڑی دور سے کانوں میں پڑتا سنائی دیا۔

"وہ تو افضل۔" اپنے دل میں ساری بات دہرائی وہ چند لمحے ویسے ہی چپ چاپ کھڑی رہی پھر کچھ بھی بولے بغیر باہر نکل آئی، نمبردار اسے جاتا دیکھ کر اندر تک خوش ہو گیا۔

☆☆☆

وہ سوچ میں ڈوبی پیاری میں آ گئی تو آگے نمبردارنی بھاتاں سے کچھ کہہ رہی تھی اور بتا رہی تھی کہ نشی کا رشتہ نمبردار کروا رہا ہے۔

"یہ نمبردار کیسا کھیل کھیل رہا ہے۔" پچھی کا ذہن جانے کن کن راستوں پر دوڑ لگانے لگا۔

"تو کیا اسے نشی کا پتہ چل گیا۔" خوف کے مارے اسے تریلی سی آ گئی، وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ لئے اسے مسلنے لگی۔

نفرت کا سمندر تھا جو اس کے اندر ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا، مجھے دلدل میں ڈال کر خود ایک طرف ہو گیا، کیسے کیسے خواب نہیں دکھائے تھے اس نے مجھے اور خود لاجو، اور لاجو کیسے مان گئی، افضل تو خیر۔

اندر سے اس کے دل کو بڑی خوشی ہوئی تھی، بڑا بنتا پھرتا تھا لاجو کا وفادار، اب کہاں گئی تیری وفاداری، اس نے نفرت سے سر کو جھٹکا اور وہ تھی اکبر مجھے دوزخ میں جھونک کر خود کسی اور کے ساتھ جنت کے مزے لوٹنے کا سوچ رہا ہے، اس کا دل کہہ رہا تھا وہ سامنے ہو اور وہ شیر کی طرح اسے چیر پھاڑ ڈالے۔

دوسرے دن وہ نمبردار کے بلانے پر اس کی باہر والی حویلی میں گئی تھی جہاں وہ اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

"پتہ نہیں کیوں بلا رہا ہے، نجانے کیا کرے وہ۔" ڈرتے ڈرتے اس نے حویلی کے اندر قدم رکھا، رات کا وقت اور خوف سے لرزتے قدم، ساری چیزوں میں جیسے مماثلت سی پیدا ہو رہی تھی، پچھی کے اندر چھپا نمبردار کے لئے غصہ جیسے خوف کے زیر اثر آ رہا تھا نمبردار کے رعب دبدبے نے شیر جیسا دل بلی جتنا کر دیا تھا۔

وہ اپنے اسی کمرے میں موجود تھا جہاں وہ پہلے اسے بلاتا تھا، وہ کمرے کے اندر داخل ہوئی تو وہ سامنے پلنگ پر نیم دراز، جیسے اسی کو اڈیک رہا تھا، وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور پچھی کو واپس دروازہ بند کرنے کا اشارہ کیا خوف سے لپٹا لمبا سا سانس لیتے ہوئے وہ آگے کو بڑھ آئی۔

کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں، جنگل سے آتی ہلکی ہلکی مست ہوا نے کمرے میں کافی حد تک گرمی کم کر رکھی تھی ہاں ذہنوں کا پتہ نہیں وہ کتنے گرم تھے۔

بڑی بڑی بھوری آنکھوں کے نیچے گھنی مونچھوں کے اندر چھپی معنی خیز ہنسی پچھی کے پیر چلتے چلتے لڑکھڑا گئے، نمبردار نے بھی پلنگ پر بیٹھے اس کے اندر سے سر اٹھاتے خوف پر جیسے مزہ لیا، "تو اتنی نڈر کیسے ہو گئی پچھی۔" افضل کے بارے میں اسے پتہ تھا کہ یہ خود ہی اس پر ڈورے ڈال رہی تھی پر نشی کا سن وہ اس کے نڈر پن پر غصے سے بھر گیا تھا۔

یہ وہی کمرہ تھا جہاں وہ بے خوف ہو کر آتی تھی پر اب لڑکھڑاتے قدم من من کے ہو رہے تھے۔

کمرے میں کئی چیزوں کا اضافہ ہو گیا تھا پچھی کی نظر سامنے شیشے پر پڑی جس کے اوپر پراندہ لٹک رہا تھا وہیں شیشے کے پاس نیچے لپ اسٹک، زنانہ جوتا، اس نے کچھ سوچ کر نمبردار کی طرف دیکھا اک بے وفا اس سے وفا مانگ رہا

تھا، وہ پلنگ کے بالکل سامنے آن کر کھڑی ہوگئی، نمبردار کی گہری آنکھیں جیسے اس کو اپنے آپ میں باندھے جا رہی تھیں، چار سو پھیلی بے چین کر دینے والی خاموشی، بس دل کے تیز تیز دھڑکنے کی آواز اس کے اندر چھپے خوف کی چغلی کھا رہی تھی۔

نمبردار جانے کتنی دیر اس کے چہرے کو خاموشی سے دیکھتا رہا پھر جانے کیا سوچتا پلنگ سے اٹھ کر بالکل اس کے سامنے کھڑا ہو گیا، وہ خوف کے مارے ایک قدم پیچھے کو ہٹ گئی تو نمبردار نے اسے دونوں ہاتھوں سے دبوچتے ہوئے اپنے ساتھ لگا لیا، پچھی کا سانس باہر آنے کی بجائے اندر ہی کہیں گم صم سی ویران کھائی میں جا گرا، وہ نیم جاں سی اس کی بانہوں میں جھول گئی۔

اس اچانک پڑنے والا افتاد پر بوکھلا گئی اور پھر ایک ہی جھٹکے میں اٹھ کھڑی ہوئی، نمبردار نے پلٹ کر اسے دیکھا جس کے چہرے پر خوف ڈیرہ ڈالے ہوئے تھا، اس کے دل میں جانے کیا چل رہا تھا جس کی پچھی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی اس نے پچھی کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر سے اسے اپنے گلے سے لگا لیا، وہ اس کے رویے کے بدلاؤ پر حیران و پریشان کسی آنے والے طوفان سے خوف زدہ سہم کر اس کے ساتھ لگ گئی۔

"میرے پیار سے تیرا دل بھر گیا۔" پچھی کے بالکل کان کے قریب آ کر اس نے یہ کلمہ ادا کیا جسے سن کر اس کے پیر زمین سے خوف کے مارے اوپر کو اٹھ گئے۔

"بولو، میرا پیار کیا کم پڑ گیا تھا تمہارے لئے جو وہ منشی......" کہتے کہتے اس کی زبان رک گئی، پچھی نیم جاں سی اس کی بانہوں میں جھولنے لگی، نمبردار نے اسے چھوڑ دیا اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا جیسے مشکل لگنے لگا اس نے پلنگ کا کونہ دبا لیا۔

"وہ افضل کی طرف بڑھتے تیرے قدموں کو میں اس لئے معاف کر گیا تھا کہ وہ میرا اپنا ہے۔" منشی کے نام پر اس کی آنکھوں میں جیسے خون اترنے لگا۔

"اب یہ نہ کہنا کہ میں غلط کہہ رہا ہوں، پورے ثبوت کے ساتھ بات کر رہا ہوں۔" بالوں سے پکڑ کر اس نے پیچھے کو اس کا سر اوپر کیا تو پچھی درد کی شدت سے چیخ اٹھی۔

"چھوڑ دے مجھے، رب دے واسطے۔" وہ اس کا بازو زور سے چھڑانے لگی مگر مرد کی گرفت مضبوط ہوتی ہے۔

"تجھے چھوڑ دوں، پتہ ہے تو نے کیسے کیسے گل کھلائے ہیں میری پیٹھ پیچھے۔" زور سے اس کے بال کھینچتا اپنے منہ کو اس کے منہ کے پاس لے گیا، پچھی کا درد کے مارے برا حال تھا وہ کراہ رہی تھی۔

"تو نے سوچا بھی کیسے کہ میرے سوا بھی کسی کو سوچے گی۔"

"مجھے معاف کر دے، کر دے معاف۔" وہ روتے ہوئے بولی نمبردار نے بال چھوڑ دیئے، پچھی خوف کے مارے بغیر آواز پیدا کیے رو رہی تھی، وہ اسے دیکھتا ہوا پلنگ پر بیٹھ گیا۔

نجانے اسے کیا ہوا تھا، اتنے دنوں کا اسے پتہ تھا اور وہ برداشت بھی کرتا آ رہا تھا پوری طرح اس مسئلے کو حل کرنا چاہ رہا تھا اور اب مسئلہ حل بھی ہو گیا تھا، لاجو کا رشتہ منشی سے ہو گیا، نذیرے سے بھی اس نے افضل کی طرف سے مطمئن رہنے کو کہا تھا اس کا بیٹا بھی ایک گانے والے کی بیٹی کی طرف سے رشتہ ہونے پر بد دل ہو جائے گا اور خود ہی اس کا پیچھا چھوڑ دے گا، منشی کو بھی اس نے پچھی کے پیچھے سے نکال لاجو کی طرف لگا دیا تھا سب

ٹھیک ہی ہو رہا تھا، حقیقت میں اس نے شمشاد کو بھی پچھی کی خاطر سفید جھنڈی دکھا کر رخصت کر دیا تھا اس کا دل جیسے پچھی کے ساتھ جم سا گیا تھا، شمشاد نے اس کے بڑے ترلے کیے تھے مگر دل میں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں مگر وہاں اپنی جگہ کوئی ایک ہی بناتا ہے اور وہ تھی پچھی، پر اس کی بے وفائی نے اسے جیسے دیوانہ سا بنا دیا تھا۔

وہ اپنے گالوں پر آئے اتھرو صاف کرتی ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی، نمبردار کا دل جیسے پسیج سا گیا مگر وہ اسے نرمی دکھا کر ڈھیل نہیں دینا چاہتا تھا بے وفائی تو بے وفائی تھی، نمبردار نے جانے کیا سوچ کر اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

''تجھے میری محبتوں کا اندازہ ہی نہیں ہے، تیری سوہنیے سارا زمانہ ایک طرف اور تو ایک طرف۔'' نمبردار نے تھوڑی سے پکڑ اس کا منہ اوپر کیا، گیلے گالوں کی چمک کم نہیں ہوئی تھی۔

دل کا مارا، دل کے ہاتھوں مجبور دل ہوتا ہی ایسا ہے چاہنے والا غلطیاں بھی کرتے پھر بھی اسے معاف کرنے میں دیر نہیں لگاتا، یہاں بھی وہی حال تھا اب بھی وہ اسے انہی نظروں سے دیکھ رہا تھا پر اندر سے ہی ایسے ابال اٹھ رہے تھے کہ اس کا خون کھولنے لگ جاتا شاید اسے فضلی یاد آ جاتا تھا ''اس نے بھی اسے ایسے ہی چھوا ہوگا'' سوچ کر ہی وہ غصے میں کھولتا اٹھ کھڑا ہوا اور پھر کمرے میں ادھر سے ادھر چکر کاٹنے لگا پھر اس کے پاس آ کر زور سے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔

''تم نے سوچا بھی کیسے تو...... تو اسے پیار سے چھوئے گی، بولو۔'' پچھی کے لئے یہ تھپڑ بھی اچانک آنے والے طوفان کی طرح ہی تھا، اپنے لال ہوئے گال پر ہاتھ رکھتی وہ پھر آنسو بہانے لگی پر اندر سے اس کا دل چاہ رہا تھا وہ یہاں سے اٹھے اور باہر کو دوڑ لگا دے لیکن وہ کہاں جا سکتی تھی کہیں بھی نہیں۔

اس کی بات کے جواب میں وہ کیا بول سکتی تھی چپ چاپ اس کی شکل دیکھتی رہی، پھر وہ جلدی سے مڑا اور اپنے سرہانے کے نیچے سے تیز دھار والا تو کیا خنجر نکال لایا اور سیدھا اس کی گردن پر لا رکھا، پچھی کا سانس جیسے حلق میں ہی اٹک گیا، پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ نمبردار کو دیکھنے لگی کہ کیا کرنے جا رہا ہے وہ۔

''نئی نئی۔'' بڑی مشکل سے اس کے گلے سے یہ لفظ نکلے۔

''دل تو کرتا ہے تیرا گلا کاٹ دوں، اوئے تو چوہدری فضل الٰہی کی ناک کے نیچے رنگ رلیاں مناتی رہی، تجھے ذرا بھی ڈر نہ لگا۔'' وہ دھاڑنے والے انداز میں بولا، خنجر کی ہلکی سی دھار اس کی گردن پر پھر گئی، خون سا رسنے لگا وہ تو چیخیں مار مار کر رونے لگی۔

''میرا دل اگر مجھے دھوکا نہ دیتا تو، کمینی میں تجھے کب کا اس خنجر سے کاٹ کر کتوں کو کھلا چکا ہوتا، مارا تو میں اپنے دل کے ہاتھوں گیا۔'' وہ پیچھے ہٹ گیا وہ درد کی وجہ سے کراہ رہی تھی، دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنی گردن کو پکڑے ہوئے تھے پھر نمبردار کے خوف سے اس نے اپنی آواز کو اندر ہی دبا لیا، خنجر اس کے ہاتھ میں ہی تھا، موت کا خوف اسے اونچی آواز میں رونے سے روکنے لگا۔

پچھی کی حالت اس وقت کسی زخمی ہرنی کی طرح تھی جو شیر کے وار سے زخمی ہو گئی تھی پر اس کے خوف سے کراہنے سے خود کو روک رہی تھی کہ پھر وہ دوبارہ حملہ نہ کر دے۔

''اوے میرے کاٹے کے ساتھ، تجھے ذرا خیال نہ آیا۔'' نمبردار پھر دھاڑا اور خنجر اٹھا کر زور

سے پلنگ پر پھینک دیا اور غصے سے دوبارہ بچی کو بالوں سے پکڑ کر سراونچا کیا، گردن کا زخم کھلا اور زیادہ خون رسنے لگا، انگلیوں نے گال گیلے کر رکھے تھے، سرخ و سفید رنگت پر تھپڑوں سے ابھرے ہوئے گیلے گال، نمبردار کا دل ڈوبنے ابھرنے لگا، غصے سے بھرے دل کی جگہ محبت سے گندھا ہوا دل اچھل کر سینے میں ہلچل مچانے لگا۔

بچی کی گیلی لمبی پلکوں کو وہ اپنے ہونٹوں سے لگانے لگا، دل نرم بنا روئی کے گالوں کی طرح ہواؤں میں اڑنے لگا وہ جو پہلے مار پیٹ کر رہا تھا اس کی محبت کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا، اسے کوئی ہوش نہ رہی کہ وہ یہ سب کیوں کر رہا ہے۔

''وہ سامنے دیکھو، وہ پرانده، وہ جتی، یہ سب شمشاد کی ہیں، جلدی میں بھول گئی تھی وہ، وہ جان سے زیادہ محبت کرتی ہے مجھ سے، اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جانے کتنے مرد ہیں اس کی زندگی میں لیکن وہ صرف مجھ پر مرتی ہے اور میں تیرے اوپر مرتا ہوں پر تو مجھے دھوکا دے گی۔'' نمبردار کی آنکھوں میں تیرتا غصہ دیکھ بچی کو خوف سا آنے لگا۔

''بچ گئی تو، کہ میرا دل بری طرح مرتا ہے تیرے اوپر۔'' بچی کو وہ اس وقت زہر سے بھی زیادہ برا لگ رہا تھا وہ اسے کچھ کہہ نہیں سکتی تھی اس لئے وہ جو بھی کر رہا تھا اسے صرف برداشت کر سکتی تھی ہاں اس کے اندر زہر کا جو طوفان اٹھ رہا تھا وہ بہت برا کرنے والا تھا۔

☆☆☆

احساس ندامت کے باعث اس کی گردن اوپر کو اٹھ نہیں رہی تھی، ابا بے بے دونوں سو رہے تھے ان کی آنکھوں کے پاس کھڑے بغیر آواز پیدا کیے وہ روئے جا رہی تھی، بدنامی کا کون سا ایسا داغ ہے جو میں نے ان دونوں کو نہیں دیا اور اس بات کا انہیں پتہ چلے گا تو کیا وہ زندہ بچیں گے۔

دل کے اندر اٹھتے شرمندگی کے طوفان کا شور اسے پاگل کیے دے رہا تھا۔

''میرے ربا مجھے کبھی معاف نہ کرنا، میں نے اپنے ماں باپ کو بے عزتی کی جس دلدل میں دھکا دیا ہے اس سے وہ بالکل باہر نہ آپائیں گے، ان پر کیا گلی کے بچے تک نہ ہنسیں گے، ہائے مجھ سے کیا ہو گیا۔'' وہ روتی ہوئی کوٹھری میں جا گھسی، گردن پر اس نے کپڑا اپنا دبا رکھا تھا، اسے وہ تکلیف تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

دل میں طرح طرح کے خیال آرہے تھے، نمبردار اور منشی کے لئے اس کے اندر اتنا زہر جمع ہو گیا تھا کہ دل چاہ رہا تھا کہ وہ دونوں سامنے ہوں اور وہ انہیں زندہ جلا ڈالے۔

دونوں نے اسے اپنے مطلب کے لئے استعمال کیا وہ منشی کیسے اس نے لاجو کے ساتھ رشتہ جوڑ لیا اور نمبردار اس نے منشی کو میرا ہونے سے پہلے کسی دوسرے کی جھولی میں ڈال دیا۔

ساری رات اس نے آنکھوں میں گزار دی، دل اس کی شرمندگی مٹانے کے جانے کیسے کیسے راستے کھوج لایا تھا۔

☆☆☆

منشی کی منگنی نمبردار کر رہا ہے، یہ سن نمبردارنی کے پیروں تلے سے زمین کھسکنے لگی، اپنے راستے سے کیسے وہ کانٹے نکال رہا ہے، نمبردارنی نے غصے سے سوچا، بیٹے کی محبت ہاتھوں سے نکلی جارہی تھی اور اسے خبر تک نہ تھی۔

شہر میں وہ کہاں رہتا ہے اسے پتہ نہ تھا، نمبردار سے چوری اس نے مختار سے پوچھا تھا جس نے بتایا تھا کہ اب وہ کسی دوسرے کالج میں پڑھتا ہے اور وہیں رہتا ہے اس کا پتہ صرف بدر

کامے کو ہے جو ابے کے حکم پر شہر آتا جاتا رہتا ہے۔

اب بدر سے کیسے بات کروں میں وہ تو نمبردار کا خاص کاما ہے وہ کیونکہ مجھے بتائے گا اور دن بھی تھوڑے رہ گئے ہیں۔

اپنے کمرے میں وہ چکر پر چکر کاٹ رہی تھی اس نے دور ویڑے میں چھی کو پھرتے دیکھا، دماغ کے اندر اک دیا سا جل گیا وہ دروازے کے پاس آئی اور اسے اندر بلایا، نمبردارنی آواز سنتے ہی وہ اندر آگئی، اندر سے دروازہ بند کرتی وہ اسے پلنگ تک لے آئی۔

''یہ تیری گردن پر کیا ہوا؟'' بات وہ اس سے کچھ اور کرنے لگی تھی پر نظر زخمی گردن پر پڑی جس کے گرد اس نے پٹی لپیٹ رکھی تھی، چھی اچانک پوچھ لینے پر بوکھلا گئی۔

''وہ جی، میں گھر میں چلتے چلتے گر پڑی نیچے لوہے کی پتری سی پڑی تھی جو گلے پر پھر گئی۔'' اپنے سے ایک عدد جھوٹ بولتے ہوئے وہ نظریں نیچے جھکا گئی، گھر میں جھوٹ اس نے بے بے اور ابے سے بولا تھا کہ حویلی میں گر گئی تھی۔

''آئے ہائے، زیادہ تو نہیں لگ گئی۔'' نمبردارنی فکرمندی سے بولی تو چھی شرمندہ سی ہو گئی۔

''میں نے کیا کچھ نہیں کیا اس کے ساتھ اور یہ کتنی ہمدردی دکھا رہی ہے۔''

''کوئی کام تھا آپ کو۔'' اس نے جیسے نمبردارنی کا دھیان بٹایا۔

''دیکھ چھی مجھے تیرے ساتھ ایک کام پڑ گیا ہے اور یہ کام تو نے کرنا ہے یہ میرے پتر افضل کی حیاتی کا سوال ہے۔'' افضل کے نام پر چھی کا دل ایک بار ڈوب کر ابھرا، اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

''کیا کرنا ہے جی۔'' نمبردارنی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے رازداری سے سب کچھ اسے بتا دیا۔

''اب تو بدر سے اس کا پتہ لے کر دے گی تو مجھے۔'' چھی نے اک ٹھنڈی سی آہ بھری۔

افضل صرف لاجو کا ہے۔

نمبردار اور منشی کے خلاف تو ویسے بھی اس کے دل میں اتنا زہر تھا کہ وہ کچھ بھی کر سکتی تھی اور کچھ نمبردارنی کا بھی قرض چکانا تھا اس نے اسے بھی بہت دھوکا دیا تھا۔

''آپ جی فکر نہ کریں، پتہ لینا میرا کام ہے۔'' جیسے بھی ہو وہ پتہ لے کر ہی دم لے گی۔

☆☆☆

بہاروں کی ہائیس کو ان کی منگنی ٹھہری تھی، آج خوشی میں چاچے نے اس سے گانے کو کہا تھا وہ جو منگنی کا سن نیم جان سی ہو گئی تھی۔

''میرا دل تو بے ہاگ سننے کو چاہ رہا ہے۔''

بے ہاگ درد کا راگ، اس کے دل میں بھی تو درد ہی تھا صرف درد، آنکھوں میں یہ موٹے موٹے اتھرو ابھر آئے۔

افضل کی یاد نے ہیری سی جلا دی تھی اندر، مینہ سا برسنے لگا تھا۔

''تو جانے کون سے دیس بسائے بیٹھا ہے اور میں یہاں تجھ سے ملے بغیر ہی دنیا سے چلی جاؤں گی۔'' وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے رونے لگی، چاچا گھبرا سا گیا۔

''لاجو پتر تو..... تو جھلی ہے جو رو رہی ہے، میں کب تجھے خود سے دور کر رہا ہوں تو، تو میرے پاس ہی رہے گی۔'' وہ چاچے سے گلے لگی زار و قطار روئی جا رہی تھی۔

''تو میرے حوصلے بھی پست کر رہی ہے، چل چپ کر۔'' روتی ہوئی لاجو کو چاچے نے بھی

پر بٹھا دیا۔

دل پر چھایا غموں کا بادل چھٹنے میں نہیں آرہا تھا، وہ چھت پر بستر بچھانے کے بعد نیچے آگئی، لالٹین جلائی، چاچے کا حقہ تپایا، مرغیاں شاموں شام ہی اس نے ڈربے میں بند کر دی تھیں، کمرے میں گئی باہر آئی، کہیں بھی دل چین نہیں پا رہا تھا، وہ ویڑے میں پیڑھی منجھی پر بیٹھ گئی، انداز بڑا ہارنے والا تھا جیسے سب کچھ ہاتھ سے نکلا جارہا ہو، ہاتھوں کو مسلتے ہوئے اس نے یونہی لکیروں کو دیکھا آنکھیں بھیگ سی گئیں، کاش یہ لکیریں میرے ہاتھ میں نہ ہوتیں، اتھرو برساتی نالوں کی طرح ابل ابل کر باہر آنے لگے رات کے بڑھتے سیاہ سائے اور دل پر چھایا غموں کا کالا سایہ جیسے آپس میں گڈمڈ ہوگئے۔

میری زندگی افضل کے بغیر اس کھوکھلے جسم کی طرح ہے جس میں روح نہ ہو تو پھر ایسی زندگی جینے کا فائدہ، میں اس کے بغیر جی نہیں سکتی ٹھنڈی آہ سی بھرتے ہوئے اس نے پانی سے بھری آنکھوں کے ساتھ جامن کے پیڑ پر بنے گھونسلوں کو دیکھا جنہوں نے شاخوں کے اندر شور سا مچا رکھا تھا، چوں چوں کی آوازیں ان کے دلوں میں واپس گھروں کو آنے کی خوشی کی چغلی کھا رہی تھیں، اس نے دکھ سے آنکھیں بند کرلیں پانی گالوں پر بہہ نکلا، دکھی دل کے ساتھ وہ اٹھ کھڑی ہوئی قدم جیسے جسم کا بار نہیں اٹھا پا رہے تھے اپنی جان کو کانٹوں پر گھسیٹتے ہوئے وہ اندر آگئی، سامنے تخت پر ستار کے ساتھ ہارمونیم رکھا تھا، دل جیسے کہیں چین نہیں لے رہا تھا، اندر آنے پر بھی وہ بیٹھنے کو نہیں کہہ رہا تھا۔

"کہاں جاؤں میں، جھلی کر دیا تو نے مجھے۔" اس نے روتے ہوئے سر ہارمونیم کے اوپر دے مارا تو چاچے کی آواز پر وہ آنکھوں کو صاف کرتی اٹھ بیٹھی وہ اسے حقہ اوپر لانے کو کہہ رہا تھا "اچھا چاچا" کہتی وہ اٹھ کر باہر آگئی اور حقہ اٹھا کر پوڑیاں (سیڑھیاں) چڑھتی اوپر آگئی۔

ہوا کا نام ونشان نہ تھا حبس کے مارے ہر چیز خاموشی میں ڈوبی ہوئی لگ رہی تھی شاید وہ بھی اس کی طرح دکھی تھی، ہاتھ والا پنکھا خود کو جھلتے ہوئے چاچا منجھی پر بیٹھا تھا اس نے حقہ پاس لا کر رکھ دیا۔

"رب سوہنا تجھے حیاتی دے اور میرے حصے کی بھی ساری خوشیاں تیری جھولی میں ڈال دے۔" اس نے خود کو رونے سے روکتے ہوئے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"خوشیاں تو اب سفنے میں بھی مجھے نہیں ملیں گی۔" وہ منجھی سے پیچھے ہٹتے ہوئے نذیراں کے بنیرے پر بیٹھ گئی وہ اسے بیٹھا دیکھ کر اس کے پاس چلی آئی۔

"افضل کی جدائی مجھے مار ڈالے گی نذیراں۔" سوجی آنکھوں پر اتھروؤں کا بوجھ بھاری پڑنے لگا تو نذیراں نے اس درد کی ماری لڑکی کو گلے سے لگا لیا۔

"میں تیرا درد سمجھتی ہوں لاجو، پر میں کیا کروں۔" چاچے کی وجہ سے وہ بہت ہولے ہولے بول رہی تھی لاجو کے چھلکتے اتھرو کیا کیا نہ کہہ رہے تھے۔

"یہ حیاتی اس کے بنا موت سے بھی زیادہ کڑی ہے، میرا دل کرتا ہے میں آپ اپنا گلہ دبا لوں۔"

"تجھے کہا تو تھا میں نے جا چلی جا اپنے افضل کے پاس۔"

"تو میری حالت نہیں سمجھتی، میں دونوں طرف سے سولی پر ہی لٹکوں گی، میرا چاچا مر

جائے گا۔'' اس نے چھلکتی آنکھوں کے ساتھ چاچے کی نتھی کی طرف دیکھا جو جانے پاسا مارے سورہا تھا یا ابھی جاگ رہا تھا۔

''میرے جانے کے بعد کیا میرا چاچا ایسے سکون کی نیند سو سکے گا۔''

''اور تو افضل کے بغیر کبھی سکون سے سو پائے گی۔'' نذیراں کی بات پر اس نے حسرت سے رات کے پھیلے سائیوں کو دیکھا جو ہر طرف پھیل چکے تھے۔

''اب تو موت آ گئی تو سوؤں گی۔'' لاجو کی بات پر نذیراں اندر تک کانپ گئی۔

''رات کے وقت ایسی منحوس باتیں کیوں کر رہی ہے۔''

''تجھے یہ باتیں منحوس لگ رہی ہیں، پر مجھے تو انہی میں زندگی نظر آرہی ہے، میری موت میں میری زندگی ہے۔'' حبس زدہ فضاؤں نے دل پر بھی کڑے موسم بٹھا دیئے تھے، وہ فیصلہ کر چکی تھی جس سے وہ اپنے آپ کے سامنے شرمندہ نہیں ہو گی۔

☆☆☆

نچھی کو اب احساس ہو رہا تھا کہ اس نے آج تک جو بھی کیا وہ غلط تھا اس لئے اب ہر وقت اک احساس سا اسے گھیرے رہتا۔

زندگی میں کی گئی غلطیوں کا ازالہ کبھی کبھی صرف ندامت کے احساس سے بھی پورا نہیں ہوتا اس کے لئے کبھی عملی قدم بھی اٹھانا پڑتے ہیں، وہ لوگ جو اپنی غلطیوں کو غلطی نہیں مانتے یا ان پر شرمندہ نہیں ہوتے حقیقت میں وہ صرف خود کو دھوکا دے رہے ہوتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ ہم نے کیا کیا تھا مگر یہ دنیا کبھی کسی کو کچھ بھی بھولنے نہیں دیتی، آئینہ لے کر بار بار اس کے سامنے آتی ہے اور اس کے آگے گزری یادوں کی ریل چلاتی رہتی ہے وہ بھولنا بھی چاہے تو بھول نہیں سکتا، وقتی تسلی تو صرف خود کو دھوکا دینے کے لئے ہوتی ہے۔

نچھی نے جو بھی کیا وہ اس کی مجبوری تھی یا ضرورت یہ صرف اسے پتہ تھا، لیکن خدا نے ہر انسان کو عقل دی ہے، سمجھ بوجھ، دو راستے، اس کے باوجود جو کوئی ان غلط راستوں پر مجبوری یا ضرورت کا نام لے کر چلے تو وہ تو سب جانتا ہے، انسان دنیا سے چھپ کر تو غلط کام کر سکتا ہے مگر اس سے نہیں وہ تو سات پردوں میں بھی سب دیکھ رہا ہوتا ہے۔

ماں باپ کو نیند کی گولیاں کھلا کر، زمانے سے چوری مگر خدا سے تو کوئی شے پوشیدہ نہیں، غلط کام پھول سے اٹھنے والی خوشبو کی طرح ہوتا ہے جو اپنے آپ احساس دلا دیتا ہے۔

اس بات کا اب نچھی کو احساس ہو رہا تھا، درگاہ پر بیٹھی وہ رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی چاہ رہی تھی اور اس امید کے ساتھ اس کے پاس آئی تھی کہ وہ بھی اپنے مانگنے والوں کو خالی ہاتھ نہیں واپس بھیجتا، وہ خدا ہے پالنے والا ہے، سچے دل کے ساتھ اس کی طرف آؤ وہ ضرور معاف کرتا ہے۔

☆☆☆

اکیس بھادوں، نمبردار فضل الٰہی بڑا خوش تھا کہ بھادوں، لاجو اور منشی کی منگنی تھی اس کی راہ کے کانٹے نکل رہے تھے جو اس نے چاہا تھا اب اس کی مرضی کے ساتھ ہو رہا تھا، لاجو کا کانٹا نکل گیا تھا نذیر کو اس نے تھوڑے دن بعد آنے کے لئے کہا تھا کیونکہ اس منگنی کے بعد اس نے افضل کو چند واپس بلانا تھا یہ منگنی اس کے پیچھے سے ہی ہو جائے تو اچھا ہے اور نچھی تو منشی نبڑ گیا تو وہ اپنے آپ دوبارہ اس کے پیروں میں آن گرے

گی مجھے چھوڑ کر وہ جا بھی کہاں سکتی ہے اور نہ میں اسے نہیں جانے دوں گا اس پر صرف نمبردار فضل الٰہی اپنا حق استعمال کر سکتا ہے اور میری راہ میں جو بھی آئے گا اسے راہ سے مکھن سے بال کی طرح نکالنا میں اچھی طرح جانتا ہوں، کام سے کام نہ چلے تو گولی تو کہیں نہیں گئی۔

نمبردار فضل الٰہی کی مکار سوچ اسے جانے کن ہواؤں میں اڑائے لئے جا رہی تھی مگر قسمت کو جانے کیا منظور تھا۔

☆☆☆

"کیا بات ہے نمبردارنی جی آپ پریشان لگ رہی ہیں۔" بختو یوں اسے پریشان دیکھ کر پاس چلی آئی۔

"کیا بتاؤں بختو تو بس دعا کر میرے دل کا چین مجھے مل جائے، میں بڑی پریشان ہوں۔"

کل منگنی تھی پتہ نہیں کیا بنے گا، یہی سوچ سوچ وہ پریشان ہو رہی تھیں۔

"آپ کی پریشانی پوچھنے کا نہ تو میرا حق ہے اور نہ اوقات، پر آپ کو دیکھ میرا دل بھی پریشان ہو گیا ہے۔" بختو ہاتھ جوڑے کھڑی تھی اس گھر کی وہ نمک خوار تھی۔

نمبردارنی کی نظریں دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں، افضل کی کوئی آہٹ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی، میرا پتر اپنے باپ کی غلطیوں کی سولی چڑھ جائے گا۔

"اک بات کہوں نمبردارنی! آپ میرے ساتھ درگاہ چلیں وہاں جا کر آپ کو ضرور سکون ملے گا۔" بختو کی بات اسے بھی پسند آئی تھی اس لئے وہ بختو کو ساتھ لئے درگاہ پر چلی آئی۔

شام کا وقت تھا ہوا بھی جیسے انسانوں سے روٹھی کہیں منہ چھپائے بیٹھی تھی، درگاہ پر زیادہ رش نہیں تھا، کھلے صحن میں شام کے ڈھلتے سائے ڈھیرے ڈھیرے اپنی جگہ چھوڑتے جا رہے تھے، گرمی اور حبس کے مارے پرندے بھی بغیر چوں چوں کیے پیڑوں کی شاخوں میں بیٹھے، سبحان تیری قدرت کا ورد کر رہے تھے۔

انسان اور دوسرے جانداروں میں یہی تو فرق ہے انسانوں کی طرح وہ جلد شکوہ زبان پر نہیں لاتے اور انسان اتنا ناشکرا ہے کہ ذرا سا موسم اس کی مرضی کے بغیر چلا آئے تو شکوہ کر بیٹھتا ہے۔

نمبردارنی دو چار خادماؤں کے ساتھ درگاہ کے اندر داخل ہوئی آگے بڑے سے کشادہ صحن میں کبوتروں کی بڑی تعداد دانہ چگنے میں مصروف تھی، سارے دن کی تھکے ہارے وہ جانے کہاں کہاں سے ہو کر آتے تھے اور ان کا رکھوالا پانی کا بڑا سا کٹورہ بھرے خود دور ہو کر بیٹھا ان کو پیٹ بھرتا دیکھ اندر ہی اندر خوش ہو رہا تھا۔

کیسا احساس ہوتا ہے یہ کہ جس سے آپ محبت کریں اسے سیراب ہوتا دیکھ کتنی خوشی ملتی ہے خدا اور انسان کا بھی تو ایسا ہی رشتہ ہے وہ بھی اپنے بندوں کو خوش ہوتا دیکھ خود بھی خوش ہوتا ہے اور ان کے دکھی ہونے پر وہ بھی دکھی ہوتا ہو گا جیسے آج وہ دکھی تھا کیونکہ ایک دکھی ماں اپنے بیٹے کے لئے اس کی خوشیاں مانگنے آئی تھی، وہ بیٹا جو اس کے پاس نہیں تھا۔

ہر چیز ایک طرف اور ماں کی تکلیف ایک طرف، ماں کی آنکھ سے گرتے آنسو کیا عرش نہ ہلائیں گے، درگاہ کے اندر دونوں ہاتھ بلند کیے وہ اپنے بیٹے کے لئے دعا مانگ رہی تھی۔

"آج لگتا ہے سارے دکھی دل والے یہاں آئے ہیں۔" بختو نے اپنے پاس بیٹھی روتی لڑکی کی طرف دیکھا جو سر نیچا کیے رو رہی تھی۔

"ارے لاجو تو۔" اس نے جھکا ہوا سر اوپر

اٹھایا تو نمبر دارنی نے بھی برق رفتاری سے اپنی بند آنکھیں کھولی اور اس کی آواز کی سمت رخ موڑا، نمبر دارنی کا دل دہل گیا، اپنے افضل کی پرچھائی سی نظر آئی تھی اس میں۔

دوپٹہ کرنے سے سر پہ جمائے وہ روتی آنکھوں کے ساتھ اس کے اندر ہلچل مچا گئی، یہ آنکھیں میرے افضل کی جدائی میں جانے کن کن سمندروں کا پانی بھر لاتی ہیں، گورے چٹے رنگ پر اس کی ستواں ناک بغیر کوکے کے کتنی ادھوری لگ رہی تھی بالکل اسی کی طرح جیسے وہ افضل کے بغیر اکیلی تھی، وہ بچو سے بات کرتے ہوئے اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے، اپنے بیٹے کی پسند پہ انہوں نے رشک سے سوچتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں اور دعا کے لئے ہاتھ دوبارہ بلند کر دیے۔

کافی دیر وہ اسی حالت میں خدا سے دعا مانگتی رہی اپنے بیٹے کی خوشیوں کی دعائیں اور وہ جب دعا سے فارغ ہوئی ان کی آنکھیں کھولیں تو لاجو جا چکی تھی۔

☆☆☆

بچھی بھی ابھی ابھی درگاہ سے لوٹی تھی، خدا کے حضور معافی مانگنے کے بعد اور اس امید کے ساتھ کہ وہ ضرور معاف کرے گا وہ اپنے اگلے قدم کے بارے میں سوچ رہی تھی اور یہی سہی وقت تھا قدم اٹھانے کا، بے بے اور چاچے سے بھی اس نے معافی مانگی تھی اور وہ ماں جو ہمیشہ اس کے نصیب سے نالاں رہتی تھی وہ بھلا اسے کیا معافی دیتی اس کا نصیب کون سا اس کے ساتھ کچھ اچھا کر رہا تھا۔

شام سر پہ کھڑی کوک رہی تھی، اداسی سی تھی جو دلوں کو گھیرے میں لئے جا رہی تھی اس شام کی کبھی سویر نہ ہونے پائے، لاجو کی آنکھ سے بھی گرتے اشک رو کے رہے تھے یہ شام جس میں آنے والی کئی شاموں کا سیاہ رنگ شامل تھا جو آئے گی اور کبھی لوٹ کر نہیں جائے گی اس کے بخت کی سیاہی میں ڈھل جائے گی۔

☆☆☆

بچھی نے دروازہ کھٹکھٹایا، دروازہ کھلا، سامنے والے بندے کو دیکھ کھولنے والے کا رنگ زرد پڑ گیا، وہ بت سا کھڑا دیکھتا رہا۔

"اندر آنے کو نہیں کہو گے۔" بچھی کی آواز اسے دور کنوئیں سے آتی سنائی دی، وہ کھسیانی سی ہنسی ہونٹوں پہ سجاتا دروازے سے پیچھے کو ہٹ گیا، وہ اندر آ گئی اس کے پیچھے پیچھے وہ بھی اندر آ گیا، لاجو کے ساتھ بات پکی ہونے کے بعد یہ ان کی پہلی ملاقات تھی اس لئے پہلے وہ خود ہی اسے دیکھ غائب ہو جاتا تھا، وہ سامنے پیڑھی پہ بیٹھ گئی، خود کو وہ بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی اور مطمئن بھی جیسے اسے کسی چیز کا کوئی ملال نہ ہو، بشی اس کے سامنے دونوں بازو کمر پہ باندھے شرمندہ سا کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" بچھی کے پوچھنے پر اس نے سر نیچے کو جھکا دیا۔

"بولو ناں۔" بچھی نے آگے ہاتھ بڑھایا اور اسے پاس بیٹھنے کے لئے کہا۔

"وہ...... میں۔" اسے جیسے بات نہ آئی اپنی صفائی میں وہ کیا کہتا کہنے کو کچھ بچا ہی نہیں تھا۔

"کچھ نہ کہو، میں سب جانتی ہوں۔" بچھی کمال ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

"لاجو ایک اچھی لڑکی ہے اور میں کسی کی بیوی بننے کے قابل نہیں ہوں۔" یہ کہتے ہوئے بچھی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"بیوی بننے کے لئے جو چیزیں شرط کے طور پہ ہوتی ہیں ان میں، میں تو بالکل فیل

"مجھے تم پر کسی قسم کا کوئی افسوس نہیں، افسوس نام ہی میں نے اپنی زندگی سے نکال باہر کیا ہے۔" چھمی کی زرد ہوتی رنگت جانے کن کن باتوں کا پتہ دے رہی تھی۔

"یہ تو بس نمبردار جی نے کہا اور میں۔" وہ اپنی صفائی میں بولا۔

"اور تم نے مان لیا۔" اک لمحے کے لئے چھمی کی آنکھوں میں شکوہ کوندا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ ٹھیک ہو گئی، اس نے منشی کو بڑی محبت سے اپنے پاس بٹھایا اور اس کا ہاتھ چومنے لگی، منشی کے بدن میں تھرتھراہٹ سی ہونے لگی اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔

"یہ تو بے ایمانی ہے۔" وہ سن کر یوں کھوکھلا سا ہنسا۔

"لاجو کی امانت میں خیانت نہیں ہو سکتی۔" وہ تکلیف کے باوجود مسکرائی۔

"اپنی بھول گیا کتنی دیر نمبردار کی امانت میں خیانت کرتا رہا ہے تو۔"

"بس وقت وقت کی بات ہے۔"

"اچھا اب تیری دفعہ وقت بدل گیا ہے۔" چھمی کے اندر پھیلے زہر نے انگڑائی لی۔

"وقت نہیں بدلا، بس بہت ہو گیا غلطی کو جلد غلطی مان لو تو اچھا ہوتا ہے سب کے لئے۔" اس کے اندر انگڑائی لیتا زہر باہر آنے کو مچلنے لگا۔

"میرا ساتھ غلطی تھی تیرے لئے جسے تو اب سدھارنا چاہ رہا ہے۔" غصے سے چھمی کا رنگ لال ٹماٹر کی طرح ہو گیا جیسے یہ پھٹا تو ابھی سب کچھ رنگین ہو جائے گا، گلال سا ہو گا جو ہر طرف پھیل جائے گا۔

"نمبردار کے ساتھ بے وفائی کر کے میں نے تیرے ساتھ نبھا کی اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں۔"

"تاریخ گواہ ہے بے وفاؤں کے ساتھ کبھی وفا نہیں ہوتی۔" چھمی کا دل چاہا ابھی وہ کوئی بھاری پتھر اٹھائے اور اس کے سر پر دے مارے۔

"تو نے بھی تو نمبردار کے ساتھ بے وفائی کی اور اگر میں نے تیرے ساتھ کر دی تو کیا برا کیا، دونوں اک دوسرے کو الزام نہیں دے سکتے۔"

"میں نے لاجو کو دیکھا ہے اور جیسا بیوی کو ہونا چاہیے وہ بالکل ویسی ہے، سیدھی سادھی، سوہنی۔" منشی کی آنکھوں کے آگے لاجو کا معصوم چہرہ گھوم گیا۔

"اب اس کے علاوہ میں نے کبھی کسی کو سوچا بھی نہیں۔" چھمی کا دل اس وقت اس چوٹ کھائے ناگ کی طرح تھا جس کی گردن پر کسی نے پیر رکھ دیا تھا دل چاہ رہا تھا تھپڑوں سے اس کا چہرہ لال کر دے پر ابھی وہ ایسا کچھ کرنا نہیں چاہ رہی تھی اس لئے اپنے غصے کو تھوک کی طرح اندر نگلتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو پر سکون سا بنا لیا۔

"میں کب کہتی ہوں تو لاجو کے ساتھ بیاہ نہ رچا پر میرا بھی تو خیال کر یہ دل تیرے سوا کسی کو مانتا ہی نہیں، میرا مقام جو پہلے تھا وہی رہنے دے۔" چھمی نے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا تو منشی کا دل پگھل سا گیا اگر اتنا وقت گزارا تھا اس کے ساتھ۔

"میں تجھے دل دے بیٹھی ہوں اکبر، تو پاس نہ ہو تو دنیا بڑی ویران لگتی ہے، میں نے تو تجھے اپنا سب کچھ مان لیا تھا۔" اس کے آنسو منشی اکبر کے دل پر گرنے لگے۔

ہولے ہولے چھمی نے اسے شیشے میں اتار لیا اور اس کے سینے پر سر رکھ دیا، منشی تو پہلے ہی

شرمندہ تھا اب اپنی شرمندگی مٹاتے ہوئے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور کچھی، وہ تو دام میں لانے کے سارے ہنر جانتی تھی مرد کو کیسے قابو کیا جاتا ہے، وہ پوری طرح منشی اکبر کو اپنے دام میں لا چکی تھی اور وہ منشی آنکھیں بند کیے ساری دنیا کو بھول چکا تھا۔

کچھی کے پیار نے جیسے اسے اندھا کر دیا اسے اس وقت کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا اور یہی وقت تھا جب کچھی اپنا وہ قدم اٹھا سکتی تھی جس کی خاطر وہ اتنی دیر سے اس کے ساتھ کھیل کھیل رہی تھی۔

اس نے منشی کے چہرے کی طرف دیکھا جو اک عجیب ہی رنگ میں رنگا ہوا تھا زہر لگا تھا وہ اسے، اس نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنا شروع کیا مست سا وہ مزید ڈھیلا ہو گیا، کچھی کے اندر پھیلا زہر ایک لمحے میں باہر آ گیا اس نے خنجر نکالا اور ایک ہی وار میں اس کی شہ رگ کاٹ ڈالی، خون کا فوارہ سا اڑ کر کچھی کا چہرہ رنگین کر گیا، اس نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ ایک دفعہ پھر خنجر اس کی گردن پر چلایا۔

منشی جو عورت کے نشے میں ڈوبا تھا ایک عورت کی نفرت نے اسے مات دے دی تھی، کچھی کے نیچے لال خون کا دریا سا بہہ رہا تھا، شعلے اگلتی نظروں کے ساتھ وہ منشی کی لاش کو دیکھتی رہی جو کافی دیر تڑپنے کے بعد ٹھنڈی ہو گئی تھی، میری زندگی برباد کر کے خود زندگی کے مزے لوٹنا چاہ رہا تھا۔

وہ اپنے چہرے پر پڑے خون کے فوارے کو اپنے دوپٹے سے صاف کرتی اٹھی اور وہ اس کے مردہ جسم پر ڈنڈا برسانے لگی، جانے کتنی دیر وہ اس کے مردہ جسم پر ڈنڈے مارتی رہی، پھر کپڑے میں اپنا خنجر اٹھائے کھڑی ہو گئی، خنجر کی

ہتھی کو اس نے سفید کپڑے سے باندھ رکھا تھا۔
خنجر دراصل نمبردار فضل الٰہی کا تھا جو وہ اس دن اس کی حویلی سے چوری اٹھا لائی تھی۔

وہ اس پورے علاقے کا چوہدری تھا اس کے سامنے آ کر وہ اس سے اپنا بدلا نہیں لے سکتی تھی اس کی بڑی پہنچ تھی اور اس کی بڑی چھوٹی اوقات تھی سو اس نے اس سے بدلا لینے کا دوسرا راستہ چنا تھا۔

منشی اکبر کو تو اس کے کیے کی سزا مل گئی تھی اب نمبردار کی واری تھی۔

گھر آ کر وہ کافی دیر کمرے میں چپ چاپ بیٹھی رہی ایسے جیسے کوئی اپنی ساری پونجی لٹنے کے بعد یہ سوچتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا بنا ہے، اس کی نظروں کے سامنے سے بھی گزری یادیں صاف شفاف آئینوں کی طرح چل پھر رہی تھیں، اچھی خاصی زندگی جس راستے پر چل پڑی، نمبردار اگر مجھے یا میں خود اس راستے پر نہ چلتی تو آج میں بھی ایک باعزت زندگی جی رہی ہوتی، میرے ماں باپ میری وجہ سے جیتے جی روز مرتے رہیں گے، قصور جس کا بھی تھا سزا تو اسے بھی ملنی چاہیے۔

اس نے خدا کا نام لے کر وہی خنجر اپنے گلے پر رکھ لیا، بڑا مشکل مرحلہ تھا جس کو اس نے پار کرنا تھا اس مرحلے کو پار کر کے ہی اس کے گناہوں کی تلافی ہو سکتی تھی، خنجر والا ہاتھ برق رفتاری کے ساتھ اس کے زخمی گلے پر چل گیا خون کے فوارے سے ابل پڑے، کمرے کی دیواریں خون کے چھینٹوں سے رنگین ہو گئیں، وہ لڑکھڑاتے ہوئے منشی کی منجی کے اوپر آن گری، وار اتنا کاری تھا کہ اسے تڑپنے کا موقع بھی نہ ملا بدن پل میں ہی ٹھنڈا ہو گیا، خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا اور اس کے گرد لپٹا ہوا کپڑا بھی الگ دور جا گرا۔

یہ کپڑا اس نے جان بوجھ کر اس خنجر کے گرد لپٹا تھا کیونکہ اس پر نمبردار کی انگلیوں کے نشان تھے جنہیں وہ بڑی احتیاط کے ساتھ حویلی سے لائی تھی کہ یہ نشان کہیں مٹ نہ جائیں بڑے دنوں کا اس نے یہ سب سوچ رکھا تھا جسے اس نے اب عملی جامہ پہنایا تھا، وہ چاہتی تھی کہ یہ نشان باقی رہیں، نمبردار کو وہ مر کر بھی برباد کرے گی یہ اس نے بہت پہلے کا سوچ رکھا تھا۔

☆☆☆

یہ رات جانے اور کس کس پر قہر ڈھانے والی تھی، لاجو ہاتھ میں نیلا تھوتھا پکڑے اس کے بڑھتے سیاہ سایوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ رہی تھی جو جانے کس پل اس کی ہستی کو نگلنے والے تھے۔

یہ سویرا اگر چڑھ آئی تو وہ کبھی بھی فضل سے نظریں نہیں ملا پائے گی۔

چاچا بھی بے چین سا چھت پر لیٹا کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا وہ ویڑے کے بیچ پھیلے اندھیرے میں کھڑی جانے کس کو اڈیک رہی تھی کس نے آنا تھا وہ تو اب آس امید ہی چھوڑ بیٹھی تھی جس کو نظریں ڈھونڈ رہی تھیں وہ کہیں نہیں تھا، اب تو آنکھوں میں اتھرو بھی خشک ہو گئے تھے اتنا رو چکی تھی وہ، اندر سے وہ بالکل کھوکھلی ہو چکی تھی، چاند دھیرے دھیرے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا اس کی منزل بھی اسے قریب آتی نظر آ رہی تھی اس نے ہاتھ میں پکڑے نیلے تھوتھے کو دیکھا، یہی ہے اس کی منزل۔

کیسے کیسے خواب نہ دیکھے تھے میں نے وہ سب یوں مٹی میں رل جائیں گے اسے پتہ نہ تھا میرا افضل یوں مجھ سے دور ہو جائے گا میں نے سوچا ہی نہ تھا اور میں اس کی جدائی میں یہ سب کروں گی مجھے کبھی خیال ہی نہ آیا تھا۔

''وقت سے پہلے وقت سے ڈرنا ایک انسان کو کمزور ظاہر کرتا ہے اور میری لاجو تو کمزور نہیں ہے۔''

افضل کی کہی ہوئی بات بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندی، کمزور نہیں تھی یہ تیری جدائی نے کمزور کر دیا مجھے افضل، میں ہار گئی، ہار گئی۔

ابھی تھوڑی دیر میں سب کچھ ختم ہو جائے گا، میں میرے خواب، کچھ نہیں بچے گا، بڑی مشکل سے آنکھوں میں بچا کچھا پانی بھی باہر نکالتی وہ بڑی حسرت سے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی، وہ من ہی من میں کسی کو اڈیک رہی تھی، اس کا دل کس کو کھوج رہا تھا۔

چاند کی کرنیں شرمندہ سی جامن کی شاخوں سے اسے جھانک رہی تھیں، سامنا نہیں کر پا رہی تھیں وہ اس لڑکی کا جس نے اسے گواہ بنا کر بھی محبت کی بڑی بڑی قسمیں کھائی تھیں، آج کی رات وہ ساری قسمیں مٹی میں رلنے والی تھیں، ہوا تو پہلے ہی کہیں منہ چھپائے جا بیٹھی تھی سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی۔

آنکھیں لاشعوری طور پر دروازے کی کنڈی کی طرف لگی تھیں، کیوں اس کا دل بار بار اسے کہہ رہا تھا کہ وہ ادھر ہی ہے کہیں، اسی کی خوشبو بسی ہے رات رات کے اندھیرے میں،

رات دھیرے دھیرے بے راگ، دیس اور بھاگیشری کے سروں سے نکل کر مالکونس کے سروں میں ڈھلتی جا رہی تھی، دل ڈوب کر ابھر رہا تھا سویر آنے والی تھی دل میں اٹھتی پیڑ کو دل میں دبائے نظریں دروازے کی طرف ایسے لگی تھیں جیسے کوئی مرنے والا مرتے دم تک کھلی آنکھوں اپنے چاہنے والے کا انتظار کرتا ہے، جب تک اس کا دیدار نہ ہو جان اٹکی رہتی ہے۔

اڈیک کا ناگ اس کے بدن پر نیلے دھبوں کی صورت میں اپنے نشان چھوڑے جا رہا تھا، انتظار...... انتظار...... یہ ایک ایسی بلا ہے جو اک انسان کو اندر سے توڑ مروڑ دیتی ہے بدن سے آخری سانس تک کھینچ لے جاتی ہے۔

''افضل میں تجھ سے ملے بغیر ہی اس دنیا سے چلی جاؤں گی۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑا نیلا تھوتھا ہولے ہولے اپنے منہ کی طرف بڑھانا شروع کیا، گزری یادیں بھاگتی دوڑتی اس کی نظروں کے سامنے سے گزر رہی تھیں، افضل کا ہنستا مسکراتا چہرہ اس کے بڑھتے ہاتھ کو روک رہا تھا۔

''تیرے بغیر زندہ نہیں رہنا مجھے۔'' وہ ہنستے مسکراتے چہرے سے رو رو کر کہہ رہی تھی۔

''تو آجا افضل، آجا۔'' تڑپتے دل کی فریاد شاید خدا کے حضور قبول ہو گئی تھی، انتظار کے کسی با وفا لمحے نے ہولے سے دروازے کی کنڈی ہلائی، اس نے اپنی بجھی ہوئی پلکیں جھپکائیں۔

''ہوا ہو گی۔'' ذہن نے کہا، چاہ کر بھی وہ نہ اٹھی، مایوس لوٹنے سے بہتر ہے دوسری دفعہ پھر دروازہ ہلا، اب کی بار اس نے صرف دل کی مانی تھی اور جب دل کچھ کہے تو وہ غلط نہیں ہوتا، چاند نے چپکے سے اس کے کان میں کہا۔

''میں گواہ بنا تھا اور میں ہی تیری قسمت جگاؤں گا۔'' افضل آنکھوں میں ڈھیروں شکوے لئے دروازے میں کھڑا تھا اور وہ جو افضل کے آنے کی امید ہی چھوڑ بیٹھی تھی اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے کوئی مرنے والا زندگی کو دیکھتا ہے۔

وہ چلتا ہوا اندر کو بڑھ آیا تو وہ نیم جاں سی دروازہ پکڑے نیچے کو گر گئی، افضل نے آگے بڑھ کر اسے اپنی باہوں میں بھر لیا۔

''میں کوئی سفنہ تو نہیں دیکھ رہی۔'' اس کے ہاتھ سے نیلا تھوتھا گر گیا افضل کا دل جیسے دہل

گیا۔

"لاجو تو یہ کیا کرنے جا رہی تھی۔" وہ جو اس سے اپنی محبت بھول جانے کا پوچھنے آیا تھا، دیوانہ وار لاجو کو بانہوں میں بھرے اسے آوازیں دیے جا رہا تھا۔

"لاجو آنکھیں کھولو، یہ تو کیا کرنے جا رہی تھی۔" اس کی جدائی میں لاجو سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی، وہ بری طرح گھبرا گیا تھا، یہ وہی لاجو تھی جسے وہ چھوڑ کر گیا تھا، لاجو نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔

"تیرے بغیر یہ حیاتی صرف کانٹوں پر چلنا ہے، اس لئے مرنے......"

"اس لئے مرنے کا سوچ لیا، یہ بھی نہ سوچا تیرے افضل کا کیا بنے گا۔"

"وہ افضل!" وہ اس کے سینے سے جا لگی۔

افضل کو نیا پتہ ہونے کی وجہ سے خط دیر سے ملا تھا اور خط پڑھتے ہی وہ تو اپنے پیار کو پانے کے لئے دوڑ پڑا، اس کا پیار سچا تھا، اس لئے وہ وقت پر پہنچ گیا تھا ورنہ وہ جو کرنے جا رہی تھی اس سے تو وہ ساری زندگی کے لئے برباد ہو جاتا۔

رات کا سرمئی اندھیرا چاند کو بانہوں میں بھرے سویر کی طرف بڑھ رہا تھا، رات اب تھوڑی دیر میں ختم ہونے والی تھی۔

"لاجو تو نے سوچا بھی کیسے، اپنے پیار کا خود ہی گلا گھونٹ رہی تھی تو۔" شکوہ اس کی زبان پر آ ہی گیا۔

"میرا چاچا مجھ سے بہت پیار کرتا ہے، میں اپنے چاچے کے شملے میں داغ نہیں لگانا چاہتی تھی اور تیرے بغیر جی نہیں سکتی تھی اس لئے۔"

"اس لئے مرنے جا رہی تھی۔" آوازیں سن چاچا بھی پوڑیاں اتر نیچے آ چکا تھا، لاجو کی باتیں سن کر وہ شرمندہ سا کچے میں منہ دیے رونے لگا۔

"میری دھی میری عزت کی خاطر اپنی خوشیاں قربان کر رہی تھی اور آج اس نے جان سے بھی چلے جانا تھا۔"

"اب میں آ گیا ہوں لاجو سب ٹھیک کر دوں گا، تیرے چاچے کو بھی منا لوں گا، بھروسہ رکھ میرے اوپر۔"

"خدا کے بعد تیرے اوپر سب سے زیادہ بھروسہ ہے مجھے۔" وہ پیار سے اس کے کندھے سے جا لگی۔

یہ فجر سے تھوڑا پہلے کا وقت تھا، آج ایک نئی سویر ان دونوں کی زندگیوں کو نئی روشنی دینے جا رہی تھی جس میں بھی کسی اندھیرے کا گزر نہیں ہو گا۔

فجر سے پہلے کا وقت اور فضاؤں میں تیرتے، ہنڈول اور اخیر بھیروں کے میٹھے سر اور افضل بھی تو اس کے لئے میٹھے سروں کی طرح ہی تھا، وہ اپنے رب کی شکر گزار تھی جس نے وقت پر سب کچھ برباد ہونے سے بچا لیا تھا۔

☆☆☆

نایاب جیلانی

قسط کا خلاصہ

امام عشیہ کے کہنے پر نیل بر کی مدد کرتا ہے اور اسے اپنے ساتھ لے کر شہر کے لیا نکلتا ہے، راستے میں صندیر خان کے آدمی امام پر حملہ کرکے شدید زخمی کر دیتے ہیں اور نیل بر کو واپس صندیر خان کے پاس لے آتے ہیں، جہاں سزا کے طور پر خان بابا کو نیل بر کی شادی جہاندار سے کرنی پڑتی ہے، جہاندار، نیل بر کو اپنے ساتھ ایک سنسان مقام پر خالی حویلی میں لے کر آتا ہے۔

حمت کو امام کے زخمی ہونے کا پتا چلتا ہے تو وہ شدید پریشان ہو جاتی ہے، دوسری طرف فرح اجتہائی افراتفری میں نشرہ اور ولید کی شادی کا کہتی ہے اور مکان نشرہ کے نام کرنے کو کہتی ہے۔

اب آپ آگے پڑھیے

''میں تم پہ اعتبار نہیں کرسکتا نیل بر، تم نے اپنا اعتبار کھودیا ہے۔'' جہاندار کے الفاظ اس کے پرجوش انداز سے مختلف تھے، نیل بر اندر تک سن ہوگئی تھی۔

''گھر سے بھاگ کر نہ۔'' نیل بر کے ٹوٹے لہجے میں کانچ تھے، بکھرے کانچ، چبھن دیتے، وہ جہاندار کے حصار کو توڑ کر کہیں دور بھاگ جانا چاہتی تھی، مگر وہ ایسا کر نہیں سکی۔

''نہیں۔'' جہاندار کے اگلے الفاظ حیران کن تھے، نیل بر جیسے بھونچکی رہ گئی تھی۔

''تو پھر؟'' اس کی ویران آنکھوں میں سوال اتر آیا۔

''تم سردار ہنو کی بیٹی ہو، تم پہ اعتبار کیسے کروں؟'' جہاندار نے دھیمی بوجھل آواز میں کہا تھا۔

''میرے بابا برے ہیں، شاید بہت برے ہیں، ان کے گناہوں کی سزا یہ کم ہے کہ وہ مجھے عمر بھر دیکھ نہیں سکیں گے؟ میں جو ان کے وجود میں دل بن کر دھڑکتی ہوں۔'' جانے کس رو میں بہک کر نیل بر نے کہہ ہی دیا تھا، جہاندار لمحہ بھر کے لئے چونکا تھا، پھر سر جھٹک گیا، جیسے کسی سوچ سے پیچھا چھڑوایا ہو۔

''تمہارے باپ کے گناہوں کی فہرست بہت لمبی ہے میری جان، اتنی سی نیل بر کہاں تک کفارے ادا کرے گی۔'' جہاندار کے لبوں سے سلگتے الفاظ نکلے تھے۔

''انہوں نے کیا ایسا کردیا؟ جس کی کوئی معافی نہیں؟'' نیل بر کو اندازہ نہیں تھا، اس نے کن شعلوں کو انجانے میں ہوا دے ڈالی تھی، جہاندار نے ایک جھٹکے سے نیل بر کو خود سے الگ کیا تھا اور پھر اپنی خونی آنکھیں اس کے چہرے پہ جما دی تھیں۔

''میری بہن غنچہ گل کو طلاق دی تھی، اسے بے گھر کیا، اس کی چار بیٹیوں کو بے وارث کیا، اپنی اولاد کو وراثت سے بے دخل کیا، حتیٰ کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنا ماننے سے بھی انکار کردیا، کیا اس کے جرائم کی فہرست کم ہے کیا؟'' وہ دھیمی سلگتی آواز میں کہہ رہا تھا اور نیل بر کسی بت کی طرح ساکت تھی۔

''آپ کن لوگوں کی بات کررہے ہیں؟'' نیل بر کے سر پہ جیسے دھماکے ہو رہے تھے، سردار ہنو کی اولاد؟ چار بیٹیاں؟ ایک بیٹا؟ یعنی کہ نیل بر کے سوتیلے رشتے، بہنیں اور بھائی؟ نیل بر کے حواسوں پہ تو بم گررہے تھے، یہ سب کیا ہو رہا تھا، یہ کیسا انکشاف تھا؟ جس نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

''میں اپنے کھوئے ہوئے رشتوں کی بات کررہا ہوں، جو تمہارے باپ کے کالے کرتوتوں کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے کھو گئے تھے، میں عشیہ اور ہیام کی ماں کی بات کررہا ہوں، جو میری بدنصیب بہن تھی۔'' جہاندار کے لفظ لفظ میں انگارے تھے، جن کی تپش نے نیل بر کو سرتاپا راکھ کر دیا تھا۔

نیل بر کے لئے یہ انکشاف دل دہلا دینے والا تھا، وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جہاندار کے چہرے کو دیکھتی رہی، جہاندار کے چہرے پہ اذیت کی ایک واضح تحریر رقم تھی، نیل بر سے مسلسل اس کے چہرے کی طرف دیکھنا محال ہوگیا تھا۔

''مجھے یقین نہیں آتا، بابا جان کی ایک اور شادی بھی تھی اور ان کے بچے بھی تھے۔'' وہ کچھ دیر

بعد نیل بر نے سر جھکا کر بمشکل کہا تھا، جہاندار پتھریلی آنکھوں کے رخ موڑتا لمحہ بھر کے لئے زہر خند ہو گیا تھا۔

''مجھے؟ نہیں، موجود ہیں اور ایک نہ ایک دن تمہارے باپ کے گلے کا پھندا ضرور بنیں گے۔''

''وہ کہاں ہیں؟'' نیل بر سے کچھ دیر تک کے لئے بولا نہیں گیا تھا، پھر جب وہ بولی تو اس کی آواز مدہم تھی۔

''ادی (غنچہ گل) اپنے ننھیالی گاؤں چلی گئی تھیں، وہ نہ گلگت آئیں نہ ہیال میں قیام کیا، وہاں رہنے کا جواز ہی کیا تھا، تمہارے باپ نے انہیں طلاق دے دی تھی۔'' جہاندار کا چہرہ نفرت سے سرخ پڑ گیا تھا۔

''کیوں طلاق دی تھی؟'' نیل بر نے بے قراری سے پوچھا تھا، جہاندار کی زخم زخم آنکھوں میں ایک کہانی کے خون آلود اوراق پھڑ پھڑانے لگے تھے، یوں لگ رہا تھا، جیسے پورب کی طرف سے کوئی طوفان اٹھ رہا ہے، آسمان کا رنگ سرخ تھا، جیسے کہیں دور گنہ گار پہاڑ کے پیچھے قتل کی واردات ہوئی ہو۔

تو وہ وقت آ چکا تھا، جب بہت پرانی دفن شدہ کہانی کے صفحات کو کھول کر طشت از بام کر دیا جاتا، وودھا اور فرخزاد کی محبت کو ایک مرتبہ پھر رسوا کر دیا جاتا۔

''وودھا اور فرخزاد کے قتل سے پہلے ادی کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیا اور پھر ان دونوں کو بے رحمی سے قتل کر دیا تھا۔'' اس کی سرخ ہوتی آنکھوں میں اذیت ہی اذیت بکھر رہی تھی۔

''فرخزاد کون تھا؟'' نیل بر کی آواز اتنی مدہم تھی کہ بمشکل ہی اس کے کان سن پائے تھے۔

''میرا بھائی تھا، میرا جان عزیز، تمہارے بے رحم باپ نے اسے قتل کر دیا۔'' جہاندار کی آنکھوں سے لہو بہنے لگا۔

''محبت کرنا اس کا جرم تھا، اس جرم کی اتنی بڑی سزا نہیں تھی، لیکن اسے بھی سزا دی گئی، اس لئے کہ تمہارے باپ کو وودھا کے حصے کی زمین چاہیے تھی۔'' اس کا بہتا لہو اب سرد، برف کی مانند منجمد ہو رہا تھا۔

''اور اب وقت آ چکا ہے، وہ اپنے کیے کی سزا پائے گا۔'' جہاندار ایک فیصلے پہ پہنچ کر نیل بر کی طرف دیکھ کے مسکرایا تھا، نیل بر کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی تھی۔

جہاندار کیا کرنا چاہتا تھا؟

اس کا دل بری طرح سے دھڑکنے لگا تھا۔

اور اس ''انتقام'' کے بیچ میں کہاں ہوں، جہاندار؟ کچھ دیر بعد نیل بر نم ہوتی آنکھوں میں دنیا جہاں کی معصومیت بھر کے پوچھ رہی تھی، اس حال میں جہاندار کو نیل بر سے اس ''دلیری'' کی امید ہی نہیں تھی، جہاندار لمحہ بھر کے لئے لاجواب ہو گیا تھا۔

☆☆☆

بی جاناں کو خطرے کی گھنٹیاں اپنے آس پاس سنائی دے رہی تھیں، پچھلے چند دن سے وہ

گھبرے اضطراب میں مبتلا تھیں، نیل بر کا قصہ تو ختم ہوا تھا، لیکن اس دن کے بعد جو کچھ انہوں نے سہاخانہ سے سنا تھا، ان کا دل کانپ سا گیا تھا۔

اب وہ مزید دیر کیا کرتیں؟ ویسے بھی نیل بر کے بعد باقی رہ جانے والی ان دو لڑکیوں کے حق میں مزید دیر کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

سو وہ کئی دن کی "بچار" کے بعد فیصلہ کر کے آج بیٹے سے حتمی بات کرنے کے لئے سردار ہو کے کمرے کی طرف جا رہی تھیں، سردار ہو کا کمرہ رہائشی حصے سے قدرے الگ تھا۔

بی جاناں کو اس طرف جاتا دیکھ کر ڈسٹنگ کرتی پری گل لحہ بھر کے لئے چونکی تھی، ایسے ہی باورچی خانے کی طرف بڑھتی حمت بھی چونک سی گئی تھی اور اس کی آنکھوں میں خیال سا اترا تھا۔

"بی جاناں! بابا کے کمرے میں کیوں جا رہی ہیں؟" اس کی آنکھوں میں اتری سوچ نے پری گل کے تجسس کو بھی ہوا دی تھی، وہ پکڑا ہاتھ سے رکھ کر پیچھے سے حمت کے قریب ہی کھسک آئی تھی، اب بی جاناں تو سامنے تھی نہیں، جس کا ڈر ہوتا، وہ صفائی کچھ دیر بعد بھی کر سکتی تھی۔

"بی جاناں کچھ پر اسرار لگتی ہیں، اللہ خیر کرے، بہت دن سے گہری سوچ میں گم ہیں۔" حمت نے اپنا خیال ظاہر کیا تھا، پری گل نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

"دیکھ لینا بی بی! ام سے لکھوا لو، کوئی دھماکہ ضرور ہوگا۔"

"نیل بر والے قصے سے بڑھ کر بھی کوئی دھماکہ ہو سکتا ہے؟" حمت افسردگی سے بولی تھی۔

"بات معمولی نہیں لگتی، بی جاناں خاصی پریشان ہیں۔" کچھ دیر بعد حمت گہرا سانس لیتی کہہ رہی تھی۔

"اوم..... تم ٹھیک کہہ رہا بی بی، بی جاناں کوئی نہ کوئی تخریب کاری ضرور سوچ رہا۔" پری گل نے سیانے پن سے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے کہا تھا، پھر حمت کو گھورتا پا کر سٹ پٹا گئی تھی۔

"اوئی ماں۔" اس نے دانتوں تلے زبان دبالی تھی، حمت سر جھٹک کر کچن میں آ گئی تھی، پری گل بھی اس کے پیچھے تھی، حمت نے گردن موڑ کر دیکھا، جیسے کہتی ہو۔

"اب کیا ہے؟"

"ام کو تمہیں کچھ بتانا تھا بی بی۔" تھوڑی دیر بعد وہ چمکتی آنکھوں میں ایک خیال بھر کے کہہ رہی تھی، حمت کو اس کا لہجہ غیر معمولی لگا تھا۔

"کیا؟" حمت نے بے ارادہ ہی پوچھ لیا۔

پری گل نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا، پورا ہال بھاں بھاں کر رہا تھا، اس وقت رہائشی حصے میں کوئی بھی نہیں تھا، پری گل کو ایک گونہ احساس ہوا، وہ مطمئن ہو کر حمت کی طرف مڑی تھی، پھر اس کے قریب پہنچ گئی، حمت کو اس کے انداز غیر معمولی لگ رہے تھے، اس کا دل بری طرح سے دھڑکنے لگا تھا، پری گل کچھ خاص بتانے والی تھی؟

"کیا بات ہے پری گل؟" حمت نے اندر اٹھتیں، مارتی بے چینی کو دبا کر پوچھا تھا۔

"بی بی! مارے اس فون پہ اس کی کال آئی تھی۔" پری گل نے کپکپاتی آواز میں بتایا تھا، حمت گھبرا سی گئی تھی۔

''کس کی کال؟'' اسے کچھ پلے نہ پڑا تھا۔
''اوئی ماں!'' پری گل نے اپنے سر پر ہاتھ مارا تھا۔
''اسی کی کال، وہی جو نیل بر بی بی کو بھگا کر، مطلب اڈے پہ چھوڑنے گیا تھا، بابا کا افسر، صاحب...... بنگلے کا صاحب۔'' پری گل اسے یوں سمجھانے لگی تھی جیسے حمت کو بابا کا افسر، بنگلے کا صاحب بھول چکا تھا۔
کیا یہ ممکن تھا کہ حمت اسے بھول جاتی؟ کیا وہ بھول جانے کے لائق تھا؟ جو قربانی اس نے حمت کے لئے دی تھی اسے بھلایا جا سکتا تھا؟ کیا یہ ممکن تھا؟ امام کا خون رائیگاں جاتا؟ تو حمت اسے اپنی آخری سانس تک نہیں بھلا سکتی تھی؟
''اس کا فون آیا؟ ڈپٹی سپرویئر امام فریدے کا؟ پری گل! کھا قسم، اسی کی کال تھی؟ وہ ٹھیک تھا پری گل۔'' حمت کو جیسے زماں و مکاں بھول گئے تھے، اس کی آنکھوں سے بھل بھل آنسو گرنے لگے تھے اور وہ پری گل کو جھنجھوڑ رہی تھی اور پری گل جیسے ہکا بکا رہ گئی تھی، اسے یوں لگا، بی بی کا دماغ چل گیا ہے۔
''بی بی! وہ ٹھیک تھا۔'' پری گل نے جلدی سے بتا دیا، مبادا حمت بی بی کہیں غم و خوشی کی کیفیت میں چلانا نہ شروع کر دے، وہ اتنا بڑا خطرہ مول لینے سے ڈرتی تھی۔
''اس نے کیا کہا؟'' وہ بھل بھل گرتے آنسوؤں کو پونچھتی بے قراری سے پوچھ رہی تھی۔
''صاحب نے بولا، اپنی بی بی کو بتا دو، وہ ٹھیک ہے اور زندہ بچ گیا، اس کا بچنا ایک معجزے سے کم نہ تھا۔'' پری گل سوچ سوچ کر بتا رہی تھی، مبادا کہیں مبالغہ آمیزی نہ کر دے۔
''اور اس نے کچھ نہیں کہا؟''
''اس نے کہا، اپنی بی بی کو بول دینا، جان دی ہے تو جان لینی بھی ہے، صاحب نے کہا، بی بی کو قرض چکانا ہوگا۔'' پری گل جلدی جلدی بتا رہی تھی، حمت نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے اور لمبی لمبی سانسیں کھینچتی ہوئی بڑی لجاجت سے بولی تھی۔
''پری گل! میرا ایک کام کرے گی کیا؟'' حمت کی گیلی بھیگی آنکھوں میں التجائیں کرلا رہی تھیں، پری گل نے وفاداری سے اثبات میں سر زور زور سے ہلایا تھا۔
''پہلے ام نے کبھی کام نہیں کیا کیا؟''
''بہت شکریہ میری جان۔'' حمت نے اس کے ہاتھ پکڑ کر چوم لئے تھے، پری گل اس نیاز مندی پہ واری صدقے ہوئی تھی۔
''مجھے وہ موبائل ایک مرتبہ پھر لا دینا، مجھے تمہارے صاحب سے بات کرنی ہے۔'' پری گل حمت کی خواہش جان کر لمحہ بھر کے لئے بھونچکی رہ گئی تھی۔
تو کیا نیل بر بی بی کے بعد اب حمت بی بی بھی ''بغاوت'' کی راہوں پہ چلنے کی خواہش رکھتی تھیں؟ پری گل کا ننھا سا ذہن چکرا سا گیا تھا اور دوسرے ہی پل اس نے اثبات میں سر ہلا کر حامی بھر لی تھی۔

☆☆☆

بی جاناں کے قدم بھاری تھے اور دل اس سے بڑھ کے بھاری تھا۔
جانے کن کیسے پتھر رکھ کے انہوں نے سردار بتو کے کمرے میں قدم رکھا تھا۔
کمرے میں ملگجا اندھیرا پھیلا تھا اور سردار انہیں مسہری پہ لیٹا دکھائی دے گیا، ان دنوں سردار کی طبیعت کچھ ناساز تھی، بلکہ نیل بر کے بعد یہ طبیعت اب سنبھلنے والی نہیں تھی، پے در پے دھچکوں نے سردار کو بڑی چوٹ کا ''دھچکا'' لگایا تھا۔
والدہ کے اندر آتا دیکھ کر سردار بتو سنبھل کر اٹھے اور قدرے چونک سے گئے تھے، بی جاناں بہت کم ان کی خواب گاہ میں آتی تھی، اب بھی اگر آئی تھیں تو یقیناً کوئی بڑا مقصد لے کر آئی تھیں۔
ان کا چونکنا ہونا فطری امر تھا۔
بی جاناں نے قریب پہنچ کر بیٹے سے طبیعت کا احوال دریافت کیا تھا، یہ ان کا تمہیدی انداز تھا، کچھ ہی دیر بعد سردار بتو نے گلا کھنکھار کے والدہ کے آنے کا مقصد پوچھ ہی لیا تھا۔
''مجھے تم سے بڑی ضروری بات کرنا تھی۔''
''فرمایئے بی جاناں۔'' وہ قدرے نحیف آواز میں بولے، ان کے لہجے میں پہلی سی گرج چمک مفقود تھی، بی جاناں کو شدید دکھ ہوا تھا، نیل بر ان کے بیٹے کا سارا جلال بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی، ان کے دل میں نیل بر کے لئے کدورت اور بھی بڑھ گئی تھی، اب وہ بیٹے کو بھلا کیا جتاتیں؟ نالی کی اینٹ نالی میں لگنے کے قابل تھی، ان کے بیوقوف بیٹے نے اسے محل میں سجا دیا تھا۔
معاً نیل بر سے دماغ ہٹا کر وہ حالیہ مسئلے کی طرف آ گئیں، وہ فیصلہ جو بہت دن کی بچار کے بعد ایک حتمی نتیجے پہ پہنچنے کا منتظر تھا۔
بی جاناں نے گلا کھنکھار کے بیٹے سے کہا تھا۔
''جو ہونا تھا ہو گیا، چاہے بہت برا ہی ہوا، نسلوں تک یاد رہے گا، خانزادے اپنی تاریخ اور ''بے عزتی'' نہیں بھولتے، آنے والی نسلوں تک یاد رکھتے ہیں، جو کچھ نیل بر نے کیا، وہ بھلائے جانے والا ہے بھی نہیں، لیکن وہ بہتر سزا پا چکی ہے، اب اس کے معاملے سے ہٹ کر ہمیں کچھ اندرونی معاملات کو بھی دیکھنا چاہیے۔'' بی جاناں کے تمہیدی انداز نے سردار کو چونکا دیا تھا۔
بی جاناں کس بات کی طرف اشارہ کر رہی تھیں، سردار نے ہنکارا سا بھر کے تسلی سے پوچھا۔
''آپ کھل کر بات کیجئے۔''
''میری خواہش ہے سماخانہ کی شادی کر دی جائے، مزید دیر مناسب نہیں۔'' بی جاناں نے رسان سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا، سردار بتو نے گہرا سانس بھرا اور سر اثبات میں ہلا دیا۔
''آپ کی خواہش بے جا نہیں۔''
''تو پھر بہتر ہے کہ تم شاہوار سے بات کرو، گھر کی بیٹیاں غیر برادریوں میں کہاں جائیں؟ اور سماخانہ کے جوڑ کا رشتہ خاندان میں ہے بھی نہیں۔'' انہوں نے اپنے دل کی بات بالآخر کہہ ہی دی تھی۔
''شاہوار ہوں۔'' سردار نے پھر سے ہنکارا بھرا تھا، دل میں اک ہوک سی اٹھی تھی، اگر نیل

بے پہ قدم نہ اٹھاتی تو وہ شاہوار کے لئے نیل بر کا ارادہ رکھتے تھے۔
"اگلے مہینے کی کوئی تاریخ رکھ لیتے ہیں۔" وہ جیسے ہتھیلی پہ سرسوں جما رہی تھیں، سردار بنو چونک گئے تھے۔
"شاہوار سے پوچھے بغیر تو نہیں۔"
"اس سے پوچھنا ضروری نہیں، جب بات صندیر خان کرے گا تو شاہوار کی رضامندی کی اہمیت ثانوی حیثیت اختیار کر جائے گی۔" بی جاناں جیسے سب کچھ ٹھان کر بیٹھی تھیں، وہ شاہوار کے لئے سارے آپشن ختم کر دینا چاہتی تھیں، تاکہ انکار کی کوئی گنجائش ہی نہ رہتی۔
"آخری فیصلہ بہر حال صندیر خان ہی کرے گا۔" سردار بنو نے اپنی کمزوری کا اظہار بالآخر کر دیا تھا، آہ، نیل بر نے کس طرح ان کے دونوں ہاتھ کاٹ کر رکھ دیئے تھے، اب وہ ہر فیصلے کے لئے اپنے بھتیجے کے محتاج تھے، وہ جو چاہے کرتا، جیسے چاہے کرتا۔
سردار بنو کی حیثیت اب بے تاج بادشاہ کی بھی نہیں تھی، یہ وہ سردار تھا جس کے تحت کو اس کی اپنی ہی رعایا نے الٹ دیا تھا، وقت ایسے ہی بڑے بڑے سرداروں اور فرعونوں کو پچھاڑ کے رکھ دیتا ہے۔

☆☆☆

صبح سے مورے کے وجود میں بے چینیاں سی بھری تھیں، اتنے گھٹنوں سے اپنے گھٹنوں کے درد کو بھلائے پورے گھر میں چکراتی پھرتی تھیں، کبھی بڑی بیاہتا بیٹی کو فون کرتیں، کبھی چھوٹی بیاہتا بیٹی کو، عشیہ اور عمکیہ بھی پریشان تھیں، جانے ماں کے دل کو کیسی بے چینی لاحق تھی، عمکیہ نے تو عشیہ سے کہا تھا۔
"ذرا مورے کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ، ان کا بی پی نہ آگے پیچھے ہو۔"
"کچھ بھی نہیں ان کو، بس ہیام سے اداس ہیں، پچھلے چند دنوں وہ جانے کس کی تیمارداری کرتا رہا، اب لاہور میں ہے، جانے کب گھر آئے۔"
عشیہ کے تسلی دینے پہ عمکیہ نے فون بند کر دیا تھا اور مورے تھوڑا چوکنا ہو گئی تھیں، ان کے کان کھڑے ہو چکے تھے، فوراً عشیہ کے سر پہ پہنچ گئیں۔
"کس کی تیمارداری کرتا رہا؟ مجھے بتایا تک نہیں، تم ایسے ہی مجھ سے ہر بات چھپاتی ہو۔"
مورے کا غصہ سوا نیزے پہ پہنچ چکا تھا، اب اپنی بے چینیوں کی بھڑاس وہ عشیہ پہ نکالنے والی تھیں، عشیہ نے اس الزام پہ کھا جانے والی نظروں سے مورے کو دیکھا تھا۔
"اس کا دوست تھا کوئی؟" عشیہ نے جان چھڑائی تھی۔
"اسامہ!" مورے فوراً چوکنا ہوئیں، عشیہ کا دل اسامہ کے نام پہ دھڑک اٹھا تھا، پھر سر جھٹک کر بولی تھی، جیسے ایک جان لیوا خیال سے جان چھڑائی ہو۔
"نہیں۔"
"تو پھر کون تھا، جس کی تیمارداری کرتا رہا، اتنی مرتبہ کہا ہے، سو دشمنوں میں گھرے ہو، ایسے ہر ایک پہ بھروسہ نہ کر لیا کرو، پر میری سنتا کون ہے۔" وہ عادتاً جلانے لگی تھیں، ہیام کے لئے وہ اتنی

ہی و اہی تھیں، عشیہ نے سر پکڑ لیا، اب وہ خود کو کوس رہی تھی، آخر کیوں عمکیہ کے سامنے نام لے بیٹھی۔

"اب ماں کو کھپاتی رہنا، بتانا مت تا کہ مجھے چین آ جائے۔"

"کوئی اجنبی تھا، میں نہیں جانتی۔" عشیہ کو ایک مرتبہ پھر لینے کے دینے پڑ گئے تھے، دراصل وہ خود بھی الجھی الجھی سی تھی، اسامہ نے واپس جا کر کوئی رابطہ نہیں کیا تھا، اوپر سے ہیام کی کچھ دیر پہلے خفیہ کال آئی تھی، اس نے پوری بات تو نہیں بتائی تھی، لیکن جتنا بتایا تھا، وہ اس کے حواس اڑانے کے لئے کافی تھا، ہیام نے اتنا بڑا قدم اٹھا لیا تھا؟ کیوں؟ کیسے؟ کس طرح؟ وہ ایک ایک سوال پہ چلا رہی تھی اور دوسری طرف وہ منتیں کرتا نہ تھک رہا تھا۔

"مورے کو بھنک نہ پڑنے دینا، میں ساری بات آ کر تمہیں بتاؤں گا، اب تم ہو سب کچھ صیغہ راز میں رکھنے والی، کسی کو کانوں کان نہ پتا چلے۔"

"تو کیا کہہ کر تعارف کراؤ گے، جسے ساتھ لا رہے ہو؟ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی ہیام۔" عشیہ رو دینے کو تھی۔

"کہانا، آ کر بتاتا ہوں، یہاں یہ سچویشن ایسی بن چکی تھی، میں نہ ہوتا تو کوئی اور ہوتا اور اگر کوئی اور ہوتا جو نشرہ کا ہم سفر بن جاتا تو پھر جان لو کہ تمہارا بھائی عمر بھر کسی اور کو اپنا ہم سفر نہ بنا سکتا تھا۔" ہیام کے لہجے کی گہرائی اور الفاظ نے عشیہ کو تھرا کر رکھ دیا تھا، تو معاملہ یہاں تک پہنچا ہوا تھا اور وہ سب بے خبر تھے، ہیام اندر ہی اندر کیسا گھنا نکلا، ہوا تک نہ لگنے دی تھی۔

اور اب عشیہ سر تھام کر بیٹھی تھی۔

ہیام اس لڑکی کو اپنے ساتھ لا رہا تھا، یعنی ایک تباہی کو اٹھا کر لا رہا تھا، وہ لڑکی جو اس کے نکاح میں تھی، جسے اپنی بیوی بنا کر لا رہا تھا، اسے یہاں کون قبول کرنے والا تھا؟ کیا مورے؟ کیا علیہ اور عروفہ؟ اس کا دماغ چکرانے لگا تھا۔

عشیہ اس قیامت کو جانتی تھی جو کچھ ہی گھنٹوں کے بعد ہر شے کو ہلا ڈالتی۔

اسے یقین تھا مورے، علیہ اور عروفہ آنے والی لڑکی کا کیا حشر کرنے والی تھیں، وہ اسے کیا قبول کرتیں؟ وہ تو اسے گھر میں داخل ہی نہ ہونے دیتیں۔

بھلا عمکیہ اور عشیہ اس کی کہاں تک ڈھال بنتیں؟

اور ہیام نے بے سوچے سمجھے اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا تھا؟ اب اس میں کیا شک و شبہات تھے، ہیام کا دماغ محبت نامی کیڑے نے خراب کر رکھا تھا، تبھی تو اسے اتنی بلائیں دکھائی نہ دی تھیں، جن سے نپٹنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔

تو کیا نشرہ میں اتنا حوصلہ تھا کیا؟

عشیہ کا دماغ پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا، اوپر سے مورے کی دہائیاں۔

"اب اپنے کس عاشق کے مراقبے میں گم ہو گئی ہے، بتاتی کیوں نہیں؟ ہیام کس اجنبی کے ساتھ تھا؟ کوئی دشمن نکل آیا تو؟" وہ اس کے سر پہ کھڑی چلا رہی تھیں، عشیہ نے اپنا سر تھام لیا تھا۔

"دشمنوں نے ہیام سے کیا لینا ہے؟ اور پھر ہیام کا کوئی دشمن کیوں ہونے لگا؟ ہیام کے نام

کون سے رقبے اور مربعے لگے ہوئے ہیں۔" وہ جل کر پھنکاری تھی۔
"ارے ان حرام زادوں کا کیا پتہ، میرے بچے کا سراغ لگاتے پھر رہے ہوں۔" مورے نے سینے پہ ہاتھ مار کر اپنے وہم کو باہر نکالا تھا۔
"کیوں؟ ان حرام زادوں نے ہیام کو اپنی جائیداد میں حصہ دار بنانا ہے جو، اس کا سراغ لگاتے پھریں گے؟" عشیہ نے چیخ کر جواب دیا تھا، جیسی اس میں بھی نہیں تھی، مورے کی بیٹی جو تھی۔
"ہم لعنت ڈالیں ان کی جائیداد پہ، میرا بچہ ان کے سائے سے بھی محفوظ رہے۔" مورے نے دہل کر کہا تھا۔
"بس دعا کیا کریں، وہم نہ پالیں، وہ لوگ ہیام کے قریب بھی نہیں آئے گئیں، ہیام کو ڈھونڈا تو اسے آدھی جائیداد میں حصہ بھی دینا پڑے گا۔" عشیہ کا اطمینان قابل دید تھا، مورے کو کچھ دیر کے لئے تسلی ہو گئی تھی، آدھا گھنٹہ سکون سے گزار رہی تھا، جب ان کو پھر سے اچانک یاد آ گیا تھا۔
"پنڈی میں کس کی تیمارداری کر رہا تھا؟" ان کے دماغ کی سوئی وہیں کہیں اٹک گئی تھی، اس کا دل چاہا، وہ اپنا سر کسی شے سے ٹکرا دے، مورے کو بھگتنا کوئی آسان تھا؟ عشیہ کو دیکھے بنا ہی آنے والی لڑکی پہ ترس آنے لگا تھا۔
"دوست تھا ہیام کا۔" عشیہ نے جان چھڑوائی تھی۔
"پہلے تم نے کہا، اجنبی تھا کوئی، اب دوست ہو گیا؟ بہت جھوٹی لڑکی ہو تم۔" مورے چیخ گئی تھیں، عشیہ بھی بری طرح سے گڑبڑائی تھی، پھر اس نے سوچا، سچ بتا کر اپنی جان بخشی کروا ہی لے۔
"منگورہ کے نواحی جنگلات میں کوئی اسے گولیوں سے بھون کر چلا گیا تھا، ہیام کا وہاں سے گزر ہوا تو انسانیت کے ناطے اسے ہسپتال اٹھا کر لے گیا، بے چارے سے اتنا ہی گناہ ہوا تھا۔"
"کس نے اسے مارا؟" مورے چونک اٹھی تھی، وہ علاقے تو پرامن تھے، وہاں نسل در نسل دشمنیاں اب ختم ہو رہی تھیں، پھر وہ زخمی اجنبی کون تھا؟ جسے اپنے تئیں اس کے دشمن گولیوں سے اڑا کر جا چکے تھے۔
عشیہ کو مزید چھپانا بیکار ہی لگا تھا، اس نے سوچا، سچ بتا کر مورے کی اچھی طرح سے تسلی کروا دے حالانکہ وہ جانتی تھی، سچ سننے کے بعد مورے اس کا کیا حشر کرنے والی تھیں اور ہیام کا بھی۔
"وہ سرکاری افسر تھا، ڈپٹی سرویئر، بیال کے علاقے میں تعینات تھا، اس لڑکے پہ سردار کبیر بیٹو کی امریکن بچی کے بھگانے کا الزام لگا تھا، سنا آپ نے، اسے صندیر خان نے مروایا تھا، اب تسلی ہو گئی آپ کی۔" عشیہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولی تھی اور مورے اس حال میں تھیں کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔
کتنی دیر تک تو ان سے ایک لفظ بولا ہی نہیں گیا تھا، پھر جب بولیں تو پورا گھر ان کی گرج سے لرز رہا تھا اور عشیہ نے اپنے کان دبا رکھے تھے۔

"میرا بچہ انسانیت کے ناطے نیکیاں کرتا ہے، اپنے لئے دشمنی خرید رہا تھا، کیا ضرورت تھی، آگ میں ہاتھ ڈالنے کی، اس سرونٹ کی مدد کا مطلب ہے صندیر خان کے ساتھ بلاوجہ پنگا لینا، میں اس ہیام کو کہاں تک ان ظالموں سے بچاؤں؟ اوئی ماں! اس ہیام نے کیا کر دیا، اب صندیر خان تو خاموش نہیں بیٹھے گا۔" مورے سینہ پیٹتی غم سے نڈھال تھیں۔

"آپ کو واویلا کرنے کی عادت ہے مورے! ہیام نے کوئی گناہ نہیں کیا، ایک مرتے ہوئے انسان کی جان بچائی ہے، آپ اس کی نیکی کو برباد نہ کریں۔" عشیہ کے الفاظ انہیں برہم کر گئے تھے۔

"اس نیکی کے بدلے میں وہ دشمنوں کے نرغے میں پھنس جائے گا، ہائے میرا معصوم بچہ۔" مورے کی جان پہ بن آئی تھی، عشیہ نے سر تھام لیا۔

"وہ صندیر خان سے ڈرتا نہیں اور ڈرے کیوں؟ ڈریں تو وہ جنہوں نے حق مارے ہیں، اپنے سروں میں خاک ڈال کر قتل و غارت کی داستانیں رقم کی ہیں، ہمیں لاوارث کیا، بے گھر کیا، جب ان کو خوف نہیں، تو ہمیں کس بات کا ڈر؟" کچھ دیر بعد جب وہ بولی تو اس کی آواز سے پورا گھر گونج رہا تھا، مورے ہکا بکا رہ گئیں، دوسرے معنوں میں وہ لاجواب ہوئی تھیں، لیکن ان کے خدشات ایک ماں کے خدشات تھے، وہ اپنے دل کا کیا کرتیں؟

"جانے ہیام کس حال میں ہوگا؟" انہوں نے ایک لمبی آہ بھری تھی، عشیہ سر جھٹک کر چپل اڑسنے لگی۔

"اللہ کا بندہ ہے پورا، اللہ کے فضل سے اچھے حال میں ہوگا، نئی نئی شادی کا خمار چڑھا ہے، کمینہ نہ ہو تو، خود تو بچ جائے گا، مجھے مصیبت میں ڈال جائے گا۔" وہ زیرلب بڑبڑاتی باہر کی طرف بڑھی تھی، جہاں پہ دستک کی بار بار آواز آئی تھی۔

جانے دروازے کے دوسری جانب کون تھا؟

☆☆☆

بی جاناں کو اندازہ نہیں تھا صندیر خان نہ صرف ان کے فیصلے کو سراہے گا بلکہ شاہوار کے سر پہ شادی کا طبل بھی بجا دے گا۔

آج موسم بڑا خوشگوار تھا اور موسم کے ساتھ صندیر خان کا مزاج بھی بہت ہی خوشگوار تھا، کچھ دیر پہلے اس کے سیل فون پہ اسلام آباد سے ایک کال آئی تھی، تب سے لے کر اب تک وہ خاصا ریلیکس اور سرشار تھا، یعنی کہ شکار خود بخود جال میں پھنسنے کے لئے تیار تھا۔

کومے نے اسے فوری ملنے کے لئے بلایا تھا، چونکہ وہ صندیر خان تھا، اس لئے فوری طور پر حکم کی تعمیل کرنے سے گریزاں تھا، تاہم اسے ملنے کو اس کا اپنا دل ضرور ہمک رہا تھا یہ اور بات تھی کہ صندیر خان دل کے فیصلوں کو اتنی اہمیت نہیں دیتا تھا، کومے کے تصور نے اسے خاصا سرشار کر دیا تھا۔

وہ ایک خوبصورت کم عمر اور احمق سی لڑکی تھی، گو کہ صندیر خان کا مزاج اس سے مطابقت نہیں رکھتا تھا، پھر بھی اس لڑکی میں کچھ تو ایسا تھا جو صندیر خان کو اپنا اسیر کر رہا تھا۔

وہ اس سے ملاقات کے بعد کا سارا لائحہ عمل تیار کر چکا تھا، اسے کیا کرنا تھا؟ بلکہ امام کے ساتھ کیا کرنا تھا؟ یہ سب طے شدہ معاملہ تھا۔

اور ابھی وہ گوہر کے بارے میں سوچ رہا تھا جب شاہوار اس کے حکم نامے پہ تابعداری سے سر جھکاتا آ گیا، وہ اس کا بھائی تھا، عادتوں میں اس سے بہت مختلف، اس میں ضد نہیں تھی، تنگ مزاجی نہیں تھی، سب سے بڑی بات بغاوت نہیں تھی، یہ اس کی شخصیت کا مثبت پہلو تھا۔

صندیر خان کو اندازہ تھا، وہ شاہوار کو سباخانہ کے لئے رام کر لے گا، کیونکہ سباخانہ سے شاہوار کا رشتہ وہ از خود طے کر چکا تھا، اب انکار کی گنجائش باقی نہیں رہ سکتی تھی۔

شاہوار مودب سا کھڑا اب صندیر خان سے بلاوے کا متن جان رہا تھا اور جیسے جیسے صندیر خان بی جاناں اور اپنی خواہش اس کے گوش گزار کر رہا تھا، ویسے ویسے شاہوار کا رنگ اڑ رہا تھا۔

''خان! یہ ممکن نہیں۔'' اس نے تحمل سے ساری بات سن لی تھی اور دھیمے لہجے میں اپنا مدعا بھی بتا دیا، صندیر خان نے بھی بردباری کا مظاہرہ کیا تھا اور تحمل کے ساتھ انکار کی وجہ دریافت کی تھی۔

''ہوں، تو وہ لڑکی کہاں ہے؟ جسے تم پسند کرتے ہو؟''

شاہوار کو اندازہ نہیں تھا، وہ اتنی جلدی یہاں تک بھی پہنچ جائے گا، وہ کچھ دیر کے لئے گم صم ہو گیا تھا؟ وہ لڑکی کہاں تھی؟ اور اس میں کتنی دلچسپی رکھتی تھی؟ اس کے جذبات سو فیصد ایک طرفہ تھے، وہ اس لڑکی کے دل کا حال تو جانتا تک نہ تھا، ایک راہ چلتی یک طرفہ پسندیدگی؟ جس کا کوئی اور عنوان نہیں بن سکتا تھا، وہ صندیر خان جیسے پریکٹیکل بندے کے سامنے کسی افسانوی کہانی کو کیسے بیان کرتا؟

''وہ نجانے کہاں ہے؟'' شاہوار نے سر جھٹک دیا اور اس خیال سے پیچھا چھڑا لیا، وہ خود بھی ایک عملی انسان تھا، خوابوں خیالوں کو خود پہ کیسے سوار کر لیتا، پھر اگر عشیہ نہیں تھی تو سباخانہ بھی نہیں تھی، اپنی یہ مغرور سی کزن اسے کبھی پسند نہیں تھی، وہ سباخانہ سے شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، کم از کم سباخانہ سے تو کبھی نہیں، اس نے دوٹوک الفاظ میں انکار کر دیا تھا، صندیر خان پرسوچ انداز میں اسے دیکھتا رہا، کچھ سوچتا رہا۔

''سوچ لو شاہوار! یہ نکاح تو تمہیں کرنا ہوگا۔''

''مجھے ہی کیوں؟'' وہ منہ پھاڑ کر یہ نہ کہہ سکا کہ تم خود کر لو۔

''کیونکہ تمہارا جوڑ سباخانہ سے بنتا ہے اور بی جاناں کی خواہش بھی ہے۔'' صندیر خان نے وجہ بیان کی تھی۔

''میں اتنی سی بات کے لئے اپنی زندگی قربان نہیں کر سکتا۔'' وہ اپنی بات پہ زور دے کر بولا تھا، اس کی آواز تھوڑی سی بلند تھی، تبھی قریب سے خوبانیاں اٹھا کر گزرتی پری گل لمحہ بھر کے لئے ٹھٹک گئی تھی، پھر ذرا سی اوٹ میں ہو کر اس نے کان لگاتے ہوئے کچھ سنا تھا۔

''تم اس لڑکی کے لئے سباخانہ کو ریجیکٹ کر رہے ہو؟'' صندیر خان کا لہجہ نرم تھا اور انداز بڑا چبھتا ہوا، شاہوار چونک گیا تھا۔

''اس کا یہاں کیا ذکر؟ وہ باب بند ہے پلیز، اس بات کا ذکر مت کرو۔'' شاہوار نے خفگی سے

کہا تھا۔

''ہوں، تو پھر اپنے نکاح کے لئے تیار ہو جاؤ۔'' صندیر خان کا وہی چبھتا ہوا فیصلہ کن انداز تھا۔

''یہ ممکن نہیں؟'' شاہ وار نے سر جھکا کر کہا۔

''تم جانتے ہو، میں جو ناممکن ہو، اسے ممکن بنا لیتا ہوں۔'' وہ نرمی سے مسکرایا اور آگے بڑھ گیا تھا، جبکہ شاہوار بے بسی کے احساس تلے دب کر اسے دیکھتا رہا، کیا وہ صندیر خان کے فیصلے سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھ سکتا تھا؟

☆☆☆

اسے لکڑی کے آرے پہ بھاؤ تاؤ کرتے، لکڑی، خچر پہ لدواتے اور گھر کا پتہ سمجھاتے اتنی دیر ہو چکی تھی کہ سورج اس وقت غروب ہو رہا تھا، اس نے جلدی سے سبزی منڈی کا رخ کیا، تھیلا بھرا اور تیزی سے گھر کی طرف بڑھنے لگی، اسی پل ستاروں کی قبا آن کی آن میں سمٹ گئی تھی، جانے کہاں سے کالے بادلوں کی فوج حملہ آور ہوئی، پل تک ننھی ننھی بوندیں ٹپکنے لگی تھیں۔

جس تیزی سے وہ پل عبور کر رہی تھی، اسی تیزی سے بارش کی رفتار بھی بڑھ رہی تھی، اس نے سوچا کہ وہ گھر جانے کے لئے کوئی شارٹ کٹ استعمال کرے، گھر کو دو رستے نکلتے تھے، ایک طویل تھا اور بیچ میں ہوٹل روز گل پڑتا تھا، دوسرا رستہ بہت مختصر تھا اور مسئلہ صرف یہ تھا کہ وہاں سے گزرتے ہوئے اس کے دل میں انجانا سا ڈر بیٹھ گیا تھا، کچھ مورے نے بھی سختی سے منع کیا تھا، ہٹ والے رستے کی طرف سے بھی مت آنا۔

اور اب تیز طوفان کے خوف سے عشیہ نے اسی رستے کا انتخاب کر لیا تھا، پل کراس کرنے کے بعد اب وہ اس نالے کے کنارے پہ چل رہی تھی، جو ہٹ کے سامنے سے گزرتا تھا۔

یہ شاہوار ہوکا ہٹ تھا اور شاہوار کو اپنی یادداشت کے خانے سے نکالنا آسان نہیں تھا، وہ خوش شکل نوجوان جس نے اس کی مدد کی تھی، اسے اپنی جیپ میں گھر تک ڈراپ بھی کیا تھا اور اس بات پہ گھر میں کتنا فساد برپا ہوا تھا۔

مورے ایک قیامت اٹھا لائی تھیں، وجہ کیا تھی؟ کیونکہ شاہوار، ہو خاندان کا ایک فرد تھا اور اس خاندان کی اگلی پچھلی نسلوں سے انہیں نفرت تھی، اس کے قدم لمحہ بھر کے لئے تھم سے گئے تھے، یہ ایک عالیشان عمارت تھی، لیکن، ہو محل سے زیادہ عالیشان نہ تھی۔

عشیہ کو بچپن میں ہو محل دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا، وہ یہاں کے لئے بہت مچلتی تھی، اسے اپنے بچپن کی ایک دو سہیلیاں یاد آتیں، کہیں یادداشت کے خانے میں دو پیاری پیاری سی لڑکیاں کہیں محفوظ تھیں، ان کے نام نجانے کیا تھے؟ ذہن سے نکل گئے۔

گھر میں ہو محل والوں کا ذکر بھی حرام تھا، سو بھی ان لوگوں کی بات تک نہ ہوتی تھی، وہ قصہ ماضی تھا، جو گرد آلود ہو گیا تھا اور اسی گرد آلود قصے سے خاک جھاڑ نے کو نجانے کیوں عشیہ کا دل مچل اٹھا۔

وہ رکی اور ٹھہر گئی تھی اس کے قدم آگے بڑھنے سے انکاری ہو چکے تھے، جانے کون سی قوت

تھی، جس نے عشیہ کو روک لیا تھا، وہ عجیب و غریب احساسات کا شکار ہو گئی۔
یہ محل نما گھر صرف ان لوگوں کی ملکیت نہ تھے، ان گھروں میں رہنے کا ان سب کا بھی اتنا ہی حق تھا، لیکن ہوٹل کے بے رحم لوگوں نے انہیں گھر بدر کر دیا، لاوارث کر دیا، آٹے آنے کا محتاج کر دیا، وہ اپنے چھلنی ہاتھوں کو دیکھنے لگی تھی۔
ان ہاتھوں نے بہت محنت کی تھی، بہت سال اس نے لفافے بنائے تھے، کتابیں جلد کی تھیں اور خوبانیاں ٹوکروں میں اٹھا اٹھا کر بیچی تھیں، ان کے حالات بہت خراب تھے، ان کا ذریعہ معاش کوئی نہ تھا۔
مورے ننھیال، ددھیال سے چھپ کر ادھر پناہ گزین تھیں، انہوں نے کبھی نانا سے بھی مدد نہ لی، عشیہ جب چھوٹی تھی تو بہت ذفعہ نانا کا پوچھتی تھی، تب مورے اونچی آواز میں رونے لگتیں۔
''وہ زندہ ہوتے تو ہمیں در در کے دھکے نہ کھانا پڑتے۔'' تو عشیہ کو تب سے ہی احساس ہو گیا تھا، وہ بھری دنیا میں اکیلے تھے اور ان کے پاس مرد نام پہ فخر کرنے کے لئے ایک ناسمجھ سا معصوم بچہ تھا۔
ان کی مورے کا قیمتی سرمایہ، جسے ہر سرد و گرم سے بچا بچا کر مورے نے اتنا جوان کیا تھا، ہیام کی نوکری تک ان سب بہنوں نے بوے کشٹ اٹھائے تھے، عمکیہ کپڑے سلائی کرتی تھی اور مورے قالین بناتی تھیں۔
انہوں نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر ہیام کو ڈاکٹر بنایا تھا، وہ ہیام جس کا ان جاگیروں پہ اتنا ہی حق تھا، وہ ہیام جو پبلک ٹرانسپورٹ پہ دھکے کھاتا، دس دس ویگنیں بدل کر گھر پہنچتا تھا اور یہ لوگ اتنی لمبی لمبی گاڑیوں میں عیش کرتے، سفر کرتے اور موجیں اڑاتے تھے، تو کیا یہ ساری نعمتیں ان لوگوں کی میراث تھیں، ہرگز نہیں۔
وہ سب لوگ بھی ہر چیز میں برابر کے حصے دار تھے، تو پھر اتنے محروم کیوں زندگی گزار رہے تھے؟ یہ ساری محرومیاں ان کے حصے میں کیوں آئی تھیں؟ یہ ذلت بھری زندگی بس ان لوگوں کا مقدر کیوں تھی؟ یہ ساری آسائشات ان لوگوں کے حصے میں کیوں نہیں آئی تھیں؟
وہ بارش میں بھیگتی رہی اور سوچتی رہی، اس کے آنسو بارش کے قطروں میں مل کر ایک دریا کی صورت اختیار کر رہے تھے اور آج دریا میں بھی طغیانی آ گئی تھی اور جب طغیانی آتی ہے تو پھر بندھ باندھنا آسان نہیں ہوتا، اس کی سوچوں نے آج ایک نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔
اسے اپنے حق کے لئے آواز اٹھانی تھی، اسے اپنے حصے کے حصول کی ایک نئی جنگ لڑنا تھی، اس طوفانی رات نے ایک نئی عشیہ کو جنم دیا تھا، وہ ایک نیا روپ لے کر چمکتے سورج کا سامنا کرنا چاہتی تھی، گو کہ یہ بہت ہی کٹھن تھا، بہت ہی مشکل تھا، مگر ناممکن نہیں تھا، فیصلہ کرنا تھا مگر ہو گیا۔
عشیہ نے اپنے تھکن زدہ پیروں کو جوتوں سے آزاد کر دیا اور وہیں، پتھر پہ گیٹ کی نشاندہی کرنے والے رستے پہ بیٹھ گئی، کہیں بجلی کڑکتی تو ہٹ کی سفید عمارت صاف دکھائی دیتی تھی۔
اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا، وہ کیا کرنا چاہتی تھی؟ وہ بس اس عمارت کو دیکھ دیکھ کر اپنی محرومیاں کو ازسرنو تازہ کر رہی تھی، تاکہ اس کے حوصلے نہ تھکنے کے لئے ایک نئے سفر پہ نکل جائیں،

جانے کتنا وقت گزر گیا تھا۔
معاً ایک جیپ کی تیز ہیڈ لائٹ نے اسے چونکا ڈالا تھا، جیپ اس کے قریب آرکی تھی، پھر کوئی تیزی سے باہر نکلا اور عشیہ کی طرف آیا، عشیہ کو ایک دم کرنٹ لگا تھا اور سارے خیالات کی مالا ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئی تھی، وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
اس کے سامنے شاہوار کھڑا تھا، وہ لمحہ بھر کے لئے فریز ہو گئی تھی اور کم وبیش شاہوار کی حالت بھی ایسی ہی تھی، وہ اسے دیکھ نہیں رہا تھا بلکہ وہ اسے حفظ کر رہا تھا، مبادا وہ نظر سے اوجھل نہ ہو جائے۔
وہ جو اس کا وہم تھی، ایک خیال تھی، ایک گمان تھی، اب سراپا حقیقت بن کر کھڑی تھی، جسے سارے رستے وہ سوچ سوچ کر خود کو شاد کر رہا تھا، وہ اچانک غیر متوقع اس کے سامنے کھڑی تھی، وہ بھی اتنے طوفان میں؟ شاہوار پریشان ہو گیا تھا اس طوفان میں عشیہ کا یہاں بیٹھنا اس کی عقل میں نہیں سما رہا تھا، اس نے تیزی سے عشیہ کا ہاتھ تھاما اور ہٹ کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا، اس حال میں کہ عشیہ اس کے ساتھ گھسٹتی جا رہی تھی۔
ہٹ کے رہائشی حصے میں آ کر شاہوار نے عشیہ کی سمت دیکھا، روشنی میں اس کا چہرہ واضح تھا اور وہ برستی بارش سے محفوظ ہو چکی تھی۔
شاہوار اسے دیکھتا رہا، عشیہ نے شاہوار کے ہاتھ پکڑنے پہ کوئی مزاحمت نہیں کی تھی، وہ کسی سنگی مجسمے کی طرح ساکت وصامت تھی، گم صم بے جان۔
شاہوار متفکر ہو گیا اور پھر تیزی سے انگیٹھی کی طرف بڑھا، کوئلے دہکانے کے بعد اس نے دوبارہ عشیہ کا ہاتھ پکڑنے میں ہچکچاہٹ محسوس کی تھی، اس لئے نرمی سے کہا۔
''انگیٹھی کے پاس چلو، یہاں بہت سردی ہے اور تمہارے کپڑے بھی گیلے ہیں، کیا بیمار پڑنا چاہتی ہو؟ مجھ سے تیمارداری کروانے کی خواہش رکھتی ہو؟'' وہ بہت ہلکے پھلکے لہجے میں کہہ رہا تھا، جیسے وہ دونوں برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں اور روزانہ ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہوں۔
عشیہ کسی معمول کی طرح چلتی ہوئی انگیٹھی کے قریب بیٹھ گئی تھی، شاہوار کچھ دیر کے لئے منظر سے ہٹ گیا تھا، کافی دیر بعد جب وہ آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی، جس میں کافی کے دو مگ تھے اور وہ کپڑے بھی بدل چکا تھا، وہ عشیہ کے قریب ہی بیٹھ گیا اور کافی کا مگ اس نے تپائی پہ رکھ دیا تھا۔
''آج خدا سے میں نے جو مانگا، مجھے مل گیا، مجھے یقین نہیں آ رہا، تم سے اتنے عرصے بعد پھر ملاقات ہو جائے گی۔'' وہ اپنی بے پایاں خوشی کا اظہار کر رہا تھا، تب عشیہ کا ٹرانس بھی ٹوٹ گیا، وہ سنبھل کر چونک گئی تھی، پھر حیرت زدہ رہ گئی اور بعد میں اس کا دماغ ٹھکانے پہ آ گیا تھا۔
عشیہ نے سنبھل کر شاہوار کے پرجوش انداز کو ملاحظہ کیا، معاً اسے ایک احساس چھو کر گزرا تھا، اسے شاہوار کی چمکتی آنکھوں کا راز معلوم ہو گیا، اسے اندازہ ہی نہیں تھا، کچھ دیر پہلے جو کچھ وہ سوچ رہی تھی، وہ اس کے لئے اتنا آسان ہدف ثابت ہو سکتا تھا؟

وہ سوچتی رہی، سوچتی رہی، بہت آگے تک، بہت دور تک اور جیسے فیصلہ آسان سے آسان تر ہوتا چلا گیا تھا اور شاہوار بولتا رہا، بولتا رہا، جیسے آج نہ بولا، تو یہ قیمتی پل ہمیشہ کے لئے کھو جائے گا اور وہ عشیہ کو اپنا حال دل سنائے بغیر عمر بھر خسارے میں رہے گا۔

تو شاہوار نے اس قیمتی پل کو بچا لیا تھا، سنبھال لیا تھا، اس نے عشیہ سے اپنے خالص جذبوں کا اظہار کر دیا تھا اور پھر عشیہ نے بھلا کیا کیا؟

عشیہ نے شاہوار کے خالص جذبوں کی پذیرائی بخش دی تھی، اس نے یہ سب کرنا ہی تھا، اسے آگے بڑھنا ہی تھا، اس طوفانی بارش میں اتنے گھنٹے بھیگنے کے بعد عشیہ نے یہ انتہائی فیصلہ کر ہی لیا تھا۔

اسے محبت نہیں اپنا حق لینا تھا، سو اس نے اپنے حق کی خاطر محبت کو قربان کر دیا تھا، وہ محبت جو اسے ہیام کے دوست سے نجانے کیوں ہو گئی تھی۔

اور محبت کا کیا ہے؟ محبت تو ایسے ہی ہو جاتی ہے، ضروری ہے کہ ہر محبت کو وصل بھی نصیب ہو؟ جب دل کے رستوں کو اور سمت میں موڑ ہی لیا تھا تو پھر سود و زیاں کا کیا حساب کرنا؟ صد شکر کہ وہ اسامہ کی چاہت میں بہت دور نکلنے سے گریزاں تھی ورنہ انتقام حق اور عزت کے حصول کا یہ فیصلہ اتنا آسان ہرگز نہ ہوتا۔

☆☆☆

مورے کے دل کو پنکھ لگے تھے۔

''لڑکی ابھی تک آئی نہیں، سامان تو کب کا پہنچ گیا۔''

وہ تخت پر بیٹھی اکیلی ہول رہی تھیں، عروفہ ان کی پریشانی سے قطع نظر میگزین دیکھنے میں مصروف تھی، مورے کو عروفہ کی بے نیازی کھولنے پہ مجبور کر رہی تھی۔

''تمہیں کچھ احساس ہے یا نہیں؟'' عروفہ کو اپنے کام میں مگن دیکھ کر مورے نے چلا کر کہا تھا، عروفہ کی پیشانی شکنوں سے بھر گئی تھی۔

''تو میں احساس کر کے کیا کروں؟ وہ کرتی ہے میرا احساس۔'' عروفہ نے چیخ کر میگزین پٹخ دیا تھا۔

''ملنے گئی ہوگی اپنے کسی ہوتے سوتے کو۔'' اس کا نفرت سے انگ انگ سلگ رہا تھا، مورے کو بڑا ہی غصہ آیا۔

''زبان سنبھال کر بولا کر، تیری بہن ایسی نہیں ہے۔'' مورے ہاتھ مل رہی تھی اور عروفہ دم بخود مورے اور عشیہ کی سائیڈ لیں، اسے بالکل یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

''تو کیسی ہے؟'' وہ بد تمیزی سے بولی۔

''کم از کم تیرے جیسی نہیں ہے، بد بخت، ماں کی پریشانی کا کوئی احساس نہیں۔'' مورے غیض بھرے لہجے میں بولتے بولتے سسکنے لگی تھیں، ان کا مارے پریشانی کے برا حال تھا، عشیہ غیر ذمہ دار نہیں تھی، چاہے وہ زبان سے اقرار نہ کرتیں، پر دل سے تسلیم ضرور کرتی تھیں۔

''تو کیا کروں، اس کی تلاش میں نکل جاؤں؟'' وہ زہر خند ہوئی تھی۔

"تو نے کیا کرنا ہے، بس بیٹھی بکواس کرتی رہ، اور کس کام کی تو۔" مورے نے تلخی سے کہا تھا۔

"آج کل آپ کے دل پہ چڑھ بیٹھی ہے عشیہ، خیر تو ہے مورے۔" عروفہ کے لہجے میں جلن ہی جلن تھی۔

"شرم کھا عروفہ! میرا دماغ نہ چاٹ، جانوروں کی طرح لگی رہتی ہے وہ سارے گھر بار کے کام کرنے کے، اس کے باوجود کسی کو احساس تک نہیں۔" مورے کا دل بھینچ سا گیا، شاید اس کی قربانیوں کا احساس ہونے لگا تھا۔

"صد شکر کہ آپ نے تسلیم کیا، کچھ زیادہ ہی فرشتہ بن چکی ہے وہ۔" وہ حقارت سے بولی تھی، عشیہ کی تعریف اسے کہاں ہضم ہوتی تھی اور جب سے عمکیہ کی شادی ہوئی تھی، مورے عشیہ کے کچھ زیادہ ہی قریب ہو رہی تھیں، جو کہ عروفہ کو گوارا نہیں تھا۔

"میں کہتی ہوں منہ بند کر، مجھے وظیفہ پڑھنے دے۔" مورے تسبیح ہاتھ میں لے کر بیٹھ گئیں، باہر طوفان تھا اور ان کا دل سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا، جوان بیٹی کی ماں تھیں، کیسے نہ گھبراتیں، عشیہ نے بھی اتنی دیر نہیں کی تھی، جانے کیا مسئلہ ہوا تھا؟ وہ غم نہ کرتیں تو اور کیا کرتیں، اوپر سے عروفہ ان کی فکر کو اور بڑھا رہی تھی۔

"وہیں ہوگی، لکھوالیں مجھ سے، شاہوار کے ساتھ۔" اس دفعہ عروفہ نے آواز مدہم رکھی تھی، ورنہ مورے سے کچھ بعید نہ تھا، جوتا اٹھا کر دے مارتیں۔

"روزگل سے فون پہ پوچھو، اس کا ادھار چکانے تو نہیں گئی؟ طوفان تیز دیکھ کر بیٹھ گئی ہوگی۔" مورے کا دھیان بٹا تو عروفہ سستی ہوئی فون تک آئی، طوفانی موسم میں ان کا فون اکثر خراب ہو جاتا تھا، اس کے باوجود اس نے جھوٹ بول کر مورے کو اور بھی ہولا یا تھا۔

"ادھر نہیں ہے۔"

"تو پھر کدھر ہے۔" مورے کی جان پہ بن آئی تھی، معاً گیٹ پہ کچھ کھٹکا سا ہوا، جیسے کسی جیپ کے ٹائر چرچرائے ہوں، کچھ ہی دیر بعد وہ تھیلا اٹھائے اندر آتی دکھائی دی تھی، مورے کی جیسے جان میں جان آگئی تھی اور عروفہ کے چہرے پہ طنز پھیل چکا تھا۔

"کس کے ساتھ آئی ہو؟" عروفہ نے جان بوجھ کر بلند آواز میں پوچھا تھا، وظیفہ پورا کرتی مورے بھی چونک گئی تھیں، عشیہ نے چادر اتار کر کھک پہ ٹانگی، تھیلا کھول کر سبزیاں میز پہ دھریں اور بڑے ہی اطمینان کے ساتھ عروفہ کے سر پہ دھماکہ کیا تھا۔

"شاہوار کے ساتھ۔"

"تم شاہوار کے ساتھ آئی ہو؟ وہی ہٹ والا شاہوار۔" عروفہ کی زبان لڑکھڑا گئی تھی۔

"ہاں وہی۔" عشیہ کا اطمینان قابل دید تھا۔

"وہ تم پہ اتنا مہربان کیوں ہے؟" عروفہ نے جلن سے پر لہجے میں پوچھا تھا، ان کی آوازیں باہر تک آرہی تھیں، مورے کے کان بھی ادھر ہی تھے، لاشعوری طور پر وہ عشیہ کا جواب سننے کے لئے رک گئیں اور تسبیح کا دانہ بھی اٹک گیا تھا۔

''اس لئے کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔'' عشیہ نے پتھریلے لہجے میں بہت عام روزمرہ کے معمول کی طرح عروفہ کو بتایا اور تیزی سے سبزیاں دھونے میں مصروف ہو گئی تھی، اس حال میں کہ عروفہ کا سانس تک اٹک چکا تھا، جبکہ مورے کے ہاتھ سے تسبیح گر چکی تھی، یہ انکشاف ہی ایسا تھا۔

☆☆☆

پری گل کے ہلکے پیٹ میں اتنی بڑی بات ٹھہر جاتی تو یہ بڑی حیرانگی کا معاملہ ہو جاتا، اس نے جو کچھ سنا، من وعن حمت کو بتا دیا تھا، پری گل کا حمت سے زیادہ جوڑ بنتا تھا، سباخانہ موڈ کے تابع رہتی تھی، سو پری گل حمت سے زیادہ قریب تھی، حمت نے سنا اور حیران رہ گئی۔

''یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے، شاہوار لالا کتنے عالیشان ہیں اور بہت نائس بھی، سباخانہ تو بڑی قسمت والی نکلی۔'' حمت کو بے ساختہ خوشی نے گھیرا تھا۔

''پر ایک ناخوشی کی بات بھی ہے۔'' پری گل نے کچھ دیر بعد ہونٹ لٹکا کر کہا تھا۔

''کیا مطلب؟'' حمت کو فکر ہوئی۔

''وعدہ کرو بی بی، سباخانہ کو نہیں بتائے گا؟'' پری گل کو اب وعدوں کی پڑ گئی تھی، جبکہ حمت کو بات جاننے کی جلدی تھی۔

''ارے نہیں بتاؤں گی، بولو تو سہی؟''

''وہ شاہوار خاناں، بولے کہ ام نہیں شادی بنائے گا۔'' پری گل نے رازداری سے بتا ہی دیا تو حمت اچھل ہی پڑی تھی۔

''سباخانہ سے؟''

''تو اور کیا؟'' پری گل نے دھیمی آواز میں بتایا۔

''سباخانہ اتنی خوبصورت تو ہے، لالا نے کیوں انکار کیا؟'' حمت کو فطری سا دکھ ہوا، اگر ان کی شادی ہو جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔

''خان کو کوئی اور لڑکی پسند ہے، ام کو یہی سمجھ میں آیا۔'' پری گل نے مزید انکشاف کیا تھا، اب کہ حمت کا منہ ہی کھل گیا۔

''کیا واقعی؟ لالا کسی اور کو پسند کرتے ہیں؟ اس کا مطلب ہے، ہمارے گھر میں کہیں اور سے دلہن سج سنور کر آئے گی، پھر تو کتنا مزہ آئے گا نا۔'' حمت ایک اور تصور میں کھو سی گئی، کتنے سال ہو گئے تھے، ایک جمود بھری زندگی گزارتے ہوئے، یہ جمود اگر اس طرح سے ٹوٹ جاتا تو کتنا ہی اچھا ہوتا۔

اسے ہرگز یہ اندازہ نہیں تھا، یہ جمود جس انداز میں ٹوٹنے والا تھا، اس بات کا بنوگل کے مکینوں کو گمان تک نہ تھا۔

☆☆☆

اس کی زندگی کا یہ پہلا تکلیف دہ طویل ترین سفر تھا۔

وہ سارے رستے تشنگی آئی، ایک تو زندگی میں در آنے والا یہ اچانک موڑ، اوپر سے اپنوں کی فریب کاری، دھوکا، اور ریاکاری میں لپٹی محبت۔

وہ جب جب گزشتہ واقعات سوچ کر سسکاری بھرتی اور ناک سنڑکتی، فوراً ہی ایک گورا سا ہاتھ اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا، جس کے اوپر ٹشو نفاست سے رکھا ہوتا، آخر کار ہیام اس کے ناک سنڑکنے سے تنگ آگیا تھا۔

"تمہیں فلو ہے تو جوشاندہ پلاتا ہوں یار، تمہارے رونے سے میں بھی مشکوک ہو رہا ہوں، لوگ بھی شک بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں، ایک تو پٹھان ہوں، لوگ سمجھ رہے ہیں، تمہیں اغواء کر کے لے جا رہا ہوں۔" ہیام نے بڑی عاجزی سے کہا تھا، بس ہاتھ جوڑنے کی کسر رہ گئی تھی۔

تب نشرہ کو بھی جیسے اس پہ ترس سا آگیا تھا اور اسی وقت طویل ترین سفر کا اختتام بھی ہو گیا، یہ ایک بس اسٹاپ تھا، جہاں بس نے رک کر مسافر اتارے تھے، ہیام اور نشرہ بھی یہیں اتر گئے، یہ کوئی بڑا ہی خوبصورت علاقہ تھا، بہت حسین فطری مناظر سے سجا سنورا۔

نشرہ ہنی مون منانے تو نہیں آئی تھی، جو فطری مناظر سے لطف اندوز ہونے لگتی، اسے تو آگے کے حالات ہولائے دے رہے تھے، جب سے اس کے دماغ نے کام کرنا شروع کیا تھا تب سے اسے خوف کے مارے چکر آرہے تھے۔

ہیام کے گھر والوں کا سامنا کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا، وہ بہت خوفزدہ تھی اور ہیام انتہائی مطمئن تھا، اگر پریشان تھا بھی تو ظاہر نہیں کر رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد اس نے ہیام کی ہمراہی میں ایک طویل لکڑی کا پل عبور کیا اور بعد کا رستہ خوف کے پل صراط کی طرح طویل ہو گیا تھا۔

جب وہ ہیام کے چھوٹے سے مکان کا داخلی دروازہ عبور کر رہے تھے تب اسے ہیام کی ہلکی ہلکی بہت ہلکی آواز سنائی دی تھی۔

"دیکھو نشرہ! میری ماں بیمار عورت ہے، میں ایک دم ان کے سر پہ پہاڑ نہیں توڑ سکتا، تمہیں میری مجبوری کو سمجھنا ہو گا اور میری مجبوری کے ساتھ سمجھوتہ کرنا ہو گا۔" وہ تیز مگر مدہم آواز میں بولتا ہوا اس کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھتا رہا اور نشرہ نا سمجھی کے عالم میں اسے دیکھتی رہی اور اس کے ساتھ چلتی رہی۔

اسے ہیام کی مجبوری کی تب سمجھ نہیں آئی تھی، اسے ہیام کی مجبوری کی اب سمجھ آرہی تھی، جب وہ اپنی ماں سے اس کا تعارف کروا رہا تھا، تب نشرہ کی ساری خوش فہمیوں کے شیش محل ٹوٹ کر چکنا چور ہو گئے تھے، وہ ایک مجرم کی طرح سر جھکا کر کھڑی تھی اور ہیام اس کا تعارف کروا رہا تھا۔

"یہ میرے دوست کی کزن ہے، اس کے والدین حادثاتی موت کا شکار ہو چکے ہیں، جب تک کوئی انتظام نہیں ہو جاتا، یہ آپ کے ساتھ رہے گی۔" وہ نشرہ کو مورے کی عدالت میں چھوڑ کر تیزی سے اندر کی طرف بھاگ گیا تھا، جہاں پہ خونخوار تیور لئے عشیہ کھڑی تھی، ہیام نے تیزی سے دروازہ بند کیا اور پلنگ پر ڈھے گیا۔

(جاری ہے)

دھنک کے رنگ
سیما بنت عاصم

آفس سے لوٹ کر، آرام دہ صوفہ میں دھنسے، حسب معمول صبح کے اخبار کا مطالعہ کرتے، معیز اکرام نے شیشے کی سینٹر ٹیبل سے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی چینلز سرچنگ شروع کی تھی اور پھر اک جگہ نظر ٹھہر کر رہ گئی۔

میک اپ کی آرائشوں سے مبرا، صاف و شفاف چہرہ، غلافی آنکھیں، کشادہ ماتھا، بلا کی دلکشی و ملاحت تھی اس چہرے میں، کہ عرصہ سے ان کے اندر جمی کوئی بے حسی آہستہ آہستہ پگھلنے لگی تھی، پل بھر میں معیز اکرام کو محسوس ہوا وہ اب بھی شادی نہ کرنے کے فیصلے پر اب قائم نہ رہ سکیں گے، جیون ساتھی کے لئے بھی ان کا آئیڈیل تھا کہ بس جو دل کو لبھا جائے، جس پر تلاش ختم ہو جائے اور شخصیت وہ جو دل کو چھو جائے۔

اور نہ جانے کیا کیا، مگر شادی کے نام پر ٹھوکر کھا لینے کے بعد ان کے اندر، کسی سنگلاخ چٹان میں دراڑ پڑ گئی تھی، انہیں لگا کہ ان کی تلاش ختم ہو گئی اور یہ کہ اک عرصہ کے بعد جو باب انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے مقفل کر دیا تھا آہستہ آہستہ کھلتا چلا جا رہا ہے۔

اتنی ہی جاذبیت و کشش تھی، اس موہنی صورت اور دل کو چھو جانے والی شخصیت میں، وہ اک فیصلہ کر کے اٹھے تھے پھر اپنے کمرے میں جا کر کچھ دیر ریلیکس کے بعد انہوں نے فیس بک پر اسے جا پکڑا تھا، وہ دھیمے میٹھے مدھر لہجے میں کسی ادبی پروگرام کی کمپیئرنگ کرتی شاعرانہ ذوق رکھتی تھی، اگرچہ وہ اس معاملہ میں صاف کورے، چوپٹ تھے، جانے کہاں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے لبھا منصور، کو اک دل لبھاتا شعر بھیجا تھا اور پھر پہچان کے مراحل، وہ اپنے نام کی طرح انوکھی، ان چھوئی سی تھی، معیز اکرام نے جیسا سوچا اور چاہا تھا، ویسا ہی پایا، کہ اسے اپنا لینے کی خواہش ہر

گزرتے دن کے ساتھ، بڑھتی ہی چلی گئی، وہ انہیں عزیز تر ہوتی چلی گئی تھی۔

ہاں مگر اس پر اپنا ماضی مخفی رکھا تھا کہ اک نیا باب مکمل جاتا اور وہ اب لبھا منصور کو کھونے کا خسارہ کسی بھی طور اٹھا ہی نہ سکتے تھے۔

☆☆☆

ایک نہ دو چھ ماہ اس شناسائی پر محیط رہے اور اس چھ ماہ کا ہر پل انہیں یہ باور کراتا گیا تھا کہ لبھا اک مکمل لڑکی ہے اور جب معیز اکرام نے کینیڈا میں مقیم اپنے بڑے بھائی فیروز اکرام سے ذکر کیا تب فیروز اکرام نے نہایت سیدھے سبھاؤ عندیہ دیا تھا۔

"Its your life" مگر یاد رکھنا، اس بار ذرا سنبھل کر قدم اٹھانا۔"

اور معیز اکرام سے بڑھ کر کون جانتا تھا کہ پا کے کھو دینے کا خسارہ کیا ہوتا ہے، انہوں نے تابندہ کو جذبوں کی تمام تر شدت کے ساتھ چاہا تھا، مگر وہ خام تھی، سونے کا ملمع چڑھائے پیتل کی اک عام سی صورت، وہ محض اس کے ظاہری حسن و شخصیت کی بناء پر ہی تو دھوکا کھا گئے تھے اور معیز اکرام نے جانا کہ جیون ساتھی کے لئے خوبصورتی اور اسٹیٹس سے بھی بڑھ کر اک چیز جو کہ بہت لازم ہے، ہاں وہ ہے نیچر، وہ تابندہ کی نیچر نہ کھنگال سکے، شاید اسی لئے مات کھا گئے، ہاں مگر اس بار انہوں نے لبھا منصور کی نیچر کو ایک نہ دو چھ ماہ پرکھا تھا۔

ان کا پرپوزل لبھا منصور کے گھر والوں کے لئے قابل قبول ٹھہرا، آخر کو وہ بھی تو اک کامیاب لائق و فائق انسان تھے، خوبصورتی اسٹیٹس، تعلیم، عہدہ سب ہی کچھ تو حاصل تھا انہیں، پھر کیوں نہ اس نازک، کامنی بلا کی پر اعتماد لڑکی کے اہل ٹھہرتے۔

اور شادی سے ولیمہ تک کے کچھ روز اک عجیب سی بے یقینی انہیں گھیرے رہی، کیا وہ اک نظر میں دل کو چھو جانے والی لڑکی جو خود میں بلا کی کشش اور جاذبیت رکھتی تھی، اس تک جا پہنچنے کے مراحل اتنی آسانی سے طے ہو جائیں گے وہ شادی تک اک خواب آگیں کیفیت کے حصار میں رہے، لیہا ان کی ہونے جا رہی تھی، لیہا ان کی ہو جائے گی، کیا وہ اتنے ہی بخت آور ہیں؟

ماضی کے جھروکے سے کوئی چہرہ بار بار چھپ دکھاتا اور پھر اک گہری دبیز دھند کی اوٹ لے لیتا۔

☆☆☆

''میں نے کہا نا، شادی کے سب ڈریسز میرے پسند ہوں گے، صرف ڈریسز ہی نہیں سب کچھ۔''

''جی ہاں، کیونکہ پارٹنر بھی تو آپ کا من پسند ہے۔'' معیز اکرام ہنس دیتے کہ ان پلوں میں تو وہ آسمان کے تارے تک توڑ کر اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیتے۔

اور واقعی پھر اس نے طارق روڈ، ڈیفنس، کلفٹن کے بڑے مالز سے شادی کی اصل شاپنگ کی اور معیز اکرام نے جانچ لیا، وہ شاہ خرچ، موڈی اور جلد باز ہی نہیں اناڑی بھی ہے، بھاؤ تاؤ، کس چڑیا کا نام ہے، جانتی ہی نہ تھی، بس جس چیز پر دل آ جائے، اسے حاصل کر لو، خواہ بعد ازاں وہ چیز ایک کونے میں بڑی ناقدری پر سسکتی نظر آئے اور یہی معیز اکرام کے معاملہ میں بھی رہا، مگر انہیں جاننے میں دیر لگی، کہ اسے اپنے فیصلے، پسند ناپسند دوسروں پر ٹھونسنے کی عادت تھی، اس پر بھی بے اطمینانی، اک ہیوی بجٹ، شادی کی شاپنگ کے نام کر کے بھی ناآسودگی، وہ چاہتے کہ شادی کا جوڑا سرخ سہی، مگر ولیمہ کے لئے کوئی ہلکا رنگ ہو، مگر ناجی اسے ہلکے رنگوں سے چڑ تھی اور معیز اکرام کو تو وہ ہر روپ میں دلکش اور حسین ترین لگا کرتی تھی۔

مایوں اور مہندی کی تقریب مشترکہ تھی، پہلے گلاب اور گیندے کی لڑیوں سے سجے جھولے پر، برقی قمقموں سے سجے چھتنار کی چھاؤں میں بہار کی مہکتی اک شام، وہ دونوں نکاح کے بندھن میں بندھے تھے اور تابندہ پر بہار کی حسین رتوں کا تمام تر روپ اُمڈ آیا تھا، فضا میں اک نغمگی اور مہک سی اتر آئی تھی اور جب نکاح کے بعد، سب حاضرین باربی کیو اور ڈرنکس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

معیز اکرام نے نہایت چاہت سے تابندہ کا ہاتھ تھام کر اسے زندگی بھر کے ساتھ کا یقین بخشتے ہوئے گولڈ رنگ پہنا دی تھی۔

چھن سے کوئی سپنا ٹوٹا تھا اور معیز اکرام کے آس پاس کرچیاں ہی کرچیاں پھیلتی چلی گئی تھیں، وہی وقت تھا، وہی زندگی وہی ایجاب و قبول کے مرحلے اور وہی معیز اکرام، مگر سب کچھ یک لخت بدل گیا تھا۔

شاید اسی دل رباب کی حسین رفاقت کے سبب، جس کا ہر انداز نئی زندگی کی نوید تھا اور اسی شام معیز اکرام نے اسے کال کی تھی۔

''شادی کی شاپنگ ہم دونوں کی پسند سے ہو گی، نکاح کا جوڑا تم اپنی پسند سے لینا اور ولیمہ کے لئے ڈریس میرا سلیکٹڈ ہو گا۔''

''او کے ڈن۔'' وہ شاید ہر بات اتنی ہی آسانی سے مان جاتی تھی۔

''ارے وہ اتنی آسانی سے مان گئی۔'' معیز کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔

''تمہیں لائٹ کلرز پسند ہیں؟''

''ہاں کیونکہ تمہیں جو پسند ہیں۔'' وہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

دھیرے سے ہنسی۔
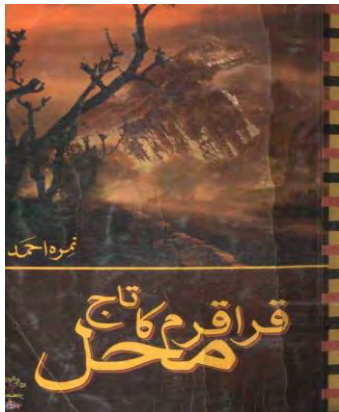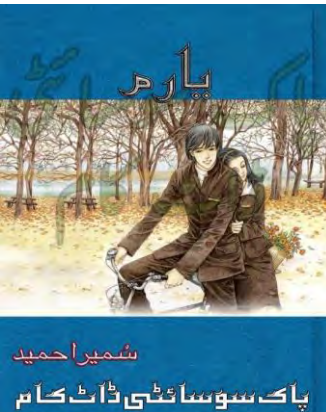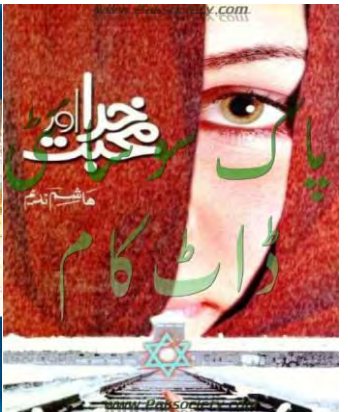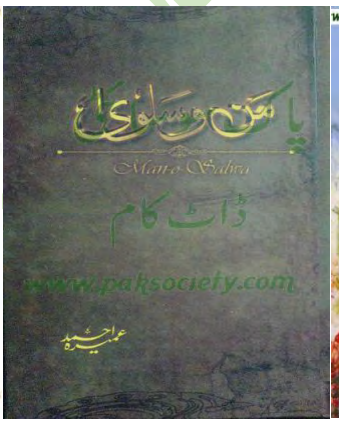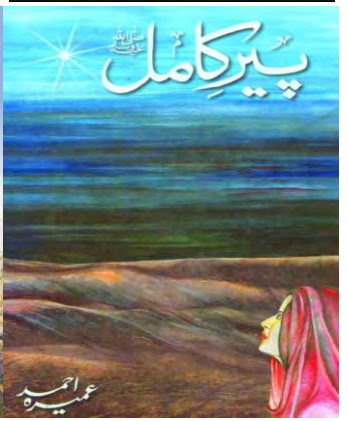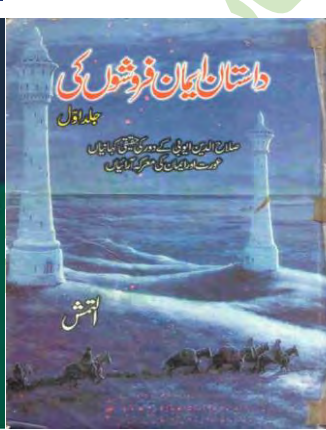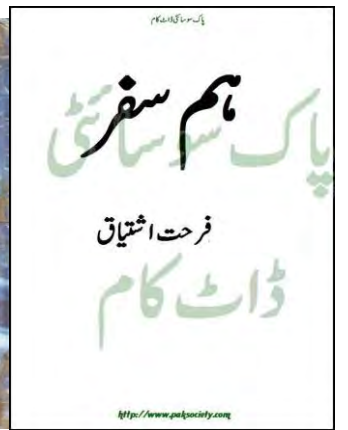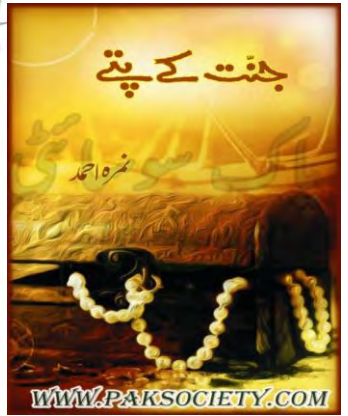
پھر واقعی شادی کی شاپنگ مشترکہ رہی، لیہا چیز کی مارکیٹ ویلیو جانچتی اور وہ بھاؤ تاؤ تک آنے ہی نہ دیتا۔

"بس تم پسند کرو، پے میں کروں گا۔" معیز اکرام نے اسے کہیں بولنے ہی نہ دیا تھا۔

"تم بول کر گڑ بڑ نہ کر دو کہیں۔" اور پھر وہ Snoop جا بیٹھتے، یا فٹ پاتھ پر چلتے سستی سی کون خریدتے۔

شاپنگ کے دوران، یونہی کئی دن لنچ ڈنر باہر چلے اور معیز اکرام کو جانے کیسے اپنی منوانے کی ضد چڑھ گئی تھی، اگرچہ دل کہتا، کہ ساری دنیا اٹھا کر لیہا منصور کے قدموں میں ڈھیر کر دے، وہ تھی ہی ایسی، جو رات دن نرم دھیمے لہجے میں بولتی سب سے بڑھ کر جلد ہار جانے والی، اگرچہ بحث ہر معاملہ میں چلتی۔

"مجھے بریانی پسند ہے، ودھ ڈرنکس، یا پھر باربی کیو۔" وہ اگر کہتی تو وہ جھٹ رد کر دیتے۔

"اوہ نو سی فوڈ جسٹ سی فوڈ، آئی لائیک اٹ۔"

"یار تمہیں ہیل کی کیا ضرورت، رکھو یہ سینڈل۔"

کبھی جو مسلسل تھکان سے دل اکتاتا، وہ ریلیکس کے موڈ میں ہوتے اور وہ کہتی۔

"آج سینما یا تھیٹر چلیں؟"

"نو لانگ ڈرائیو۔" جانے کیوں اسے جانچنے پر تل گئے تھے۔

اور اس کا وہی ہار جانے والا انداز اور لگا بندھا جملہ۔

"اوکے بابا۔" معیز اکرام کو اس کا ہارنا اپنی جیت سے بڑھ کر خوشی دیتا، وہ دھیمے لہجے میں گنگناتی شاعرانہ ذوق رکھتی اور معیز اسپورٹس کا دلدادہ انہی دنوں میں اس دن چھما چھم ساون برس پڑا اور لیہا کا رومانٹک موڈ امڈ کر آیا، معیز جانتے کہ وہ شاعرانہ نیچر رکھتی ہے اور برسات اسے دیوانہ کر دیتی ہے، مگر اس کے ایک جملے نے سب پر پانی پھیر دیا۔

"اوہ نو، آج ون ڈے کرکٹ میچ ہے، آج تو ہرگز نہیں۔" جیسے برسات کا یہ مدھ بھرا دن ہر روز اپنی رنگینوں سمیت دل و جاں کو معطر کرنے چلا آئے گا۔

لیہا منصور وہ جو کیٹس اور میکسم گورکی کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتی، جگنو کو مٹھی میں مقید کر لینے کی خواہاں کسی ڈریم لینڈ کے خواب دیکھنے والی، بہار کی حسین شاموں میں، واکنگ ٹریک پر اس کا ہاتھ تھام کر دور تک چلنے کی تمنائی، چاندنی راتوں اور بھیگی رتوں کا تمام تر فسوں خود میں سمو لینے کی دلدادہ۔

وہ جسے Abaya اور Proffacy کی مہک بھاتی تھی، رات کے دم توڑتے اندھیروں میں آغاز صبح کے اوقات میں چہل قدمی اس کا معمول تھی، دن کے اولین لمحات، جذبوں کی چہکار، بہت خاموشی سے اس کی پسند کے سانچے میں ڈھلتی چلی گئی تھی اور جب وہ دلہن کا حسین روپ سجائے، لبوں پر مدھر مسکراہٹ لیے معیز اکرام کے گلابوں سے مہکتے، بیڈروم کا اک حصہ بنی، تو ایک پل کو معیز اکرام کو اپنی قسمت پر یقین تھامنا دشوار ہو گیا، کتنا مکمل اور بھرپور حسن تھا، سرخ و سنہری امتزاج کے خوبصورت لہنگے میں اس کا ملکوتی روپ کھلا پڑ رہا تھا، لبوں کی مبہم سی مسکان اور گھنیری پلکوں کی اٹھتی گرتی چلمنیں اور اک بہار کی ڈھلتی بھیگتی رات کا فسوں اپنے عروج پر تھا، مگر معیز اکرام گھبرا اٹھے تھے، ماضی کے جھروکوں سے اک بازگشت ابھری تھی، ہاں

ایسا ہی تھا جب تابندہ نے ان سے کہا۔
"مجھے مردوں کی حاکمیت سے چڑ ہے، مجھے بدلنے کی کوشش نہ کرنا۔" ہاں وہ ایسی ہی تھی، سرد مگر سفاک۔
اور معیز نے لیہا منصور کی جانب اپنا مضبوط ہاتھ بڑھایا تھا۔
"آؤ لانگ ڈرائیو پر چلیں۔"
اٹھتی گرتی چلمنوں کا رقص مدھم ہوا اور سنہری آنکھوں میں اک تحیر سا اُمڈ آیا، مگر یہ بس اک پل کا عمل تھا، اگلے ہی پل سرخ گل بوٹوں سے سجے لانبے عنابی کیوٹیکس والے ہاتھ، اس کے ہاتھ میں تھے۔
نہ جانے کیوں وہ اپنے اندر اک عجیب سی گھٹن محسوس کرنے لگے تھے، ہزاروں خمار آلود لمحے، ماضی سے جڑے دل فگار پل ان کے آس پاس سسکنے لگے تھے، یکدم دل چاہا، اس کانچ سی گڑیا کا ہاتھ تھام کر دور کہیں بہت دور نکل جائے اور کچھ ہی دیر بعد وہ ان لمحات کی قید سے آزاد اپنی کرولا میں فرنٹ سیٹ پر براجمان لیہا منصور کا ہاتھ تھامے ساحل سمندر کی جانب گامزن تھے، تو لگا کہ زندگی اک بار پھر ان کے قدموں میں ہے، ان سسکتے وجود کو چھیدتے لمحات سے کہیں پرے، وجود کو چھیدتی، ماضی کے روزن سے چھب دکھاتی، تابندہ کی صورت سے دور۔
پھر ان خمار آلود لمحات کا تسلسل دھیرے دھیرے مدھم پڑا تھا۔
لیہا نے بہت جلد گھر کا چارج سنبھال لیا تھا، کل دو ہی تو نفوس تھے، فلیٹ میں، وہ ڈنر کر کے لوٹتے ان کا وقت قیمتی تھا، ان سے منسلک تمام رشتے، بہت جلد لوٹ کر اپنی زندگیوں میں مگن ہو گئے تھے، کہ ساری فیملی کینیڈا میں سیٹل تھی اور جس روز انہیں شادی کے بعد پہلی بار آفس جانا تھا، وہ وارڈ روب کے سامنے کھڑے تھے، بیڈ روم میں اس کی کھنکتی چوڑیوں کی جھنکار گونجی تو وہ پلٹے، تب تک وہ وارڈ روب کے پاس آ کر ان کی چیک دار بلیو شرٹ ان کے ہاتھ سے تھام چکی تھی۔
"لیکن مجھے..... اپنے کام خود کرنے کی عادت ہے۔"
"شادی سے پہلے نا، اب یہ کام میرے ہیں۔"
اور وہ کیسے بتاتے، ان کی زندگی میں اچانک در آنے والی ان کی پہلی محبت تابندہ رحیم کو شہزادیوں کی سی آن بان کے ساتھ زندگی گزارنے کی عادت تھی، سو وہ کبھی اس کی آن بان اور شان کا بت نہ توڑ سکے۔
معیز اکرام کے غسل و نماز سے فارغ ہونے تک وہ ناشتے کی ٹیبل سجا چکی تھی، ہاف بوائل انڈا، جوس، دو سلائس، سب ہی کچھ تو ان کا من پسند تھا، وہ بہت کم وقت میں ان کے معمولات پسند ناپسند جانچ گئی تھی۔
معیز اکرام کو بے ساختہ اس پر ڈھیروں ڈھیر پیار آ گیا تھا، تب وہ لیہا کے دہکتے عارض، ہلکے سے چھو کر کار کی چابیاں اٹھاتے دھڑا دھڑ سیڑھیاں اترتے چلے گئے تھے، زندگی اب سکھ کے مفہوم بھولنے لگی تھی اور تابندہ نے انہیں سکھ دیا ہی کب تھا، کہ وہ من چاہی زندگی کی قائل تھی، لائف پارٹنر کی خود میں مداخلت، یا تبدیلی اسے نا منظور تھی۔
☆☆☆
اس دن Sunday تھا اور تابندہ سنڈے کا پورا حق ادا کر کے ہی جاگی تھی، کہ اس دن معیز اکرام کی کھٹ پٹ اسے ڈسٹرب نہ کرتی، جو آفس جانے کی تیاری کی غرض سے، اس کی نیند

ٹوٹنے کی وجہ بنتی، وہ بیڈ روم کی لائٹس آف کر کے آنکھیں موندتی تھی اور معیز اکرام رات دیر تک اسپورٹس چینل دیکھتے اور آئے روز کی لے دے، پہ بیڈ روم کا ٹی وی لاؤنج میں منتقل ہو گیا تھا، وہ مزے سے سو بھی جاتی، وہ کی Seafood کے رسیا تھے اور سنڈے سرپرائز دینے کو، اس روز انہوں نے تابندہ کے جاگنے سے پہلے ہی کچن سنبھالا تھا فش کڑاہی، جھینگا پلاؤ، فرائی فش، سنڈے کو تابندہ کا ناشتہ لنچ ٹائم میں ہوتا اور لنچ ٹائم تک ٹیبل سج چکی تھی، معیز اکرام حسین کے منتظر تھے۔

"او گاڈ۔" تابندہ کی آنکھیں پھیلیں تو معیز اکرام کو اس کا تحیر بھایا۔

"مادام آپ کا کچن کنگ آج آپ کے لئے اپنی پسندیدہ ڈشز......" مگر تابندہ کی مخروطی انگلیاں اپنی ناک تک جا پہنچیں تھیں۔

"آئی ہیٹ اٹ، آئی ہیٹ سی فوڈ۔"

"او کے، مگر آج میری خوشی کے لئے، بلکہ میرے ہاتھوں سے۔" معیز دو قدم آگے بڑھے اور تابندہ چار قدم پیچھے چلی گئی۔

"نو...... ناٹ ایٹ آل، معیز کم از کم آپ کو مجھ سے پوچھنا تو تھا، اتنے دن ہو گئے ہماری شادی کو اور آپ کا اتنا بھی نہیں پتا؟"

معیز اکرام کے دل کو کچھ ہوا، مگر وہ اسی وقت بیگ کندھے پر ڈال کے اپنے میکے چلی گئی، جھینگے، مچھلی کی ناگوار مہک اس کی طبع نازک پہ گراں تھی اور وہ کسی کی خوشی و مرضی کے لئے خود پہ جبر کرنے کی قائل نہ تھی، نہ اپنی زندگی میں مداخلت پسند کرتی تھی، نہ جانے کتنا بار معیز اکرام کا دل ٹوٹا، کرچیاں دور دور تک پھیل گئیں اور اس نے پرواہی نہ کی ماضی کے لمحات بڑھ بڑھ کے انہیں ڈسنے لگے تھے۔

اور وہ جان بوجھ کر فراموش کر گئے کہ آج رات انہوں نے ایبا سے ڈنر کا وعدہ کیا ہوا ہے، وہ آفس سے لوٹے تو ایبا تیار تھی، مگر وہ صاف مکر گئے۔

"آج ڈنر ہرگز نہیں، میرا موڈ نہیں ہے، کچھ آرڈر کر دو یا بنا لو۔"

انہوں نے بیڈ پہ نیم دراز ہوتے ترچھی آنکھ سے اسے دیکھا، سیاہ بارڈر والی پنک ساڑی میں لپٹی سنہری بال پھیلائے، وہ ڈھلتی شام کا کوئی پر فسوں لمحہ نظر آ رہی تھی، مگر بنا کچھ کہے، چینج کر کے لوٹ آئی۔

"بلکہ چلو میں بھی کوکنگ میں تمہارا ہاتھ بٹاتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے، اگلے ہی پل مینو زیر غور تھا اور معیز کی پسند، افغانی پلاؤ، بریانی، کباب اس نے سب کچھ فریز کر رکھا تھا بس آنچ لگانے دم دینے کی دیر تھی۔

"سنو تمہیں Sea food کیسا لگتا ہے؟"

کچن میں اس کے قریب لگی تخت سے ٹیک لگائے نہ جانے کیوں وہ پوچھ بیٹھے۔

"مجھے پسند ہے۔" وہ الجھی، پھر سادگی سے اعتراف کیا۔

"کیونکہ مجھے پسند ہے، ہے نا۔" اس کے اثبات میں سر ہلانے پر وہ مسکرا دیئے تھے۔

"سنو تمہارے خیال میں شادی اک دوسرے کو بدلنے کا نام ہے، یا اک دوسرے کی پسند کے سانچے میں ڈھلنے کا؟"

اور ایبا منصور بلا کی سادہ مزاج، کس آسانی سے اعتراف کر گئی۔

"نہ اپنے آپ کو اور نہ ہی دوسرے کو بدلنے، بلکہ شادی تو ساتھ چلنے کا نام ہے، جب آپ کسی کو چاہو تو اس کا ساتھ ہی نہیں، اس کا پیار بھی مانگو، کیونکہ ساتھ چلنا ہی ہم سفری نہیں ساتھ دینا ہم سفری ہے۔"

اس نے کس دلکش پیرائے میں اپنے دل کی بات کہی تھی اور معیز اکرام اور وہ جو سمجھتے رہے تھے کہ ایہا نے اس شادی کی صرف اک سمجھوتا بنا لیا ہے، شاید وہ اسے اپنی منوا کر اس کی محبت کھو رہے ہیں۔

مگر وہ جو اک دھندلا سا نقش، دل و ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا، جو ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ چلتا اک سایہ کہیں سے اس کے سامنے کھڑا ہوتا۔

''تم معیز اکرام تم جیسے بیک ورڈ کنزرویٹو لوگ، کبھی عورت کو اس کا مقام اس کی حیثیت کے ساتھ منظور کر ہی نہیں سکتے، کیونکہ تم کمپلیکس کا شکار مرد، کسی جاہل گھریلو عورت کے ہی قابل ہوتے ہو۔'' یہ تابندہ کا آخری جملہ تھا۔

اور شادی کے اگلے ہی مہینے ان کا زبردست جھگڑا ہوا تھا، تابندہ بھاؤ تاؤ کے معاملے میں صفر تھی وہ ہر شے جانچ کر خریدتے کوالٹی کے مطابق ریٹ لگاتے، تابندہ کی پسند لاجواب تھی، لیکن وہ منہ مانگے داموں خرید ڈالتی اور اس نے کسی بھی بجٹ اور پلاننگ کے بغیر ماہانہ انجم ٹھکانے لگا دی تھی، نہایت اناڑی پن سے اور معیز اکرام کو وہ دن نہ بھولتا کہ، تابندہ نے اس دن اسے Cheep دقیانوسی، کنجوس اور جانے کیا کیا کہا تھا۔

سارا دن ان کی بات چیت بند رہی، مگر جو خسارہ ہو گیا، سو ہو گیا، معیز اکرام نے یہی سوچ کر پیش رفعت کی تھی وہ منہ سر لپیٹے اوندھی پڑی رہی۔

''کس شرط پر موڈ بحال ہو گا، آئس کریم، چاکلیٹ۔''

''تو ڈنر، شاپنگ۔'' وہ بچوں کی طرح ناز اٹھوا کر بمشکل مانی تھی۔

''اوہ گاڈ۔'' مگر انہیں مانتے ہی بن پڑی کہ اس کا ناخوشگوار موڈ، ناراضی وہ کہاں افورڈ کر سکتے تھے اور وہ تھی کہ ساتویں آسمان پر بیٹھی، بس ان کو خود کی انگلیوں پر نچانا چاہتی، بھلا ایسا بھی کبھی ہوا ہے اور معیز اکرام جیسے بولائٹ انسان کے لئے یہ کہاں ممکن تھا، جن کا خمیر محبت سے گندھا تھا، مگر وہ خود کے لئے بھی تو اتنی ہی محبت توجہ اور اپنائیت چاہتے تھے اور تابندہ رحیم وہ تو بس محبت کو وصولی کا نام دیتی، یہ ان سے بڑھ کر کون جانتا تھا کہ محبت نہ لفظوں میں مقید ہے، نہ رویوں میں، محبت تو بس اک لو دیتے احساس کا نام ہے جو ہر پل ہر سو انسان کے ساتھ رہتا، اسے اس کے اپنے پن کا یقین بخشتا ہے، دھڑکنوں کو بے ترتیب رکھتا وجود کو زندگی کا احساس دیتا، مگر تابندہ سے شادی کے بعد وہ خالی ہوتے جا رہے تھے۔

اور ایہا نے کتنی خوبصورت بات کہی تھی، ساتھ چلنا ہم سفری نہیں، ساتھ دینا ہم سفری ہے، معیز اکرام کا اندر ٹوٹ چکا تھا، ریزہ ریزہ ہو کر رہ گیا تھا، شاید وہ خود اپنے آپ کو بھی نہ سمیٹ پاتے کہ دل اب چاہنے سے بڑھ کر چاہے جانے کا طلب گار تھا۔

تابندہ کے بعد محبت کا باب اپنے ہاتھوں خود اپنی ہی ذات کے لئے بند کر کے وہ خود کو ہر جذبے سے بری کر چکے تھے، مگر اس نازک کانچ سی لڑکی کا اچانک زندگی میں در آنا اک نئی مہکتی صبح کی نوید تھا، وہ کیسے کہتے اور کیونکر کہتے، ان کے ہر پل کے ساتھ گزرے وقت سے جڑا اک رنج حوالہ ان کی زندگی کا کچھ چین چھیننے پہ تلا ہے، وہ خود اپنے آپ سے اختیار کھو بیٹھتے ہیں، احساس زیاں بڑھ کر انہیں ڈسنے لگتا، تو وہ اپنے آپ سے چھپتے پھرتے، تھک جاتے، ہار جاتے، تو اس

نازک کانچ سی لڑکی، لیہا معیز کی آغوش میں جا چھپتے اور نہ جانے کیسے ان کے اندر کا خوف ان کے لبوں پر آن رکتا۔

''سنو تم مجھے چھوڑ تو نہ جاؤ گی؟''

''معیز؟'' لیہا کی نظروں کا فسوں ہراس میں بدل جاتا۔

''وعدہ کرو کہ کبھی مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ گی۔''

لیہا کے نازک وجود کے گرد ان کی بانہوں کا حلقہ تنگ پڑ جاتا تو وہ اپنی مخروطی موی انگلیاں معیز اکرام کے الجھے گھنیرے بالوں میں پھنسا کر انہیں اپنی محبت کا تمام تر یقین بخش دیتی، وہ پل بھر کو شانت سے ہو جاتے، مگر گزرے وقت کے ذرات سجاتے سائے جانے کہاں کہاں سے نکل کر ان کے سامنے آن کھڑے ہوتے، انہوں نے اپنا ماضی اس صاف کھری اور شفاف لڑکی سے مخفی رکھ کر اسے Cheat کیا تھا، مگر اب اسے کھونا نہیں چاہتے تھے، مگر وہ تلخ حوالہ تابندہ بار بار ان کے سامنے آن کھڑا ہوتا، دل و ذہن کا بوجھ بن کر ان کے وجود سے لپٹ کر رہ گیا تھا، وہ لاکھ دامن بچاتے اس کے تصور کو جھٹکتے مگر......!!

☆☆☆

لیہا نے بہت مہارت سے گھر کا بجٹ ترتیب دیا تھا، گو کہ آمدنی کا کوئی حساب نہ تھا، مگر گھر بجٹ سے ہی چلتے ہیں، یوٹیلٹی بلز، اضافی اخراجات یہ وہ مہینے میں دو بار ہوٹلنگ ایک بار شاپنگ ہفتہ میں ایک بار گروسری اور وہ جو اسے بار بار رد کر دینے پر تلے رہتے، اب بھی معیز اکرام نے دل بھر کے اسے زچ کیا تھا۔

''جیسی شاپنگ تم کرتی ہو، ویکلی ہر روز ہو سکتی ہے۔'' وہ اتنی ہی سادہ طبیعت تھی، معیز اس کے لئے جو لے آتا پسند آ جاتا اور معیز کے معاملے میں وہ صاف جھنڈی دکھا دیتی۔

''مجھے مردانہ شاپنگ کا کوئی تجربہ نہیں۔''

''شادی کا بھی تو نہیں تھا، وہ بھی تو آخر کو ہے نا۔''

پھر معیز نے اس کے لئے خریدی جانے والی ہر شے کے ساتھ اک اپنے لئے بھی خریدنی شروع کر دی، سوٹ بنیں، واچ، پرفیوم اور کپڑے۔

''ابھی پہ۔ اور دکھاؤ۔'' اور اس کا ہر روپ دل موہ لینے و ہوتا، پھر ہلکے پھلکے اختلافات، شاید وہ اسے ڈرنا چاہتے یا ٹوٹنے کی تھم تھے۔

''اف ...فوہ...... تم پھر کچن میں گھسی ہو، ہزار بار کہا۔ یہ سب کام میرے آنے سے پہلے سمیٹا کرو۔''

''مگر کچن کا کام تو اپنے وقت پر ہی ہوتا ہے۔'' وہ وہیں ڈائننگ ٹیبل کی چیئر پر آن براجمان، بھی سرعت و مہارت سے جھٹ اس کے ہاتھ تھام لیتا۔

''تمہارے ہاتھوں پر مہندی چوڑیوں کی کھن کھن، زندگی ان کی جھنکار میں ہی تو چھپی ہے۔''

اسے تاخیر ہوتی، تو قصداً اسے ہراساں کرنے کے لئے موبائل آف کر دیتے، جانے کیوں بے چین کر کے انتظار کروا کا لطف آتا، اسے اچھا لگتا اگر کبھی وہ جھگڑتی شکوے کرتی مگر نا۔

''دیر سے آنا تھا تو کال ہی کر دیتے، میں فون کر کر کے تھک گئی۔''

''کھانا ٹھنڈا ہو گیا، اب میں پھر سے گرم کروں؟'' یا اتنا ہی کہہ دیتی۔

''معیز آپ بہت کیئرلیس ہیں۔''

مگر نا، ان کا ہر گمان ٹوٹ جاتا، وہ چاہتا کبھی تو وہ ان سے اختلاف یا فرمائش کرے، کبھی

تو کوئی ایسی بات ہاتھ آئے، کہ وہ چیخے چلائے اور وہ بیٹھ کر آنسو بہائے، یا پھر وہ خود ہی روٹھ جائے، خاموش ہو جائے اور لیہا اسے منانے کو، آگے پیچھے پھرتی رہے، مگر کیوں اور کیسے زندگی میں تو اک ٹھہراؤ اک سکوت سا در آیا تھا، وہ اتنی سادہ لوح نرم مزاج اور محبت و پروا کرنے والی ثابت ہوئی تھی، کہ معیز اس سے الجھنے جھگڑنے کے بہانے ہی ڈھونڈتے رہ جاتے اور وہ جوان کا گمان تھا کہ بیوی بن کر ہر عورت بدل جاتی ہے، وفا و حیاء کا پیکر، مجسم حسن، خوبصورتی کا خراج اپنائیت کا مان ملنے پر، ساتویں آسمان پر جا بیٹھتی ہے اور پھر زندگی اک دوسرے کو بدلنے اک دوسرے کی پسند کے سانچے میں ڈھلنے کی کش مکش کا نام بن کر رہ جاتی ہے، لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔

کچھ ہی عرصہ میں اس نازک، کومل وجود کی قلعی اترتے ہی وہ اک عام چپل کی صورت ثابت ہوئی ہے جس پر وقت کے ساتھ چڑھتی سیاہی، اس کے تمام نقوش دھندلا دیتی ہے، گھر بچے شوہر وہ اک گھن چکر بن کر اپنا آپ بھول جاتی ہے، وقت اس کا سارا رنگ روپ چھین کر اسے صرف اک عورت بنا دیتا ہے، دو جمع دو کرنے والی شوہر کی جیب پر نظر رکھنے اور اس کے معمولات پر کھٹکنے والی ہر حال میں اپنی منوانے والی فرمائشوں کی مشین، اسے لگتا عورتیں ساری یکساں ہوتی ہیں، یا پھر ہو جاتی ہیں، مگر لیہا منصور، لیہا منصور تو جیسے خود سے بولنا بھی بھول گئی تھی، نہ جانے کیوں، انہیں لگا کہ وہ مرجھائی مرجھائی اور افسردہ ملول ہی نظر آنے لگی تھی۔

تو کیا...... تو کیا وہ...... بھی...... تابندہ ہی کی طرح اک روز خاموشی سے، انہیں چھوڑ کر چلی جائے گی، ان کی ذات سے جڑا گزشتہ کا اک تاریک حوالہ اس پر کھل گیا تو وہ انہیں فریبی دھوکہ باز نہ سمجھ بیٹھے۔

تو کیا تابندہ ٹھیک ہی کہتی تھی، کہ وہ اک کمپلیکس کا شکار آدمی ہے، جو عورت کو اپنی جوتی تلے دبا کر رکھنا چاہتا ہے، لیکن یہ تو طے تھا کہ وہ لیہا کو کھونے کا خسارہ نہیں اٹھا سکتے تھے، اٹھا ہرگز نہیں سکتے تھے، ان کی زندگی اور زندگی سے جڑی ہر خوشی اور خوشی کا مہکتا لودیتا احساس صرف اور صرف اس کانچ سی لڑکی کے سبب ہی تو تھا۔

☆☆☆

محبت اک عام سادہ سا چار حرفی لفظ، جس میں ساری کائنات کا اسرار چھپا ہے، دنیا کا ہر رشتہ محبت کے احساس سے نمو پاتا ہے اور ہر ذی روح کو فقط یہ ایک جذبہ ہی اپنے قدموں پر کھڑا کر دیتا ہے، زندگی کی تمام رنگینوں، مسرتوں، شادابیوں کو یک جا کرتا، یہ دل چھو لینے والا جذبہ، زندگی اسی کے طفیل تو حسین تر ہے۔

مگر جو اس جذبے کی گہرائی میں اتر کر اس کی اصلیت کو پا جاتے ہیں، شاید وہی دلوں کا تسخیر کر لینے کا فسوں پھونکتے ہیں، محبت کا اسرار بس اک معمولی سے فارمولا میں چھپا ہے۔

محبت نہ تو مقابل کو بدلنے کا نام ہے اور نہ ہی اس کے من پسند سانچے میں ڈھلنے میں محبت کی بقاء ہے، محبت تو اپنی ذات کی نفی اپنے آپ کو فنا کر دینے کا نام ہے، یہ نہ کوئی ہدایت تھی نہ نصیحت، بس اک سادہ سا فارمولا جس کی گہرائی میں جا اترنے کو وہ اپنا آپ وہیں کہیں بھول آئی تھی اور اسی پر عمل پیرا تھی، وہ جو بھی لیہا منصور تھی اب اپنا آپ فراموش کرتی جا رہی تھی۔

اور کتنا مکمل، بھرپور، لائق و فائق، وجاہت کا شاہکار تھا اس کا جیون ساتھی، مگر اس کا ٹوٹنا، بکھرنا، یک دم خود کو گم کر دینا، پھر لوٹ آنا، اس

کے بدلتے موڈ و مزاج پل پل رنگ بدلتے انداز رویے، وہ شادی سے پہلے کے، چھ ماہ کے عرصہ میں اس کے مزاج کی اس پرت کو کبھی پا ہی نہ سکی، نہ سسرال کے جھنجھٹ تھے، نہ پیسے کی تنگی، نہ ذہنی فرسٹریشن، نہ شوہر بد کلام تھا نہ بد دماغ، پھر بھی...... پھر بھی اسے معیز اکرام کے مزاج کو جانچنے میں اک وقت لگا تھا۔

وہ جو پھولوں، شاعری، خوشبو، نغمگی، کتابوں کی رسیا، دلدادہ تھی چاندنی راتوں، بھیگی رتوں کی دیوانی ہر روز آغاز صبح رات کے دم توڑتے اجالوں میں اولین صبح کی تمام تر تراوٹ و حسن خود میں سمو لینے کی عادی، جیسے سرتاپا بدل گئی تھی، یہ لیہا منصور ہی تو تھی، جسے رات مطالعہ کے بنا نیند ہی نہ آتی تھی، اب اس کی بک ریک پر بھی دھول دبیز سے دبیز تر ہوتی چلی جا رہی تھی، کہ معیز اکرام کے کھانے، سونے ریلیکس کے اوقات بدلتے رہتے، اسے بیڈ روم میں مکمل تاریکی درکار رہتی اور کبھی جو بھولے بھٹکے کچھ پڑھنے لگتی وہ لیہا کے ہاتھ سے کتاب چھین لیتا۔

''کتابیں تو سنا ہے، صرف تنہائی کی ساتھی ہوا کرتی ہیں۔''

اور خود وہ رات دیر تک اسپورٹس چینل دیکھتا، تو وہ کروٹیں بدلتی رہتی، مگر اکثر راتوں کی تاریکی، اس کی نیند ٹوٹ جاتی، وہ چونک کر اٹھ بیٹھتا۔

''لیہا...... لیہا...... تم...... تم مجھے چھوڑ کے تو نہیں جاؤ گی؟؟''

بات مبہم تھی، مگر اس کا انداز، جیسے کسی اسرار کی گہرائی لئے ہوتا۔

کبھی جو وہ موڈ میں ہوتا، تو موبائل پر اپنے من پسند گیت لگا کر اسپیکر آن کر دیتا، انکھیوں کے جھروکوں سے میں نے دیکھا، جو سانورے، اور کبھی جو لیہا گنگناتی۔

تیرے بنا زندگی سے شکوہ تو نہیں
شکوہ نہیں، شکوہ نہیں، شکوہ نہیں
تیرے بنا زندگی، زندگی نہیں، زندگی نہیں
زندگی نہیں، زندگی نہیں، زندگی نہیں

فضا میں اس کی مدھ برساتی آواز کی نغمگی رس گھولتی اور معیز اکرام وحشت زدہ سا ہو کر کنپٹیوں پر ہاتھ رکھ لیتا۔

''پلیز...... لیہا...... پلیز...... اسٹاپ اٹ۔''

اور اس نے گانا گنگنانا ہی چھوڑ دیا۔

وہ سنڈے کی ہر شام ساحل سمندر پر گزارتے، اک دوسرے کے ہاتھ میں، ہاتھ ڈالے، لہروں کی سرتال سنتے، ساحل کی نرم نرم مٹی کو روندتے دور تک چلتے چلے جاتے، مگر جب بارش چھما چھم برستی وہ بالکونی میں نکل آتی، بھیگی شاموں کا فسوں، ہواؤں کی بجتی پائل، وہ اس حسین رت کا سارا حسن خود میں سمو لینے کو اس کی سنگت کو پکارتی، تو وہ مٹی کا تودہ بن جاتا، اسے خاموشی تنہائی اور تاریکی بھاتے تھے، کیٹس کی شاعری اور جگجیت کی غزلیں، اسے سیاہ رنگ پسند تھا اور معیز اکرام نے فلیٹ کی کلر اسکیم تک سلور اور کریم رکھی تھی، کبھی وہ بلاوجہ خاموش ہو جاتا، تو گھر کی فضا میں سناٹے کوکنے لگتے، اک عجیب وحشت زدہ سی گمبھیر خاموشی طاری ہو جاتی، آفس سے خراب موڈ لے کر آتا تو پھر وہ موڈ خراب ہی رہتا، وہ کچھ ہی کر لے، منا لے وہ اور بگڑ جاتا، بس صرف تنہائی، خاموشی چاہتا، وہ ہار جاتی۔

رنگ، خوشبو، ہوا، چاند، تارے، کرن، پھول، شبنم، شفق، چاندنی، خواب دریچے، سب گم ہوتا جا رہا تھا۔

لیہا منصور کا سچ مچ جیسے اس کا اپنا آپ

کہیں کھو گیا تھا، لبوں پر اک جامد چپ اور رویے میں ٹھہراؤ، اداسی، خاموشی، جامد چپ حتیٰ کہ اس کی ایم بی اے کی ڈگری، جانے کس کونے کھدرے میں پڑی سسک رہی تھی، کہ معیز اکرام کو عورت کا آنے بہانے گھر سے باہر رہنا ناپسند تھا۔

ایسا کیوں تھا، اور ایسا کیوں ہو گیا تھا، وہ ایسا تھا اسے سمجھنے میں خطا گزری، یا پھر وہ تحمل کر اس کا ضبط آزمایا تھا، یا اسے خود سے فنا کر دینا چاہتا تھا اور اگر یہ سب تھا تو وہ تنہائیوں، سناٹوں تاریکیوں سے وحشت زدہ ہو کر کیوں چونک اٹھتا تھا اور پھر اس کا سوال۔

''تم مجھے چھوڑ تو نہ جاؤ گی؟'' اور لیبا کو اس سوال کی گہرائی میں جا اترنے کے لئے معیز اکرام کی تہہ میں اترنا تھا، وہ جو اس کا خیال تھا، کہ ہم سفری برابری کی بنیاد پر ہے، شوہر بیوی کا رشتہ، شیئرنگ کا رشتہ ہے، وہ اس سے اتنا دور کیوں ہوتا چلا جا رہا تھا، جیسے اس کا اپنا آپ کھوتا چلا جا رہا تھا، اس کی ذات فنا کے مقام پہ تھی، تو معیز اکرام کے دہرے رویے اور چھپے ہوئے کردار کے سبب۔

☆☆☆

تابندہ کہتی تھی، معیز اکرام تم کنزرویٹو انسان ہو، عورت کو فنا کر دینے والے اس سے اس کا اپنا من چھین لینے والے، اس نے اپنی آئندہ زندگی کے لئے بہت سے خواب دیکھے تھے، اسے ایک گھر بنانا تھا، جو تابندہ کے کسی خواب خواہش کی منہ بولتی تصویر ہوتا، اسے اپنی تکمیل تشکیل دینی تھی، ابھی نئی زندگی کا آغاز ہی تو ہوا تھا اور تابندہ سفر کی ابتداء میں اس سے دامن چھڑا کر چلی گئی، اس کی بزنس مینجمنٹ کی ڈگری، اسے اس ڈگری کو کیش کرنا تھا اور معیز اکرام عورت کو سرتا پا عورت دیکھنے کا خواہاں یہیں پر اختلاف شروع ہوا اور اسی پر ختم ہو گیا، اس کی پرواز مزاج بلند تھے سو کمپرومائز کی کوئی راہ نہ اپنا پائی، بھلا معیز اکرام کے لئے وہ کیوں اپنا آپ فنا کر دیتی اور یہیں آ کر محبت کی اصلیت و گہرائی کھرا پن سب دم توڑ

گیا، محبت اپنا آپ کھو دینے فنا کر دینے کا نام نہ تھی، ہاں مگر خود کو نفی کر دینے کا فارمولا ضرور ہے، یہ فارمولا وقتی مگر زود اثر ہے، مگر تابندہ جیسے لوگوں کی پرواز بلند ہوتی ہے اور معیز اکرام ہو کہ تابندہ وہ دونوں ہی اپنے آپ کو نفی نہ کر سکے، سو محبت مر گئی، دم توڑ گئی، انہوں نے خود کو کھونا قرار دے کر خود کے لئے اپنی ذات کا ہر باب مقفل کر لیا تھا، مگر اچانک زندگی میں در آنے والی، معصوم لڑکی، لیہا منصور وہ اس کی محبت سے اپنا آپ نہ بچا پائے، مگر خود کو بدل بھی تو نہ پائے، تو پھر یہ اضطراب کیسا تھا، کیونکر تھا، شاید وہ محبت کی گہرائی میں اتر کر اس کی اصلیت کو ہنوز کھوج پائے تھے اور یہی ان کی شکست تھی۔

تابندہ چلی گئی، شاید لیہا بھی شکست کھا جاتی مگر اس کے پاس خود کو نفی کر کے دوسرے کو پا لینے کا ہنر تھا اور معیز اکرام ایک روز اس کے قدموں میں بیٹھ کر اپنی خطا کا اعتراف کر گئے تھے، کتاب زندگی کا اک باب مخفی رکھ کر انہوں نے اس کانچ سی لڑکی کے ساتھ، Cheat کیا تھا، وہ تو سراپا چاہنے قابل تھی، مگر وہ اپنی تمام تر فرسٹریشن کے سبب اسے عذاب دیتے رہے تھے، وہ اسے کھونے کا خسارہ نہیں اٹھانا چاہتے تھے، مگر پا کر بھی تو شاد نہ رہے تھے اور معیز اکرام نے اس کانچ سی لڑکی لیہا کی گود میں سر رکھ کر اپنی کتاب زندگی کا مخفی باب اس پر عیاں کر دیا تھا۔

وہ مجھ سے خائف تھے، اسے زچ کر کے اس کی چاہتوں کی انتہا جانچ لینا چاہتے تھے، مگر اسے کھو دینا بھی تو نہ چاہتے تھے، دل و دماغ میں پلتا پنپتا احساس جرم انہیں کسی کل چین نہ لینے دیتا، مگر اب وہ اسے مزید Tease یا Cheat نہیں کر سکتے تھے، ہاں وہ تنہا تھے اور تنہا رہ سکتے تھے، مگر وہ ساری غلط فہمیاں اتنی بے ضرر ثابت ہوئی تھی کہ معیز اکرام کی تمام تر خوش گمانیاں اس کے نام تھیں، سو وہ اپنے اک اک جرم کا اعتراف کر گئے، شام کے دھندلے، شرمگیں دم توڑتے اجالوں میں، عنابی لباس پر سیاہ شال کندھوں پر پھیلائے، اس کے گداز لبوں پر نہایت حسین اور اک دل چھو لینے والی مسکراہٹ در آئی تھی اس سوچ کے ساتھ۔

”ہاں معیز اکرام، میں جانتی ہوں تمہارے ماضی کا اک اک ورق، تمہاری سبز ڈائری میں مقید ہے، مگر میں منتظر تھی، تمہاری لب کشائی کی، تم جیسے Positive لوگ کسی گناہ کسی جرم کا بوجھ لے کر پرسکون نہیں رہ سکتے اور یہی تمہاری فرسٹریشن کی اصل وجہ تھی۔“

شام ڈھل رہی تھی، لاؤنج کی ساری بتیاں جل اٹھی تھیں، چار سو اک خوش گوار اجالا، کہ سب دھند چھٹ چکی تھی، اک کڑا مرحلہ اس آسانی سے سر ہو جانے کا تو گمان تو معیز اکرام کو چھو کر بھی نہ گزرا تھا، انہوں نے تحیر سے سر اٹھا کر سنہری آنکھوں پر سیاہ گھنیری پلکوں کا رقص دیکھا تھا۔

”تو کیا......تو کیا......تم۔“ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکے کہ ان کی داستان طویل تر تھی۔

”ہاں معیز اکرام محبت کسی کو پا لینے کا نہیں، محبت کسی کو اپنا لینے کا نام ہے اور جب ہم خود کو کسی کے نام کر دیتے ہیں نا، تو ہمیں اس کی گہرائی میں اتر کر اس کے اندر کو پا لینے کا ہنر بھی جان لینا چاہیے۔“ لیہا کی مومی مخروطی انگلیاں، معیز اکرام کے گھنیرے بالوں میں سرسرانے لگی تھیں اور دریچے کی اوٹ سے جھانکتا چودھویں کا چاند، ان کے مابین تمام کثافتیں ڈھل جانے پر شرما کر بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا۔

☆☆☆

محبت روٹھ جائے تو
ثنا کنول

بڑی ظالم رت تھی پوہ کا مہینہ تھا اور شدید سردی کا عالم بارش اور برف باری کے بعد پیر پنجال کا یہ اندورنی پہاڑی سلسلہ کوہ سفید برف کی چادر اوڑھ کر باقی دنیا سے تقریباً کٹ چکا تھا، اونچے چیڑ کے درختوں سے لے کر نیچے پھیلی وادی تک ہر شے پر سفیدی کا عکس نمایاں تھا چوکھ کے مقام سے لے کر وادی کے اس اندرونی حصے تک بہتا ہوا دریا طغیانی کی زد میں تھا۔

شدید سردی میں وہ ہر بات سے بے نیاز بغیر کسی گرم کپڑے کے کھڑکی میں کھڑی تھی، آنکھوں میں انتظار لیئے کسی کو تلاش کرتی وہ آنکھیں بھلا یہ جانتی کب تھیں کو جانے والے بھی مڑ کر آتے نہیں، جو اگر آنا ہو تو جاتے نہیں۔

انتظار انسان کو موت کے پہلے مار دیتا ہے مگر کسی کے آنے کی آس ہمیشہ زندہ رہتی ہے اک امید بن کر اک یقین کی صورت یا پھر محبت بن کر آپ کے دل پر راج کرتی ہے، وہ بھی محبت کے ہاتھوں مجبور تھی یا پھر دل کے ہاتھوں۔

گلی گلی پھرانے والی محبت در در مانگنے والی محبت، ٹھوکر لگوانے والی محبت اور اسی محبت کی وجہ سے آج بھی وہ اس کا انتظار کر رہی تھی، تبھی اس کے پاس اسید علی کی آواز گونجی تھی۔

محبت روٹھ جائے تو پھر نہیں آتی
لاکھ منانے پر رونے پر چلانے پر
یہ پھر نہیں آتی

''محبت روٹھتی کیوں ہے جی؟'' انداز میں بلا کی معصومیت تھی یہ اس کی آواز تھی اپنی۔

''جب جانے والا کوئی محبت کو چھوڑ لے تو یہ روٹھ جاتی ہے، جو اگر آپ کی محبت بھی روٹھ گئی تو۔'' اک خوف سا تھا اس کے انداز میں۔

''تو تم انتظار کرنا اس کے مان جانے کا۔'' کیسا مان تھا اسید علی کی آواز میں۔

''کرو گی نا تم انتظار؟''

''ہاں کروں گی جب تک یہ مان نہ جائے۔''

اور پھر وہ آج بھی انتظار کر رہی تھی محبت کے مان جانے کا مگر یہ بھلا مانتی کب۔

''لالہ رخ بیٹا سردی لگ جائے گی چلو اندر۔'' تبھی نانی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''آپ کو کیا پتہ نانی جسے محبت کا روگ لگ جائے تو اس پر سردی گرمی اثر کہاں کرتی ہے۔''

وہ سوچ کر رہ گئی پھر اندر کمرے کی طرف بڑھ گئی جبکہ وہ انتظار بھری آنکھیں وہی کہیں رہ گئیں تھیں اسید علی کے انتظار میں۔

☆☆☆

آج موسم بہت خوبصورت ہو رہا تھا ہلکی ہلکی آسمان سے گرتی سفید برف نے اونچی نیچی پہاڑوں کو ڈھانپ رکھا تھا جیسے کوئی ماں اپنے بچوں کو اپنے آنچل میں چھپا لیتی ہے بالا کوٹ کی خوبصورتی آج عروج پر تھی، دسمبر کا آخری ہفتہ تھا سردی کی شدت میں آج کچھ کمی سی تھی اسی لئے وہ اپنے روزمرہ کے کام نمٹا کر اس کی پہاڑی کی چوٹی پر آ بیٹھی جہاں کبھی دو دیوانے بیٹھا کرتے تھے۔

وہ کوئی سسی پنوں نہیں تھے نہ ہی ہیر رانجھا نہ مہینوال سوہنی وہ تو بس دو پاگل تھے اپنی ذات میں گم رہنے والے پاگل اور ان کی ذات عشق تھا ان دونوں راہی کا راستہ محبت تھی اور عشق منزل مگر پھر یوں ہوا کہ راستہ کھو سا گیا اور منزل دھندلا سی گئی۔

وہ جو محبت کو ہی جانتے تھے محبت کو ہی مانتے تھے وہ دونوں اک دوجے میں کھوئے سے رہتے خاموشی ان کے درمیان راج کرتی اور ان کی آنکھیں ایک دوسرے سے باتیں کرتیں محبت کی

باتیں چاہت کی باتیں، وہ بس گھنٹوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے نہ وہ کچھ کہتی نہ وہ کچھ کہتا بس دھڑکنیں شور کرتیں۔

اور وہ چپ چاپ اپنی اپنی دھڑکنوں کا شور سنا کرتے۔

☆☆☆

کاسنی دوپٹہ سر پر اوڑھے وہ اونچی نیچی پہاڑوں پر سنبھل سنبھل کر چلتی وہ اسید علی کے دل میں اترتی جا رہی تھی تبھی اس کا پاؤں پھسلا تھا اگر اسید علی اسے بروقت نہ سنبھالتا تو وہ پہاڑ سے نیچے جا گرتی۔

"سنبھل کر اگر تم گر جاتی تو۔" کیسا عجب سا خوف تھا اسید علی کی آواز میں، اسے کھو دینے کا خوف۔

"میں جانتی تھی جب تک لالہ رخ کے ساتھ اسید علی کی محبت ہے اسے کچھ نہیں ہو سکتا۔" بلا کا اطمینان تھا اس کی آواز میں، محبت ایسی ہی ہوتی ہے نڈر کر دینے والی ہو خوف و خطر سے پاک کر دینے والی، کمزور سے کمزور انسان کو طاقتور بنا دینے والی، تبھی اس کی آنکھوں کے سامنے اک اور منظر گھوم گیا تھا۔

وہ منظر جب برستی بارش میں بھیگا ہوا وہ پہلی بار ان کے گھر آیا تھا کرائے کے کمرے کے لئے، نانی نے اسے بیٹھا کر لالہ رخ کو آواز دی تھی۔

اور پھر جب لالہ رخ نے پہلی بار اسے دیکھا تو بس پھر اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کب کیسے وہ اس کے دل میں اترتا چلا گیا، محبت کب ان کی ساتھی بنی، عشق کب مہمان ہوا وہ دونوں ہی نہ جان سکے پتہ تھا تو صرف اتنا کہ وہ اسے دیکھ کر شرمانے لگی تھی اور اسید علی جیسے اسے دیکھ کر مکمل اٹھتا تو۔

☆☆☆

اے دسمبر اب کے آنا
تو نہ یوں واپس آنا ساتھ اپنے
ان کو بھی لانا اے دسمبر
ہاتھ میں ان کے میرا ہاتھ دینا
اے دسمبر اب کے یوں نہ آنا
ساتھ اپنے ان کو لانا آخر کب تک
ہم تنہا رہیں
کتنے درد اکیلے سہیں
اے دسمبر اب کے آنا

وہ اس کی دوری کی مسافت کو ناپتے ہر طلوع ہوتے سورج سے اور ہر شام کو ایسے ہی تھک جاتی تھی جیسے کسی لمبے سفر سے پیدل چل کے آئی ہو اور اس دنیا میں اس کی تھکن سمیٹنے والا کوئی نہ تھا جو تھا تو وہ اسے بہت دور اپنی اک الگ دنیا میں جی رہا تھا، وہ اکثر رات رات بھر اسے سوچتی رہتی جب بھی چاند کو دیکھتی یوں لگتا کہ جیسے وہ بھی چاند کو دیکھ رہا ہوگا اسے آج بھی اسید علی کی آنکھوں کی حدت اپنے چہرے پہ محسوس ہوتی تھی۔

اس نے محبت کی تھی آخر کچھ تو سزا ملنی تھی کیا ہر محبت کرنے والے کو ایسی ہی سزا ملتی ہے جیسی لالہ رخ کو مل رہی تھی، جاتے ہوئے اسید علی نے اسے کہا تھا۔

"لالہ رخ میرا انتظار کرنا جب تک میں آ نہ جاؤں اسی دسمبر میں تم مجھے اپنے سے قریب پاؤ گی، تم جب بھی چاند کو دیکھو تو یاد رکھنا چاند کی روشنی ماند پڑ سکتی ہے مگر ہماری محبت کبھی نہیں میں جلد اپنے والدین کو لے کر آؤں گا۔"

اور لالہ رخ نے آج تیرہ سال ہونے کے باوجود کبھی اپنا دروازہ بند نہیں کیا تھا کہ کیا پتہ وہ آئے اور دروازہ بند دیکھ کر مڑ جائے مگر لگتا تھا کہ محبت اس سے روٹھ سی گئی تھی لاکھ منانے پر بھی نہیں مانی تھی سچ تو کہا تھا اس نے۔

محبت روٹھ جائے تو پھر نہیں آتی
لاکھ رونے پہ چلانے پر منانے پہ
یہ پھر نہیں آتی جو اگر
محبت روٹھ جائے تو

اور یہی ہوا تھا لالہ رخ کے ساتھ انتظار کرتے کرتے اس کی آنکھیں تھک سی گئیں تھیں دل رکنے لگا تھا انتظار کا ہر پل ہر لمحہ اس پر سے قیامت کی طرح گزر رہا تھا، موت سے زیادہ مشکل اسے انتظار لگ رہا تھا اس تیرہ سالوں میں کیا کچھ نہیں بدلا تھا نانی اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور وہ بھی جوانی اور بڑھاپے کی سرحد پر کھڑی تھی، محبت سفید چاندی کی صورت اس کے بالوں پر اتر آئی تھی، وہ لالہ رخ کہاں رہی تھی مگر محبت آج بھی زندہ تھی اس کے دل میں دھڑکنوں کی صورت آنکھوں میں خواب کی صورت واقعہ سچ ہی تو کہا ہے کسی نے۔

ہر چیز کا کھنڈر ہو جانا طے ہے سوائے محبت کے، اس زمین پر اگر کوئی چیز آسمانی ہے تو وہ محبت ہی ہے، اس کے دل پر آج بھی محبت راج کرتی تھی اسید علی کی محبت سچ ہی تو بات ہے یہ محبت بھی بڑی عجیب ہوتی ہے پہلے آپ کی سوچوں پہ اپنے پنجے گاڑتی ہے دوسرا اٹیک آپ کی نیند پر کرتی ہے اور تیسرے اٹیک پہ آپ کا سکون چھین کر آپ کو بالکل بے بس کر دیتی ہے اور وہ بھی بے بس تھی محبت کے ہاتھوں۔

☆☆☆

بخار سے تڑپتے وجود کے ساتھ وہ اپنی بند ہوتی آنکھوں سے آج تیرہ سال بعد بھی وہ کھلے دروازے کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی اک امید تھی جو تیرہ سال بعد بھی ختم نہ ہوئی تھی اک یقین تھا اس کے آجانے کا یقین اسے پالینے کا یقین۔

باہر بادل زور زور سے برس رہے تھے دسمبر کا مہینہ تھا سردی اپنے جوبن پر تھی اور پھر تیرہ سال بعد وہ اچانک چلا آیا تھا محبت جس کی داسی تھی عشق جس کا غلام تھا، پہلے روز کی طرح بارش میں بھیگا ہوا جاتے وقت نے اس پر بھی اپنے نشان چھوڑے تھے مگر محبت ان کے دلوں میں آج بھی جوان تھی، آخر کار محبت نے اس کی سن لی تھی دسمبر کھلکھلا اٹھا تھا وہ چلا آیا تھا محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کے وہ کہہ رہا تھا۔

"اماں نے میری منگنی بہت پہلے اپنی بھانجی سے کر دی تھی، میرے لاکھ کہنے پر بھی انہوں نے میری شادی اس سے کر دی میں نے کئی بار کوشش کی تمہارے پاس آنے کی مگر......" وہ رکا۔

"کس منہ سے آتا لالہ رخ کس منہ سے تمہارے سوا کسی کو دلہن نہ بنانے کا وعدہ کیا تھا تم سے پھر کیسے تمہارا سامنا کرتا میں مر جاتا لالہ رخ میں مر جاتا۔"

"اور میں جو آپ کے انتظار میں پل پل مری ہوں۔"

"کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتیں؟" کیسی بے بسی تھی اسید علی کی آواز میں۔

"معافی کیسی اسید علی لالہ رخ نے تیرہ سال تمہارا انتظار کیا ہے اور ہر گزرتے پل نے میری محبت کو دگنا ہی کیا ہے۔"

"اتنے عرصے بعد تو میری روٹھی محبت مانی ہے میں اسے اور کیوں رولاؤں مگر تمہاری فیملی۔"

تیرہ سال بعد لالہ رخ کتنی پرسکون تھی کہ یہ جانتے ہوئے کہ اس کی ایک فیملی بن چکی ہوگی مگر، اس کے لئے یہ ہی بہت تھا کہ وہ آیا تو سہی اس کی محبت کے لئے۔

"ان تیرہ سالوں میں ہماری کوئی اولاد نہیں ہوئی میں اس کے ساتھ کوئی تعلق بنا ہی نہیں سکا، تھک ہار کر کچھ مہینے پہلے ہی میری بیوی مجھے چھوڑ

کر چلی گئی، لیکن میرا اعتبار کرو لالہ رخ میں نے پل پل تمہیں یاد کیا ہے۔ کبھی اپنے دل کو تمہاری یاد سے غافل نہیں رکھا میرے دل میں آج بھی تمہاری محبت بستی ہے۔" وہ کہہ رہا تھا اور لالہ رخ پرسکون ہو گئی تھی، اس کے وجود میں سکون اتر آیا تھا۔

"محبت ایسی ہی تو ہوتی ہے محبوب کو یہ خطا کو معاف کر دینے والی، اس کا ہر جرم اپنے سر لینے والی۔" اسید علی نے اپنا سر لالہ رخ کے بازو پر رکھا تھا بلا کا سکون تھا اس کے چہرے پر تیرہ سال کی مسافت طے کرنے کے بعد وہ محبت سے عشق تک کا سفر طے کرنے والے آج جا کر پرسکون ہوئے تھے خوشی نے ایک بار پھر سے ان پر اپنے بازوں پھیلائے تھے محبت کا راستہ صاف ہو گیا تھا منزل حاصل کی صورت انہیں آملی تھی۔

وہ دونوں خوش تھے زندگی مسکرا اٹھی تھی سارے گلے شکوے دور ہو گئے تھے، بالاکوٹ کی پہاڑوں پر گری برف ان کی محبت کی گواہ تھی اس سال کے دسمبر نے اسے تیرہ سال بعد اس کی محبت لوٹا دی تھی۔

کسی نے سچ ہی تو کہا ہے "جب انسان کی اپنی ذات نیلامی پہ چڑھ جائے تو اسے چاہیے کہ سب سے اونچی بولی دے کر خود کو آزاد کروا لے اس نے بھی اپنی ذات کی اونچی بولی دے کر خود کو آزاد کروا لیا تھا۔" اس یقین کے ساتھ کہ اللہ پاک بہتر لے کر بہترین عطا کر دیتا ہے حقیقت میں اللہ نے اسے اس کی پسند ہی عطا کر دی تھی، اس کے یقین کی لاج رکھ لی تھی، محبت ایک بار پھر مسکرا اٹھی تھی۔

☆☆☆

اک تھوڑا صبر

کنول ریاض

جیسے ہی جہاز کے پہیوں نے اس مقدس سر زمین کو چھوا، خدیجہ بیگم کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل رواں بہہ نکلا، بالآخر اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سرزمین پہ آنے کا شرف بخش ہی دیا جس کی تڑپ انہیں عرصہ دراز سے تھی اور یہ آنسو شکرانے کے آنسو تھے۔

اس رب العزت کی بارگاہ میں جس نے ایک مشکل اور صبر آزما وقت کے بعد انہیں اتنا سکون بخش لمحہ عطا کیا تھا، اک عمر کی ریاضت کے بعد ان کی زندگی میں بھی بالآخر خوشیوں کے لمحات آگئے تھے اور جس کے دیر پا ہونے کی دعائیں ان کا رواں رواں کرتا تھا، اگرچہ مشکلات ہر انسان کی زندگی میں آتی ہیں لیکن خدیجہ بیگم کی زندگی میں تو مشکلات اس وقت ہی دبے پاؤں چلی آئیں تھیں جب وہ ابھی لفظ آزمائش کا مفہوم بھی نہیں جانتی تھیں، ان کی زندگی کی کہانی بھی بڑی عجیب تھی، دکھ اور سکھ کے دائروں میں گردش کرتی یہ کہانی، انہیں خود بھی حیرت زدہ کر دیتی تھی اور اسے جاننے کے لئے ہمیشہ انیس سو ساٹھ کی دھائی میں جانا پڑے گا۔

جب خدیجہ بیگم نے ایک متمول گھرانے میں آنکھ کھولی، ان کے والد کپڑے کے بیوپاری تھے اور شہر بھر میں ان کی ساکھ تھی اور ساتھ ہی ساتھ روپے پیسے کی ریل پیل، اس زمانے میں ان کے والد کے پاس ذاتی گاڑی تھی اور ان کے گھر چار نمبروں والا فون بھی موجود تھا، والدہ کی مدد کے لئے ایک بوا بھی رکھی ہوئی تھی اور باہر کے کاموں کے والد صاحب اپنی دکان پہ موجود لڑکے کو بھیج دیتے تھے، سو ایسے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدیجہ بیگم اپنے بچپن میں ٹھیک ٹھاک امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ رہ رہی تھیں۔

ذرا بڑی ہوئیں تو سکول میں داخل کروا دی گئیں جہاں ان کی دو بہنیں پہلے سے زیر تعلیم تھیں، جبکہ بھائی قریب ہی لڑکوں والے سکول میں پڑھتا تھا، ان کا گھرانہ ایک خوشحال زندگی گزار رہا تھا کہ جب وہ حادثہ ہوا جس نے اس گھر کی خوشیوں کے ساتھ ساتھ خدیجہ بیگم کی پوری زندگی کو نگل لیا اس زمانے میں شب برات پر لڑکے پٹاس میں بارود بھر کر چلایا کرتے تھے، خدیجہ بیگم کے بھائی نے بھی والد صاحب سے پٹاس کی فرمائش کی لیکن انہوں نے ٹال دیا کہ اس میں خطرہ تھا، مگر ان کے بھائی نے والد سے چھپ کر اپنے دو کبوتروں کے بدلے ایک دوست سے بارود اور پٹاس حاصل کر لی، دوست نے ان کے بھائی کو دو قسم کے پاؤڈر دے کر بتایا تھا کہ ان کو آپس میں لکڑی کے چمچ سے مکس کر لینا، بھائی لکڑی کے چمچ والی بات بھول گیا اور اس نے ننھی خدیجہ کے ہاتھ میں پاؤڈر والا کاغذ پکڑا کر خود سٹیل کے چمچ سے مکس کرنا چاہا جس کے نتیجے میں شدید دھماکا ہوا اور بھائی کا پورا ہاتھ شدید زخمی ہو گیا جبکہ خدیجہ کی آنکھوں میں ڈھیروں بارود گھس گیا، اکلوتے بیٹے کو خون میں لت پت دیکھ کر سب کو ننھی خدیجہ کی آنکھوں کی چبھن نظر نہ آئی اور سارے گھر والے لڑکے کو لئے ادھر ادھر بھاگتے

رہے کیونکہ ہسپتالوں میں چھٹی کے باعث کوئی بھی ڈاکٹر دستیاب نہ تھا بچے کے ہاتھ کی تین انگلیاں اڑ چکی تھیں، ایسے میں قریبی شہر میں جانا پڑا اور جب تیسرے دن بچے کی حالت قابل تسلی ہوئی تو تب خدیجہ کے والدین نے سب کو ان کی طرف متوجہ کیا لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی، خطرناک بارود نے ان کی آنکھوں کی اندرونی نسوں کو شدید نقصان پہنچایا اور ان کی نظر شدید کمزور ہو گئی ایسے میں ڈاکٹروں نے آپریشن کرکے ان کی نظر تو بچالی لیکن وہ موٹے موٹے

شیشوں والی عینک کی محتاج ہو گئی اس زمانے میں عینک کو گالی سمجھا جاتا تھا بالخصوص لڑکیوں کے لئے، والد اور والدہ تو اس بات پر روتے جبکہ خدیجہ کان اور ناک پہ بھاری عینک کے نشان اور درد کے دکھڑے روتی تھی، لیکن اس تکلیف دہ وقت نے پڑھنے کے شوق میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہ کی اور خدیجہ نے اچھے نمبروں سے میٹرک پاس کر لیا، اس کے بعد سلائی کڑھائی کے کورسز کیے اور مزید پڑھنے کی لگن کو دل میں رکھنا پڑا کیونکہ نظر کی کمزوری آڑے آ گئی، اب ان کی عمر چونکہ شادی کی تھی اس لئے والدہ ہر آئے گئے سے رشتہ کے بارے میں کہتیں، لیکن وہی عینک آڑے آ گئی رشتہ دیکھنے کے لئے آنے والی عورتیں عجیب عجیب طرح کے سوالات کرتیں اور عینک اتروا کر آنکھوں کا معائنہ کرنے سے بھی دریغ نہ کرتیں ایسے میں لوگوں کے رویے انہیں پہروں رلاتے تھے۔

''اماں مجھے شادی نہیں کرنی آپ بس مجھے حج کروا دیں۔'' خدیجہ بیگم نے تنگ آ کر والدہ سے کہا۔

''بیٹا عورت کا اصل گھر اس کے شوہر کا گھر ہی ہوتا ہے میرے مرنے کے بعد کون تمہیں سنبھالے گا گھر، شوہر اور بچوں میں زندگی گزرنے کا پتا بھی نہیں چلتا جبکہ بھائی بھابھیوں کو بھی بیاہی بہن نند ہی اچھی لگتی ہے جو وقت کے وقت آ کر واپس چلی جائے، کنواری نندیں بھابھیوں کو کہاں برداشت ہوتی ہیں اس لئے بیٹا تھوڑا سا صبر کرو کوئی نہ کوئی تو اللہ پاک نے نصیب میں لکھا ہی ہوگا ناں۔''

والدہ کا پختہ یقین بلا آخر جیت گیا اور عمر صاحب کا رشتہ ان کے لئے خوشی کا پیام بن گیا، اگرچہ ان کے گھر کی عورتوں نے بھی تھوڑی رد و کد کی لیکن بلا آخر ایک بار بات طے ہو ہی گئی اور پھر عمر صاحب نے اس رشتے کو نبھانے کا تہیہ کر لیا، رشتہ کی بھابھیوں نے عینک کو نشانہ بنایا بھی تو پختہ ارادے کے حامل عمر صاحب نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر مجھے چھڑی کے سہارے بھی اسے چلانا پڑا تو میں ضرور اسے بیاہ کر لاؤں گا کیونکہ میرے والد صاحب نے یہ رشتہ طے کیا ہے، لیکن یہ اور بات کہ شادی کی پہلی رات وہ حیران ہی رہ گئے کہ اتنی خوبصورت عورت میرے نکاح میں عینک بھی ان کے حسن کو گہنا نہیں سکی تھی، لیکن خود ایک بدنما داغ بن کر ان کے چہرے پہ قبضہ جمائے بیٹھی تھی۔

اس زمانے میں جب خدیجہ بیگم کے جہیز کے سامان میں چرمی صوفے اور ڈائننگ ٹیبل آئی تھی تب ان کے سسرال میں بجلی بھی نہیں تھی اور ان کے جہیز کا فل سائز پنکھا ہمسائے کے گھر میں تار لگا کر دلہن کے لئے چلایا گیا تھا، چند دن بعد ہی خدیجہ بیگم کو گھر کے کاموں پہ لگا دیا گیا تھا، اس زمانے میں یہ ہی رواج تھا۔

☆☆☆

''آئے ہائے بہو..... یہ کیا گولے پکائے ہیں۔'' کوفتہ ہاتھ میں لئے بیٹھی ان کی ساس نے حیرت سے استفسار کیا۔

''بے بے جی، کوفتے ہیں یہ۔'' اینٹوں کے فرش پہ جھاڑو لگاتے خدیجہ نے جواب دیا، صحن میں لگے درختوں سے پتے جھڑ جھڑ کر سارا صحن بھر دیتے ایسے میں دن میں دو تین بار جھاڑو لگانی پڑتی تھی جو خدیجہ بیگم ہی لگاتی تھیں۔

''نہ بھئی ہمیں تو یہ عجیب وغریب کھانے سمجھ میں نہیں آتے اس لئے ہمارے لئے تو سادا کھانا ہی پکایا کرو۔''

ساس نے ہاتھ جھاڑ کر کھانا وہیں چھوڑ دیا تو

خدیجہ بیگم دیکھتی رہ گئیں، پھر اس کے بعد انہوں نے بقول ان کی ساس تمام شہری کھانوں کے پکانے سے توبہ کر لی لیکن ان کے ہاتھ میں بلا کا ذائقہ تھا جس کی تعریف ان کے سسر شوہر اور دیور کرتے تھے، ایسے میں جب وہ کسی چیز کی فرمائش کرتے یا پھر دیور کبھی کبھار مچھلی لے آتا اور بھابھی مصالحہ لگا کر فرائی کر دیتی تو سب کی عید ہو جاتی، شوہر نوکری کے سلسلے میں دوسرے شہروں میں رہتے لیکن خدیجہ سسرال میں ہی قیام پذیر تھیں، پہلے بچے کی آمد کے دوران طرح طرح کی مشکلات پیش آئیں، بے خبری کا زمانہ تھا، شادی شدہ ہونے کے باوجود بھی انہیں پہلے دو تین ماہ تو پتا ہی نہ چل سکا وہ تو جب ہاتھ پاؤں سوجنے لگے تو ساس سے تذکرہ کیا انہوں نے لاعلمی ظاہر کی تو ماں سے ذکر کیا انہوں نے قریبی ہیلتھ سنٹر (اس زمانے میں بڑے شہروں میں ہیلتھ سنٹر موجود تھے) میں چیک کروایا جہاں پریگنینسی کی تصدیق کے ساتھ ساتھ احتیاط اور خوراک کا ایک لمبا پرچہ ان کے ہاتھ میں تھما دیا گیا جو ان کی الماری میں اخبار کے نیچے ہی پڑا رہ گیا، گھر کے کاموں سے تھک ہار کر ایک بجے جب تیل والا چولہا جلا کر روٹی پکانے لگیں تو ساس نے دیکھ لیا۔

"ہمارے ہاں دوپہر میں روٹی پکانے کا رواج نہیں، یہ چونچلے اپنی ماں کے گھر ہی دکھانا۔"

ساس کے گھر کنے پہ چولہا وہیں بند کر دیا، یہ چولہا بھی ان کو ان کی والدہ نے لے کر دیا تھا کیونکہ خدیجہ بیگم کو لکڑیاں جلانے کی عادت نہ تھی باوجود کوشش کے بھی وہ آگ نہیں جلا پاتی تھیں، اپنی ذات پہ تو صبر کر لیتی تھیں لیکن وہ جان جوان ان کے پیٹ میں پرورش پا رہی تھی وہ بھوک کے باعث مچل مچل جاتی ایسے میں ہمسائی ترس کھا کر دوپہر میں ان کی ساس سے نظر بچا کر ایک روٹی اور اس پہ اچار کی پھانک رکھ کر دے جاتی اور یہ کمرے میں بند ہو کر کھا لیتی تھیں، کچھ وقت اور سرکا تو انہوں نے پہلی ڈلیوری کے سلسلے میں میکے میں ڈیرہ آ لگایا، (پہلی ڈلیوری میکے میں کروانے کا رواج تھا تب) کچھ دن بعد جب بچی پیدا ہوئی تو عمر صاحب کو اطلاع کی وہ بھاگے بھاگے بچی کو دیکھنے آئے کھانا وغیرہ کھا کر راضی خوشی سسرال سے رخصت ہو گئے اور پھر تین دن تک نہ وہ خود پلٹے اور نہ ہی سسرال سے کوئی بچی کو دیکھنے آیا، والدہ کی تشویش پہ خدیجہ بیگم کے بھائی عمر صاحب سے ملنے گئے تو معلوم ہوا کہ بچی کی پیدائش پہ ان کے گھر والے افسردہ ہیں اور انہیں بھی منع کر رکھا ہے، خیر کسی طرح بہلا کر خدیجہ بیگم کے بھائی انہیں لے آئے اور پھر جب چھلے کے بعد خدیجہ بیگم گھر واپس آئیں تو ان کے لئے ایک اور مشکل دور شروع ہو گیا اب بات بات پہ بچی پیدا کرنے کے طعنے ملتے بیاہی نندیں بھی آ آ کر ستاتی لیکن خدیجہ بیگم صبر کے گھونٹ بھرتی چپ رہتیں، کچھ عرصے بعد گھر میں دیور کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے اور چند دن بعد ہی ان کی دیورانی گھر بھر پہ چھا گئیں، اس نے آتے ہی خدیجہ بیگم کو دیوار سے لگا دیا اور بالآخر شوہر کی کمائی کے طعنے کے ڈراوے سے الگ ہو بیٹھی، یہاں تک کہ خدیجہ بیگم کو گھر سے بھی نکالنا چاہا لیکن ان کے سسر ڈٹ گئے، مگر مرد کہاں سارا دن گھر میں ہوتے تھے ایسے میں عورتوں کی باتوں کی کیا خبر سارا دن ان کی دیورانی گھر میں اپنا رعب دکھاتی اور ساس دیورانی کے ساتھ رہ رہی تھیں سو ایسے میں وہ بھی نہ بولتیں الٹا خدیجہ بیگم کی دیورانی لگائی بجھائی کر کے ساس کو بھی بھڑکاتی اور

وہ بھی خدیجہ بیگم سے نالاں رہتیں، یہاں تک کہ ان کی دیورانی ان کو نلکے سے پانی بھی نہ بھرنے دیتی ایسے میں وہ ہمسایوں کے گھر سے پانی لیتی تھیں لیکن کبھی شوہر سے ذکر نہ کیا، وہ غصے کے تیز تھے کیا خبر الگ ہو بیٹھتے اور انہیں اکیلے رہنے سے ڈر لگتا تھا، لیکن آخر کب تک ایک دن خدیجہ بیگم کے شوہر جلدی گھر آ گئے اور ابھی وہ پورے اندر بھی نہ آئے تھے جب انہوں نے اپنی بھابھی کو خدیجہ بیگم کو طعنے دیتے سنا وہ انہیں نکل جانے کے لئے کہہ رہی تھیں ایسے میں عمر صاحب نے کرائے پہ گھر لے لیا، گھریلو جھگڑوں سے تو خدیجہ بیگم کی جان چھوٹ گئی لیکن معقول آمدنی نہ ہونے کی بدولت آنے والی مشکلات سر اٹھائے کھڑی تھیں، ایسا نہیں تھا کہ عمر صاحب کام نہیں کرتے تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ جس بھی کام میں ہاتھ ڈالتے کچھ عرصہ تو وہ کام خوب چلتا لیکن پھر انہیں گھاٹا پڑنا شروع ہو جاتا اور بالآخر انہیں وہ کام ہی چھوڑنا پڑ جاتا، انہوں نے کپڑے کی دکان بنائی سیمنٹ کی دکان کھولی لیکن نقصان اٹھایا بیکری جنرل سٹور، یہاں تک کہ ایک گاڑی بھی لی سامان لانے لے جانے کے لئے لیکن گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور ہرجانہ بھرنا پڑا بہت سے لوگوں نے جادو ٹونے کا ڈروا دیا لیکن دونوں میاں بیوی کا اللہ پہ پختہ ایمان تھا جبھی ان باتوں میں نہ آئے اور رزق حلال سے بچوں کی پرورش کی۔

قدرت نے انہیں بیٹی کے بعد مزید دو بیٹوں سے نوازا تھا جس پہ خدیجہ بیگم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتیں، کم آمدنی کے باوجود بیٹی اور بیٹوں کو اچھی تعلیم دلوائی، گھر میں آٹا نہ ہوتا لیکن کتاب کے لئے بچوں کو پیسے تھما دیئے جاتے تھے، صبر اور توکل دونوں میاں بیوی نے بچوں کی گھٹی میں ڈالا تھا جبھی وقت خوش اسلوبی سے گزرتا گیا اور پھر ایک وقت آیا جب انہوں نے اپنا گھر بنا لیا اس وقت ان کی بیٹی بی اے میں جبکہ بچے ایف اور میٹرک میں زیر تعلیم تھے، اپنے ذاتی گھر کی خوشی وہی جان سکتا ہے جو کرائے کے گھروں میں زندگی گزارنے پہ مجبور ہے، گھر میں کھانے کو کچھ ہو یا نہ ہو مگر ہر ماہ کی رقم کو کرایہ دینا ہی پڑتا ہے، یہ مشکل وقت بھی خدیجہ بیگم نے اچھے طریقے سے گزار لیا، شوہر اچھا تھا جس نے دکھ سکھ میں ساتھ نبھایا اور آج جب کہ وہ بیٹی کو بیاہ چکی تھیں اور بڑے بیٹے کو سعودی عرب میں کمپیوٹر انجینئر کی جاب ملے دوسرا سال تھا اس نے دونوں والدین کو وزٹ ویزے پہ اپنے پاس بلایا تھا، چھوٹا بیٹا ابھی پڑھ رہا تھا، وہی دیورانی جو عرصہ پہلے ناراض ہوئی تھی اب ان سے ملاقات کرنے میں فخر محسوس کرتی، عمر صاحب اور خدیجہ بیگم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتے تھے جس نے ان کی زندگی اولاد کی طرف سے سکھ لکھا تھا کم مگر رزق حلال سے بچوں کی پرورش کرنے والے اس سکھ کو پا ہی لیا کرتے ہیں جو سکھ آج ان میاں بیوی کا مقدر تھا۔

ائیرپورٹ کے باہر ان کا بیٹا انہیں ریسیو کرنے آیا تھا، اس کے ساتھ اس کی رہائش گاہ پہ پہنچ کر سامان رکھا اور تازہ دم ہونے کے بعد خدیجہ بیگم نے کعبہ جانے کی فرمائش کی۔

''امی تھوڑا آرام کر لیں شام میں چلے گئے۔'' بیٹے نے ان کے سفر کی تھکان کے سبب کہا تھا۔

''نہیں بیٹا اللہ کے گھر جا کر ساری تھکن دور ہو جائے گی۔''

عمر صاحب نے کہا تو وہ حسب معمول گاڑی میں سوار ہو کر کعبہ شریف چلے آئے اور اللہ کے بارعب گھر پہ پہلی نظر پڑتے ہی آنسو پلکوں کی

بازھ بھلانگ کر ان کے چہروں کو تر کرتے گئے۔

"یا اللہ ہمارے حال پہ رحم کرنا ہمیں اور ہماری اولاد کو دونوں جہانوں میں کامیاب کرنا میرے مالک۔" آنسوؤں کے بیچ ہی بند ہونٹوں سے دعاؤں کا سلسلہ جاری ہو گیا، اگرچہ دیکھا جاتا تو یہ ایک عام سی کہانی تھی جس میں ساس بہو اور دیورانی جٹھانی کی باہمی چپقلش اور کم آمدنی میں گزارا کرنے والی ہزاروں عورتوں کی کہانی پوشیدہ ہے لیکن اس کی انفرادیت یہ ہے کہ خدیجہ بیگم جنہوں نے ایک امیر گھرانے میں پرورش پائی انہوں نے اپنی پچھلی زندگی بھلا کر غربت میں بھی شوہر کا ساتھ نہ چھوڑا اور اچھے سے نباہ کیا گھر میں روٹی کے ساتھ کھانے کو کچھ نہ ہوتا تو بچوں کو چٹنی ڈال کر روٹی بنا دیتیں لیکن کبھی کسی کے گھر مانگنے نہیں گئیں اور یہی خودداری ان میاں بیوی کی اساس تھی، عورت کی اصل کامیابی ہی یہی ہے کہ وہ اپنی پچھلی زندگی بھلا کر اگلے گھر میں رچ بس جائے اور خود کو یوں ڈھال جائے اور وہی خدیجہ بیگم نے کیا انہوں نے نہ صرف خود کو حالات کے مطابق ڈھالا بلکہ آنے والی ہر مشکل کا صبر کے ساتھ مقابلہ کیا اور آج اللہ تعالیٰ اس کا اجر اپنے گھر میں حاضری کی صورت میں دیا تھا، ان کی وہ کمی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش تھی اسے لوگوں نے گالی بنا لیا تھا خدیجہ بیگم لوگوں کے رویوں پہ روتی کڑھتی تھیں لیکن کبھی کسی سے سوال جواب نہ کیا تھا اور اس آزمائش پہ صبر کیا تھا، وہ کمی اللہ کی نظر میں کمی نہیں تھی بلکہ کامیابی تھی اس آزمائش میں کامیاب ہونے کی صورت میں ہی آج اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے گھر میں بلایا تھا اور اس انعام کے سامنے ہر وہ مشکل ہیچ تھی جو انہوں نے برداشت کی تھی اور یہ سب ان کے صبر کا ہی انعام تھا۔

دونوں ہاتھوں کو رب العزت کی بارگاہ میں پھیلاتے وہ سچے دل سے دعاؤں میں مشغول ہو گئیں۔

☆☆☆

ظرف کی بات

تمیرا نوشین

''مجھے معاف کر دو حور النساء، میں تمہارا مجرم ہوں پوری زندگی میں نے تمہیں دکھ دیے تمہاری عزت نفس مجروح کی کبھی عزت سے تمہیں نہیں پکارا، اچھے لفظوں میں کسی کے سامنے تمہارا ذکر نہیں کیا تمہیں تمہاری خدمتوں کے عوض ہمیشہ میرے طعنے تشنے، گالیاں اور مار ہی ملی اور تم نے کبھی اف تک نہ کیا نہ صرف تمہیں اذیت میں رکھا بلکہ تم سے جڑے رشتوں، تمہارے میکے والوں کو بھی چین سے رہنے نہ دیا، آہ...... میں مجرم ہوں تمہارا، ان لمحوں کا جو تم نے میرے ساتھ اذیت میں رہتے ہوئے گزارے، خدا کے لئے مجھے معاف کر دو ورنہ میں اپنے رب کے سامنے کیا منہ دکھاؤں گا۔'' ظاہر حسین میرے سامنے ہاتھ جوڑے معافی کا طلب گار تھا اور میں دم بخود اس کا چہرہ دیکھے جا رہی تھی اس کے الفاظ نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

''میں تمہیں معاف کر دوں ان ناکردہ گناہوں پر جو مجھ سے کبھی سرزد ہی نہ ہوئے اور تم نے مجھے ہمیشہ مجرموں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور رکھا آج جب تم بستر مرگ پر پڑے زندگی کے آخری ایام گزار رہے ہو، زندگی کی ڈور کٹنے کے منتظر ہو تو تمہیں آج مجھ سے معافی مانگنے کا خیال آ گیا اور کتنی آسانی سے تم نے مجھے کہہ دیا کہ مجھے معاف کر دو ورنہ میں اپنے رب کو کیا منہ دکھاؤں گا گویا اب بھی تمہیں اپنی فکر ہے اپنی آخرت برباد ہونے کے ڈر سے مجھ سے معافی کے خواہاں ہو ورنہ آج بھی تم یہی کر زندگی کی ڈور ٹوٹنے لگے تو مجھے یقین واثق ہے کہ پھر سے تمہارا وہی ناروا سلوک میرا منتظر ہوگا۔'' میں نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

''کیسے بھول سکتی ہوں میں اس دن کو جب تم نے میرے بدن کو جوتیوں سے داغا تھا یہ...... یہ نوٹ تیرے بھائی کے پاس کیسے آیا، حرافہ عورت میری محنت کی کمائی کو اپنے بھائیوں پر لٹا رہی ہے، غور سے دیکھ یہ وہی ہزار کا نوٹ ہے ناں، جس پر پان کھاتے ہوئے مجھ سے کتھے کا نشان پڑ گیا تھا۔''

''وہ...... وہ بھائی نے مجھ سے پیسوں کا چینج لیا تو میں نے آپ کے پیسو میں سے دے دیا۔'' میں گھبرا کر بولی۔

''پیسوں کا چینج...... کتنے پیسوں کا چینج لیا تھا جو ہزار کا نوٹ اسے تھما دیا۔''

''وہ...... وہ پانچ ہزار کا۔''

''پانچ ہزار۔'' ظاہر حسین کی آنکھیں ابل پڑیں۔

''پانچ ہزار کا کباڑا کر دیا تو نے نابجار عورت، دکھا مجھے پانچ ہزار کا نوٹ کہاں رکھا ہے تو نے میرے روپوں میں۔'' وہ مجھے گدی سے پکڑ کر اپنی الماری کے قریب لے گیا اور میں چور بنی خاموش کھڑی رہی کہ کیسے دکھاتی اس کو وہ پانچ ہزار کا ونٹ جس کے بدلے میں، میں نے اپنے بھائی کو ہزار ہزار کے پانچ نوٹ دیے تھے کہ ظاہر حسین کے پیسوں میں تو کئی نوٹ پانچ پانچ ہزار کے تھے بھائی کے دیے نوٹوں پہ کون سا

نشانی لگی تھی جو میں اسے نکال کر دکھاتی۔

"میرے ہی پیسوں سے میری دکان سے مٹھائی خرید رہا تھا۔ بے غیرت انسان وہ تو شکر ہے آج پول کھل گیا ورنہ پتا نہیں تو مجھے اور کتنا نقصان پہنچاتی۔" وہ مسلسل میرے جسم پر جوتے

برساتا رہا اور میرے میکے والوں کو مغلظات سے نوازتا رہا اور میں چپ کی تصویر بنی اس کے ظلم کا شکار ہوتی رہی اور اسی پر بس نہ کیا اس سارے واقعے کو پورے سسرال میں اس نے ایسا سنایا کہ میں بے قصور ہوتے ہوئے بھی گناہگار ٹھہری کسی

سے نظر ملانے کے قابل نہ چھوڑا۔

"تمہارے وہ لفظ میری روح پر تازیانے کی طرح لگے میں آج بھی ان لفظوں کے ترکش اپنے دل و روح پہ محسوس کرتی ہوں جسم پر لگائے گئے زخم تو مندمل ہو گئے مگر روح پر پڑے آبلوں سے آج بھی ٹیسیں اٹھتی ہیں، پھر کیسے معاف کر دوں تمہیں ظاہر حسین، میری ہر خوشی کے لمحے کو تم نے غم کے دھاگے میں پرو دیا میری آنکھوں کی نمی مجھ سے کبھی جدا ہی نہ ہو سکی درد کے قطرے ہمیشہ میرے دل کو بھگوتے رہے اور تم کہتے ہو کہ میں تمہیں معاف کر دوں۔"

☆☆☆

"کیا کس کے لئے یہ ہار سنگھار کر کے چھت پہ گئی تھی میں تو صبح کا گیا رات کو گھر میں گھستا ہوں تو سر جھاڑ منہ پھاڑ مجھے ملتی ہے، میری غیر موجودگی میں یہ ہونٹ کس کے لئے رنگتے ہیں۔" وہ مجھے چھت سے بری طرح گھسیٹتا ہوا لایا اور برآمدے میں بچھی چارپائی پر دھکا دیا تو میرا سر دیوار سے بری طرح ٹکرایا۔

"آہ۔" میرے منہ سے کراہ نکلی۔

"آج تو میں اتفاق سے اس وقت گھر آ گیا جو اپنی آنکھوں سے نظارہ دیکھ لیا پتا نہیں کتنے دنوں سے یہ چکر چل رہا ہو گا بتا مجھے کتنوں کو اپنے اس حسن کے جال میں پھنسا رکھا ہے، میں کہتا ہوں مجھ جواب دے۔" وہ میری خاموشی سے جھنجلایا تو میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"خدا کے لئے مجھے معاف کر دو، آئندہ بھی ایسی غلطی نہیں کروں گی، ڈریسنگ ٹیبل پر پڑی لپ اسٹک کا کلر مجھے اچھا لگا تو میں نے یونہی ہونٹوں پر لگا لی اور اوپر تو میں بچوں کے کپڑے پھیلانے گئی تھی میں نے تو ادھر ادھر دیکھا تک نہیں کہ چھت پر کون کھڑا ہے، میرا یقین کرو ایسی کوئی بات نہیں ہے مجھے اپنے بچوں کی قسم میری بات کا یقین کریں۔" آنسو میرے گالوں پر تواتر سے بہنے لگے۔

"بچوں کو بیچ میں مت لے کر آنا ورنہ جان سے مار دوں گا۔" وہ غراتے ہوئے میری طرف بڑھا اور میں نے خوف سے آنکھیں ہی بند کر لیں اسی اثناء میں ظاہر حسین کے چنگھاڑنے سے چھوٹا سویا ہوا اٹھ بیٹھا اور رونے لگا تو میں نے جلدی سے جا کر اسے گود میں لے لیا اور وہ بکتا جھکتا دھمکیاں دیتا گھر سے نکل گیا۔

میں نے بے دردی سے اپنے ہونٹوں کو رگڑ کر صاف کر ڈالا۔

"کیا ضرورت تھی مجھے یہ سب لگانے کی۔" میں نے اپنے آپ کو کوسا۔

"یہ کوئی آج نئی بات نہ تھی ہمیشہ ہی مجھ سے کہیں نہ کہیں کوئی کوتاہی ہو جاتی اور وہ مجھے دھنک کر رکھ دیتا اور ایسا ہی تھا شکی، تنگ ذہن، عمر میں مجھ سے دس سال بڑا اور کم صورت ہونے کی وجہ سے میں اکثر اس کے عتاب کا شکار رہتی۔"

ماں باپ کا سایہ بچپن میں سر سے اٹھ گیا تو پھپھو ہماری وارث بن گئیں اور جس کو جہاں انہوں نے مناسب سمجھا بیاہ دیا، میرے اس بے جوڑ رشتے پر انہوں نے لوگوں کا یہ کہہ کر منہ بند کروا دیا کہ اچھا کھاتا کماتا ہے مردوں کی صورت کون دیکھتا ہے، میں کہاں تک ان کی رکھوالی کروں، یہ بہن بھائی اپنے گھر بار کے ہو جائیں تو مجھے بھی سکون ملے سو میں چپ چاپ ظاہر حسین کے مظالم سہنے پر مجبور تھی، میں نے اس کی شکی طبیعت کے پیش نظر اپنے تمام کزنز سے بولنا ہی چھوڑ دیا تھا، کزنز وغیرہ کے سامنے آنے اور ان

سے بولنے تک پہ اعتراض ہوتا آہستہ آہستہ میں نے لوگوں سے میل جول ہی چھوڑ دیا بہن بھائی بھی اس کی عادت کی وجہ سے کم ہی چکر لگاتے اور میرے لئے دیئے انداز پر خود ہی پیچھے ہٹتے چلے گئے مگر اس شخص کو چین نہ آیا اب تو میرے ساتھ بچے بھی اس کے ظلم کا شکار ہونے لگے تھے۔

وہ بڑے اور سمجھدار ہوتے جا رہے تھے، باپ کے رویے نے ان میں تلخیاں بھر دی تھیں، ذرا سی غلطی پر وہ ان کو مار مار کر ادھ موا کر دیتا اور اگر کوئی بچہ میری حمایت میں بول پڑتا تو اس کی جان کے لالے پڑ جاتے میں بچوں کے آگے ہاتھ جوڑتی ان کی منتیں کرتی کہ ''تم میری حمایت میں مت بولا کرو۔''

''کیوں نہ بولیں، بغیر کسی قصور کے وہ آپ کو ہر وقت ذلیل کرتے رہتے ہیں آپ کے ہر کام میں کیڑے نکالتے ہیں ہر آئے گئے کے سامنے آپ کی برائیاں کرتے ہیں مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا، آخر خطا کیا ہے آپ کی، کیوں آپ ان کے ظلم پر آنسو بہاتی رہتی ہیں ان کے سامنے بولتی کیوں نہیں ہیں۔'' بڑا بیٹا رومان غصے میں آپے سے باہر ہو جاتا اور میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی۔

''کہ باپ کے سامنے یہ سب مت کہہ دینا۔''

''یہ سب میں تم لوگوں کی خاطر ہی تو برداشت کر رہی ہوں، آج ظلم کے خلاف آواز اٹھائی اور ادھر تمہارا باپ مجھے تین لفظ کہہ کر تم سے اور اس گھر سے بے دخل کر دے گا، یہ ظلم یہ زیادتی مجھے قبول ہے مگر تم سے جدائی مجھ سے برداشت نہ ہو گی تم سے دوری میری جان لے لے گی۔'' میری آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہتے اور میرے ساتھ بچے بھی بلکنا شروع ہو جاتے۔

''اسی بات نے مجھے روکا ہوا ہے یہی خیال مجھے ابو کے سامنے بولنے نہیں دیتا ورنہ میں اس شخص کو اس کی زیادتیوں پر مزا چکھا دوں۔'' وہ غصے میں مٹھیاں بھینچنے لگا۔

''ایسے نہیں کہتے بیٹا تمہارا باپ ہے تمہیں ہر سکھ آرام اسی کی وجہ سے حاصل ہے۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''ہمارا باپ بے شک ہمیں کچھ نہ دیتا مگر اپنی محبت و شفقت ہمیں دیتا تو اس شخص کی ہمارے دلوں میں کتنی عزت ہوتی ہم تنگی پر سکون اور مطمئن زندگی گزارتے آج ہمارا باپ تو رمد گلا کر ہمیں جب گالی دیتا ہے تو یہ مزید ار سالن ہمارے خون میں زہر بن کر سرایت کرتا ہے اور ہمیں اس شخص سے حد درجہ نفرت محسوس ہوتی ہے امی آپ دیکھنا میں اور ابراہیم تھوڑا اور بڑے ہو گئے تو کسی بھی دکان پر نوکری کر لیں گے اور سب سے پہلے اس شخص سے چھٹکارا حاصل کریں گے۔'' نفرت اس کے انگ انگ سے بول رہی تھی، ابراہیم نے بھی اس کی تائید میں سر ہلایا اور میں سن ہو کر رہ گئی ایک طرف بچوں کی اپنے سے محبت کی خوشی تھی تو دوسری طرف باپ سے شدید نفرت ہونے پر ملال بھی تھا مگر ظاہر حسین برے رویے برے رویوں سے ہی جنم لیتے ہیں میں صرف سوچ کر رہ گئی۔

☆☆☆

''شادی کر رہا ہوں میں، کل میرا نکاح ہے کان کھول کر سن لو واویلا کرنے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ کھڑے کھڑے اس عورت سمیت گھر سے باہر نکال پھینکوں گا۔''

وہ جانتا تھا کہ بچے مجھ سے شدید محبت کرتے ہیں اسی لئے اطلاع کے ساتھ دھمکی بھی

دے کر چلا گیا دونوں لڑکے غصے میں باپ کو برا بھلا کہنے لگے اور ناظم یہ بات سن کر روتے ہوئے میرے ساتھ لگ گئی تو میں خشک آنکھیں لئے اسے چپ کرانے لگی۔

میں نے تو سنا تھا برے سے برا مرد بھی بیٹی کی پیدائش پر سنبھل جاتا ہے، ہر برا فعل کرنے سے پہلے بیٹی کا چہرہ نگاہوں کے سامنے آ کر اسے برائی سے روک دیتا ہے مگر یہاں تو ایسی کوئی سچائی نظر نہیں آتی تھی، میں اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کے غیر عورتوں سے تعلقات ہیں مگر صبر کیے رہی، بچوں کے بڑے ہونے پر بھی اسے کوئی خیال نہ آیا اور آج بیٹی کے سامنے اپنی دوسری شادی کی اطلاع دیتے ہوئے اسے ذرا حیا نہ آئی نہ اس کی زبان لڑکھڑائی چند برس بعد بیٹی شادی کے قابل ہونے والی تھی اور یہاں باپ کو اپنی شادی کی پڑی تھی۔

''یا اللہ! ابھی اور کتنی آزمائشیں باقی ہیں۔'' میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی۔

نماز فجر ادا کر کے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو آنکھوں پر باندھے اشکوں کے بند ٹوٹتے چلے گئے۔

''اے میرے پاک پروردگار تو رحیم ہے تو کریم ہے تو نے میری قسمت میں ایسے شخص کا ساتھ لکھا جس کی عزت، پیار اور محبت کی حسرت ہی رہی اس کی مار پیٹ، گالی گلوچ اور بہتان تراشی پر ہمیشہ لب سیئے رکھے چاہتی تو اس کی گالی کے جواب میں میرے منہ سے بھی مغلظات نکلتے وہ مجھ پر چیختا تو میں بھی چیخ کر اس کے کانوں کے پردے پھاڑ دیتی اس کی نفرت کے جواب میں بھی اس کی طرف رخ نہ کرتی مگر میرے مالک صرف تیرے ڈر اور تیرے خوف سے میں نے ہمیشہ اس مرد کے سامنے اپنی آواز پست ہی رکھی طلاق جیسے قبیح لفظ سے بچنے کے لئے اس درندہ صفت شخص کا ہر ظلم برداشت کرتی چلی گئی کہ طلاق نہ صرف تیری نظر میں برا فعل ہے بلکہ معاشرے میں بھی اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا، یا اللہ! تو مجھے استقامت دے اور طاہر حسین کا سینہ اپنے بیوی بچوں کی محبت سے لبریز کر دے۔''

میں نے آنسو پونچھے اور کچن میں بچوں کے لئے ناشتہ بنانے چل دی، ذرا ہی دیر گزری تو رومان اٹیچی کیس لئے میرے پاس چلا آیا، ابراہیم اور ناظم بھی ساتھ کھڑے تھے۔

''چلیں امی چادر لیں۔''

''کہاں چلوں اور یہ تم نے اٹیچی کیس کیوں اٹھایا ہوا ہے۔'' میں حیران ہوئی۔

''بس امی بہت ہو گیا اب ہم مزید برداشت نہیں کر سکتے ہمیں اب اس گھر میں نہیں رہنا۔'' ابراہیم نے میرا ہاتھ پکڑا۔

''دماغ تو ٹھکانے پر ہے تمہارا کہاں جائیں گے ہم لوگ، اس گھر کے علاوہ کوئی جائے پناہ ہے تمہارے پاس۔'' میں غصے سے چلائی۔

''خدا کی زمین بہت بڑی ہے ہم کہیں بھی چلے جائیں گے محنت مزدوری کر لیں گے مگر اب اس گھر میں نہیں رہیں گے میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔''

''دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا جوان بہن کو لے کر کس کے گھر پناہ تلاش کرو گے کوئی عزیز رشتے دار برے وقت میں ساتھ نہیں دیتا بھلے وقتوں کے سب ساتھی ہیں کوئی ماموں چاچا تایا گلے نہیں لگائے گا تمہیں۔''

''ہمیں ان کے جانا بھی نہیں ہے میرا ایک دوست ہے میری اس سے بات ہو چکی ہے وہ ہمیں اپنے گھر رکھنے کو تیار ہے۔'' رومان نے

جیسے ٹھان لی تھی۔

''کتنے دن تک رکھے گا وہ تمہیں، شاباش ہے میرے بیٹے اس عمر میں تم ماں کے منہ پر کالک ملنا چاہتے ہو، چلو رکھو اپنی کیس اور اندر کمرے میں چلو۔'' میں نے اسے اندر کی جانب دھکیلا مگر وہ کس سے مس نہ ہوا۔

''خدا کے لئے رومان میرا امتحان مت لو۔'' میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''میں اس گھر سے کہیں نہیں جاؤں گی۔''

''کون سے گھر کی بات کر رہی ہیں، جس گھر میں میرا باپ آپ کی سوتن لے کر آ رہا ہے، کیا اب میرے باپ کے ساتھ ساتھ اپنی سوتن کی بھی خدمت گزاری کر کے زیادتوں کا ایوارڈ لینا ہے آپ کو۔'' وہ بپھرا ہوا تھا۔

''ایسا ہر گز نہیں ہوگا یہ گھر تم لوگوں کا ہے اس شخص کی دوسری بیوی کبھی اس گھر میں داخل نہ ہوگی یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔'' بچوں نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔

''میرا یقین کرو اگر ایسا ہوا تو میں خود تمہارے ساتھ اس گھر سے پہلا قدم نکالوں گی، چلو بس اب اندر چلو میں تم لوگوں کے لئے ناشتہ لے کر آتی ہوں۔'' بچے ڈبڈبائی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے اندر کی جانب چل دیئے اور میں کمال ضبط کا مظاہرہ کرتی ہوئی کچن میں اپنے جگر گوشوں کے لئے ناشتہ بنانے لگی۔

☆☆☆

ظاہر حسین اپنا ضروری سامان لے کر اپنی نئی بیگم کے ساتھ نئے مکان میں شفٹ ہو چکا تھا جوان خوبصورت بیوی نے اس میں بھی جوانی بھر دی تھی، نئے نویلے جوڑے کی طرح بیوی کو خوب لئے پھرتا، شاپنگ، ہوٹلنگ کرواتا کبھی کبھار ادھر کا چکر بھی لگا لیتا گھر کا خرچہ برابر دے رہا تھا اس کی طرف سے بچوں کو اس نے کوئی تنگی نہ دی مگر بچے اضطراب کا شکار تھے دوست احباب، رشتہ دار جب باپ کی دوسری شادی پر باتوں ہی باتوں میں مذاق اڑاتے تو وہ گھر آ کر چیزیں توڑتے پھوڑتے باپ کو برا بھلا کہہ کر خوب دل کی بھڑاس نکالتے اور میں دم سادھے انہیں دیکھے جاتی کہ میں کر بھی کیا سکتی تھی۔

دن رات کی عیاشی نے ظاہر حسین کا کاروبار شدید متاثر کیا نئی بیگم کے مطالبات بڑھتے ہی جا رہے تھے اور وہ بے دریغ خرچ کرتا چلا جا رہا تھا ہوش تو اس وقت آیا جب اس نے اسی کے ملازم سے راہ و رسم بڑھانی شروع کر دی ایک دن ملازم چھٹی پر تھا ظاہر حسین کی طبیعت بھی ناساز تھی وہ دوسرے لڑکے کے حوالے دکان کر کے جلدی گھر چلا گیا ڈپلیکیٹ چابی سے گیٹ کھول کر جب گھر کے اندر داخل ہوا تو لاؤنج میں بے باکی سے اپنی نئی بیگم کو اپنے ہی ملازم کے ساتھ بیٹھے پایا تو گویا وہ پاگل ہی ہو اٹھا اپنے ملازم پر پل پڑا گھونسے اور تھپڑوں کی بارش شروع کر دی مگر جوان ملازم کے سینے میں لگے ایک ہی جاندار مکے نے اسے اپنا بڑھاپا یاد دلا دیا کہ جوان آزاد خیال بیوی کا اب اس کے ساتھ گزارا نہیں اس نے کھڑے کھڑے اسے طلاق دے ڈالی مگر یہ طلاق اسے بڑی مہنگی پڑی تھی کاروبار اور گھر اس کے نام کر چکا تھا سو اس سے ہاتھ دھونے پڑے اور چند سال بعد ہی ظاہر حسین کو اپنے پرانے گھر اور پرانی بیوی کے پاس لوٹنا پڑا، میں چپ چاپ اس کی خدمت میں لگ گئی کسی گلے شکوے نے میرے ہونٹوں کو نہ چھوا، اب اس میں اتنا فرق ضرور پڑ گیا تھا کہ بچوں کے سامنے مجھے گالیاں بکنے کی جرأت نہ کرتا۔

☆☆☆

وقت تیزی سے گزرتا رہا تھا روحان کو ایک پرائیویٹ کمپنی میں بہت اچھی جاب مل گئی تھی، ابراہیم نے باپ کی دکان سنبھال لی تھی اور دن رات کی محنت شاقہ سے کاروبار ایک بار پھر سے چمک اٹھا انعم اپنے گھر کی ہوگئی تو میں نے سکھ کا سانس لیا، ظاہر حسین بھی کبھار دکان پر چلا جاتا یا پھر یار دوستوں میں اپنا وقت گزارتا، کچھ عرصہ سے بیمار رہنے لگا تھا ٹیسٹ وغیرہ کروائے گئے تو پتا چلا کہ ہیپاٹائٹس آخری اسٹیج پر ہے، میں جی جان سے خدمتوں میں لگ گئی اس کی صحت و تندرستی کی دعائیں، گو بچے اس کا اچھے سے اچھے ہاسپٹل میں علاج کروا رہے تھے، مگر کبھی باپ کے پاس بیٹھ کر اس کا حال تک نہ پوچھتے، وہ ساری رات کراہتا مگر وہ پروا نہ کرتے میں ان کو سرزنش کرتی۔

''کبھی نوکری اور دکان سے فراغت پا کر دو گھڑی باپ کے پاس بھی بیٹھ جایا کرو۔''

''کیوں، ہماری شکلیں دیکھ کر کیا ہمارا باپ سکون محسوس کرے گا۔'' وہ کٹیلے لہجے میں کہتے۔

''اس کا بہترین علاج کروا رہے ہیں، آپ خدمت گزاری میں لگی رہتی ہیں اور کیا چاہیے اس شخص کو، اس نے بھی تو ساری عمر ہمیں کیا بے سونے کا نوالہ کھلایا اور باپ کی شفقت سے محروم رکھا سو اس نے ہمیں محبت دی ہوتی تو ہم بھی آج لوٹا رہے ہوتے، عیش و آرام ہمیں پہنچایا وہ ہم بھی اس کو دے رہے ہیں، اس سے زیادہ کی ہم سے توقع نہ کریں۔'' دونوں یک زبان ہو جاتے۔

''شرم کرو باپ ہے تمہارا خدا کے سامنے کیا منہ دکھاؤ گے۔'' میں انہیں ڈراتی۔

''امی! ہم نہ ان کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آتے ہیں اور نہ ان کو برا بھلا کہتے ہیں جو عزت اور محبت انہوں نے ہمیں ساری زندگی دی ہی نہیں ہمیشہ ہمیں اپنی محبت سے تشنہ رکھا تو پھر ہمارے دلوں میں کیسے ان کی محبت جاگے گی۔'' وہ کہہ کر وہاں سے اٹھ کھڑے ہوتے اور میں خاموش ہو جاتی۔

انعم ہر دوسرے دن باپ کی خبر گیری کے لئے آ جاتی ان سے باتیں کرتی تو ان کا دل بہل جاتا، اس کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا کر روتے رہتے اور میں سوچتی بیٹی کی محبت دل میں جاگی بھی تو کب جب خود کے رخصت ہونے کا وقت آ گیا۔

☆☆☆

''پا..... پانی۔'' ظاہر حسین کی آواز مجھے درد ناک عہد رفتہ سے کھینچ لائی، میں نے جلدی سے اسے آگے بڑھ کر سہارا دیا اور پانی کا گلاس لبوں سے لگا دیا، چند گھونٹ پی کر اس نے گلاس پرے کر دیا، تو میں نے اسے سیدھا کر کے لٹایا اور وہیں اس کے سرہانے بیٹھ گئی، ظاہر حسین نے میرے ہاتھ اپنے نیم مردہ ہاتھوں میں تھام لیا۔

''بچے سو گئے؟''

''ہاں وہ آئے تھے آپ کے کمرے میں، آپ کی آنکھ لگی ہوئی تھی۔'' میں نے بچوں کا بھرم رکھنا چاہا۔

''مجھے پتا ہے نور النساء میرے دونوں بچے مجھ سے شدید نفرت کرتے ہیں میری شکل تک دیکھنا پسند نہیں کرتے، ٹھیک کرتے ہیں ساری عمر انہوں نے میری نفرت ہی جھیلی تو اب میں کیسے ان سے محبت بھرے رویے کی امید رکھوں اچھا ہے دونوں میرے قریب نہیں آتے اپنے دل میں میرے لئے کوئی نرم جذبہ نہیں رکھتے میں اسی قابل ہوں، ہمیشہ معصوم دلوں کو اپنے کاٹ دار لہجے سے سنگسار کرتا رہا، میرے پیار کے دو بول کے لئے وہ ساری عمر ترستے رہے اور اسی غلطی پر جسموں کے ساتھ ساتھ ان کے دلوں کو بھی چھلنی

کر دیئے تو میرے اتنے دیئے گئے دکھوں پہ ان کا مجھ سے نفرت کرنے کا حق تو بنتا ہے ناں، ہر انسان کو اپنے کیے کی سزا بھگتنی پڑتی ہے، مجھ جیسے شخص کی یہی سزا بنتی ہے کہ زندگی کے آخری وقت میں اپنے بچوں کی محبت کے لئے لمحہ لمحہ ترسوں، ان کی نفرت کا بوجھ میرے دل کو چین نہ لینے دے، یہی میری سزا ہے، یہی میری سزا ہے۔" ظاہر حسین بچوں کی طرح تڑپ تڑپ کر رو دیا اور میں اس کے ہاتھ سہلانے لگی اس نے بھیگی نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے، میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔

"میں نے ہر ظلم، زیادتی اور وہ تمام دکھ جو تم نے مجھے ساری عمر دیئے ان کے بوجھ سے تمہیں آزاد کرتی ہوں ظاہر حسین، جتنی اذیت بھری زندگی میں نے گزار دی، خدا تمہاری آخرت اس سے بڑھ کر اچھی کرے، میں نے تمہیں دل سے معاف کیا ظاہر حسین، میں نے تمہیں دل سے معاف کیا میرا رب بھی تمہیں معاف کرے۔" میرے منہ سے ادا کیے گئے الفاظ پہ اس نے سکون سے آنکھیں موند لیں اور میری آنکھوں سے آنسو لڑھک کر میرے دامن کو بھگوتے چلے گئے۔

ہمیشہ سے ہی یہ چلا آیا ہے ساری عمر مرد اذیت میں مبتلا رکھ کر آخری وقت میں معافی مانگ کر اپنے گناہوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور بیوی کے پاس سوائے معاف کرنے کے کوئی اور چارہ بھی تو نہیں ہوتا کہ اس کی فطرت میں میرے رب نے معاف کر دینے کا مادہ ہی اتنا رکھا ہے اور خدا کا خوف اس کے دل میں جاگزیں رہتا ہے اور معاف کر کے اسے اپنے رب کے سامنے سرخرو بھی تو ہونا ہے [illegible] تنگ شوہر کے دیئے دکھوں کی اذیت وہ اپنے جسم وروح پہ محسوس کرتی رہتی ہے۔

☆☆☆

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایڈ فری لنکس

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

''اب عشرت کی بیٹی میں کیا نقص ہے، جو تم انکاری ہو؟'' ایک قہر آلود نظر اس پر ڈال کر امی نے قدرے خفگی سے استفسار کیا۔

''امی اس میں کیوں کوئی کمی یا نقص ہوگا کتنی بار تو بتایا ہے کہ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔'' ہزار بار کہا گیا جملہ اس نے ایک بار پھر دہرایا جوان کو تپ چڑھانے کو کافی تھا۔

''کب کرنی ہے شادی، مجھے لحد میں اتارنے کے بعد۔''

''لاحول ولاقوۃ، کیسی باتیں کرتی ہیں امی۔'' وہ تڑپ کر بولا اور چیئر سے اٹھ کر بے ساختہ انہیں بازوؤں کے حصار میں لیا جسے انہوں نے لمحہ بھر میں توڑ دیا یہ ان کے شدید غصے کا اظہار ہی تھا مگر وہ بھی کیا کرتا، اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا جو کسی ایک چہرے کا اسیر ہو چکا تھا، اس ایک چہرے کی تلاش نے اسے گزشتہ ڈیڑھ برس سے خوار کر رکھا تھا۔

امی اور وردہ (معاذ کی بہن) لڑکیاں دکھا دکھا کر ہار گئیں لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا۔

''ابھی شادی نہیں کرنی۔''

''ناراض ہیں امی؟''

''نہیں بہت خوش ہوں اپنی اولاد سے۔'' وہ جل کر بولیں اور کچن کی سمت چل دیں، وہ بھی ان کے پیچھے تھا۔

''امی پلیز بات سمجھنے کی......''

''وردہ کو کالج سے لے آؤ اس کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔'' اس کی بات کاٹ کر انہوں نے حکم صادر کیا اور فریج سے گندھا آٹا نکال کر سلیب پر رکھا وہ سمجھ گیا اس بار ناراضگی شدید سے بھی زیادہ تھی سو وہ دل پر بوجھ لئے چپ چاپ نکل آیا۔

☆☆☆

''یہ لے کوک پی۔'' ارسل نے کوک کین اس کی سمت بڑھایا۔

''نہیں یار موڈ نہیں۔'' اس نے ہاتھ سے کین پیچھے کیا اور اس کے بیڈ پر اوندھا لیٹ گیا۔

''کیوں، اس ایک کینال کے پلاٹ پر ویرانی کیوں چھائی ہے؟''

''بکواس مت کر۔'' اس کا بھونڈا مذاق معاذ کو ایک آنکھ نہ بھایا۔

''پھر آنٹی سے جھگڑا ہوا ہے؟'' اس نے قیافہ لگایا، جو سو فیصد درست تھا، ارسل، معاذ کا اسکول ٹائم سے فرینڈ تھا وہ اتنے ہی گہرے اور ہم مزاج دوست تھے جتنے کہ دو قریبی دوست ہو سکتے ہیں اور معاذ اور آنٹی کی بحث تو وہ گزشتہ ڈیڑھ برس سے جانتا تھا، آنٹی (معاذ کی والدہ) جتنا شادی پر زور دیتیں، معاذ اتنا ہی دامن چھڑاتا اس حسینہ کے قبضے میں تھا جس کی ایک جھلک نے اسے دیوانہ بنا دیا تھا، محبت کے مفہوم سے آشنا کر دیا، خوابوں میں جینا سکھا دیا۔

ہاں وہ دن معاذ جہانگیر کیسے بھول سکتا تھا وہ دن نہ صرف اس حوالے سے یادگار تھا کہ محبت کے لمس نے اسے چھوا اس دن وردہ کی سالگرہ بھی تھی، 23 جنوری...... ایک ٹھٹھرتی کہر آلود، پرنم

اور مہکتی سی شام، وہ وردہ کے لیے گفٹ لینے Aco شاپنگ مال آیا تھا اور گفٹ کی کلیکشن میں معاذ اچھا خاصا لیٹ ہو گیا تھا، لہٰذا وہ بے حد عجلت میں سیڑھیاں اتر رہا تھا جب ایک مرمریں وجود اس سے ٹکرایا، اگر وہ بروقت ریلنگ نہ تھامتی تو یقیناً لٹو کی طرح گھومتی ہوئی سیڑھیوں کی زینت بن چکی ہوتی۔

''آئم سوری۔'' معاذ نے فوراً آداب معاشرت نبھایا، لیکن اس کی نگاہوں نے پلٹنے سے انکار کر دیا، سیاہ سوٹ میں ملبوس سر پہ اسکارف

لئے اور کندھوں پر دوپٹہ سلیقے سے جمائے اس اپسرا کا شعاعیں منعکس کرتا نقش آنکھیں چکا چوندھیا رہا تھا، اس کی شہد رنگ آنکھوں میں خفگی نمایاں تھی اور گلابی ہونٹ باہم پیوست تھے سرخ و سفید رنگت غصے سے تمتما اٹھی۔

"اٹس او کے۔" اس نے قدرے درشتی سے کہا اور دھڑ دھڑ کرتی سیڑھیاں چڑھ گئی، یہ چند لمحوں پر محیط واقعہ اس کے لئے قدرے اعصاب شکن ثابت ہوا کیونکہ یہ چند لمحے اس کے پورے وجود، اس کی پوری زندگی پر حاوی تھی، وہ انجان چہرہ اس کے حواسوں پر چھا گیا، جیون ساتھی کے نام پر اس کے تخلیق کے کینوس پر ہمیشہ اس انجان اور من موہنے چہرے نے رنگ بھرے۔

پہلے پہل اس نے لمحاتی کیفیت سمجھ کر سر جھٹک دیا، کہ چند دنوں میں سب کچھ نارمل ہو جائے گا مگر حالات اس کے برعکس تھے، یہ جذبات ہر گزرتے لمحے شدت اختیار کرتے جا رہے تھے اسے دیکھنے، سوچنے اور پانے کو دل مچل اٹھا، بے چینی بڑھ رہی تھی، اس ایک چہرے کے دیدار کی حسرت اسے پہروں جگائے رکھتی اور تقاضہ دل نے اسے صحیح معنوں میں بوکھلا دیا، جہانگیر صاحب کو گزرے پانچ سال بیت گئے تب وہ بی بی اے کے پہلے سال میں تھا ان کی حادثاتی موت اس کی والدہ، بہن اور خود اپنے لئے بے حد بڑا صدمہ اور دھچکا تھا، شدید آج جہانگیر صاحب زندہ ہوتے تو معاذ کے رنگ ڈھنگ کچھ اور ہوتے لیکن ان کی موت نے اسے بہت سمجھدار باوقار اور بردبار بنا دیا تھا، امنگوں اور خواہشوں سے بھرا دل خاموشی سے ذمہ داریوں کا مرقع بن گیا، شاید وہ اپنی کی ماں کی پسند کی ہوئی لڑکی پر چپ چاپ سر تسلیم خم کر دیتا جو اگر وہ لڑکی محبت بن کر اس پر نہ اتری ہوتی۔

محبت ایک لمحے کا ہی تو نام ہے اور وہ ایک لمحہ معاذ جہانگیر پر نازل ہو چکا تھا، جو اسے کسی اور کے نام پر راضی ہی نہ ہونے دیتا تھا، جس کی نگاہوں میں اب کوئی اور چہرہ جچتا ہی نہ تھا، اس کی تلاش نے اسے پورا شہر گھمایا اس شاپنگ مال کے ہزاروں چکر لگوائے قریہ قریہ گھمایا مگر اسے اپنا دیوانہ بنا کر وہ تو دنیا کی بھیڑ میں کہیں گم ہو گئی۔

معاذ کوئی دل پھینک قسم کا نوجوان نہیں تھا وہ بے حد مہذب، سنجیدہ اور باوقار شخصیت کے ساتھ بے حد وجیہہ و شکیل بھی تھا، وہ ایم بی اے کے فائنل ائیر کا طالبعلم تھا۔

اس لڑکی میں کچھ تو ایسا تھا جو معاذ جہانگیر جیسا انسان اپنے خول سے باہر نکل آیا اور دل اس کا طالب بن بیٹھا۔

"تو آنٹی کی بات مان کیوں نہیں لیتا۔"

"میں ماننا چاہتا ہوں ارسل، مگر یہ کمبخت دل امید دلاتا ہے کہ وہ ایک دن مجھے ضرور ملے گی۔" اس کا گمبھیر لہجہ سنجیدگی کے تمام تر رنگ چرا لایا، اس کے لہجے میں محبت و عقیدت کا ہر رنگ نمایاں تھا، امیدوں کا سمندر تھا، اس ایک ایک نقش چیخ چیخ کر محبت کے اعتقاد کی وضاحت کر رہا تھا۔

"معاذ میری بات سن یار، پتہ نہیں کون ہے وہ؟ کہاں ہے؟ اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے، کیا پتہ وہ شادی شدہ ہو یا انگیجڈ ہو۔" ارسل کو اس کی دیوانگی اور پاگل پن ڈرا رہا تھا، لہٰذا اس نے اپنے طور اسے سمجھانے کی کوشش کی وگرنہ آج سے پہلے اس نے ہمیشہ معاذ کا ساتھ دیا تھا وہ اس کا ہمنوا تھا، لیکن وہ اسے ایک لاحاصل انتظار میں سلگتے، لمحہ بہ لمحہ راکھ بنتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"تو مجھے بد دعا دے رہا ہے؟" معاذ چڑ کر

بولا۔

"میں تجھے حقیقت بتا رہا ہوں میرے دوست۔" وہ برا مانے بغیر بولا۔

"کیوں ایک لاحاصل انتظار، بلکہ دھوکے میں اپنی زندگی برباد کر رہا ہے معاذ، یار وردہ اور آنٹی کے بارے میں سوچ، کچھ اپنا خیال کر۔" دل میں مچلتے الفاظ بالآخر ہونٹوں پر آ ہی گئے۔

"میری محبت، میرا انتظار تجھے دھوکہ لگتا ہے، زندگی کی بربادی لگتا ہے ارسل۔" اس کے لہجے میں حیرت کے ساتھ تاسف چھلک رہا تھا وہ بری طرح ڈس ہارٹ ہوا۔

"ہاں کیوں کہ میں تجھے خوش دیکھنا چاہتا ہوں، یہ روتی صورت میں مزید افورڈ نہیں کر سکتا جس پر جب دیکھو ایک وقت نظر آتا ہے، وہ بھی بارہ بجے کا۔" وہ جل بھن کر بولا تو معاذ بے ساختہ مسکرایا۔

"تو پھر دعا کرو وہ مجھے مل جائے یوں ہی بے ساختہ۔" وہ مسکراہٹ دبائے سنجیدگی سے بولا تو ارسل نے پاس پڑا کشن زور سے اسے دے مارا جو اس نے کمال خوبصورتی سے کیچ کر لیا۔

☆☆☆

ایم بی اے مکمل ہوتے ہی اسے یونیورسٹی میں بطور لیکچرار اپائنٹ کر لیا گیا، چنانچہ اسے بنکوں اور مختلف کمپنیوں میں اپلائے کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔

آج اس کا اکاؤنٹس کا پہلا لیکچر تھا، اپنے اور کلاس کے تعارف جیسے ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد وہ...... وہ کورس کی آؤٹ لائن ڈسکس کر رہا تھا جب ایک نسوانی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی، چند لمحوں میں شناسائی پائی اور پھر جیسے ٹھہر گئی۔

"آئی ایم ساری سر آئی ایم لیٹ ٹوڈے (معاف کیجئے گا جناب میں آج تھوڑی لیٹ ہوں)۔" کلاس میں داخل ہونے کے بعد وہ معذرت کر رہی تھی معاذ نے آواز کے تعاقب میں نگاہیں اٹھائیں اور دم بخود رہ گیا وہ کوئی اور نہیں اس کے دل کی نگری آباد کرنے والی ماہ رو تھی، وہ حق دق تھا ساکن، بے یقین سا۔

جسے دیکھنے کی دعا اس کے دل نے ہر لمحے مانگی وہ یوں اچانک سراپا مجسم ہو گئی اس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔

"سر پلیز نیکسٹ ٹائم ایسا نہیں ہو گا۔" اسے مسلسل گھورتے دیکھ کر وہ یہی سمجھی کہ سر غصے میں ہیں لہٰذا توجیح پیش کی۔

"اٹس اوکے۔" اس کی آواز اسے ہوش کی دنیا میں واپس کھینچ لائی، اس نے بمشکل خود کو سنبھالا اور جواب دے کر وائٹ بورڈ کی سمت متوجہ ہوا، وائٹ بورڈ بھی اسی کے عکس سے بھرا نظر آیا، جیلو جدید تراش خراش کے سوٹ میں ملبوس اسکارف اور ہم رنگ دوپٹے کے ہمراہ وہ دلکشی کی آخری حدوں کو چھو رہی تھی، وہ لیکچر چھوڑ کر صرف مختلف کتابوں اور مصنفین کے نام لکھوا کر باہر آ گیا، عجیب سی گھٹن سینے پر بوجھ بڑھا رہی تھی، اس کے اعصاب تمام تر کشیدگی سمیت لائے تھے، چاہنے کے باوجود وہ خود کو نارمل نہیں کر پا رہا تھا اس سوچ نے اس کا احاطہ کر کے اس کے پورے وجود کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا، معاذ کو لگا اگر وہ مزید وہاں رکا تو اس کا دل بند ہو جائے گا۔

☆☆☆

"آخر کار تو نے ہار مان لی۔" معاذ نے شادی کے لئے ہاں کر دی، آشی کو وہ بچپن سے جانتا تھا وہ بھوری آنکھوں والی خوش شکل، خوش مزاج حاضر جواب اور سادگی کا پیکر تھی، وہ اس کی

خالہ زاد تھی، آشی کے سنگ زندگی کا سفر یقیناً خوشگوار سہل اور آسان تھا سو وہ مطمئن تھا، اس نے جب شادی کے لئے رضامندی دی تو وردہ اور امی کی خوشی قابل دید تھی اس کی طرف سے گرین سگنل ملتے ہی انہوں نے گویا ہتھیلی پر سرسوں جمائی اور منگنی کی سادہ سی تقریب کے بعد ڈائریکٹ شادی کی تاریخ طے کر دی۔

یہ خبر ارسل سے پوشیدہ رہتی، کیسے ممکن تھا اس قدر اچانک معاذ کا آشی کے لئے مان جانا اور اپنی دیرینہ محبت کو پس پشت ڈال دینا ارسل کو کچھ ہضم نہیں ہو رہا تھا یقیناً کوئی ٹھوس وجہ تھی جو معاذ اپنی محبت اور جذبات سے دستبردار ہو گیا یا وہ انتظار سے تھک گیا تھا لہٰذا ارسل اب وہی موضوع چھیڑ کر اس کے روبرو تھا جس سے وہ بھاگ رہا تھا۔

''ہاں۔'' معاذ نے مختصراً کہا اور میگزین اٹھا کر بلاوجہ صفحے پلٹنے لگا۔

''وجہ جان سکتا ہوں۔'' اس کے فرار کو بغور جانچتے ہوئے ارسل نے تمہید باندھی دو سال ایک لڑکی کو دیوانوں کی طرح چاہنے کے بعد وہ اچانک پہلو تہی برت رہا تھا، آخر کیوں، یہ سوال ارسل کے دل میں کھلبلی مچا رہا تھا۔

''کیا شادی کرنے کی بھی کوئی وجہ ہوتی ہے؟'' وہ مسکرایا۔

''تو جانتا ہے میں کیا پوچھ رہا ہوں بات کو گول گول مت گھما۔'' وہ سیدھا حامد عا پر آیا۔

''تو سن۔'' اس نے میگزین سائیڈ ٹیبل پر بڑی احتیاط سے رکھا اور قدرے پرسکون اور حتمی انداز میں بولا۔

''جس لڑکی کے لئے میں دیوانہ تھا اسے میں گزشتہ چھ ماہ سے اکاؤنٹس کی کلاس دے رہا ہوں ایم بی اے کے فرسٹ اور سیکنڈ سمسٹر کے لئے، اس کا نام اریشہ غفران ہے ڈیفنس فیز ایٹ بلاک میں اس کا گھر ہے، اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔'' وہ رکا تو ارسل کو حیرت سے غش آتے کو تھی اس کے سکون پر وہ قربان ہو رہا تھا جو اسے تفصیلات سے یوں آگاہ کر رہا تھا جیسے معمول کی کوئی بات ہو۔

''وہ تجھے مل گئی اور تو مجھے آج بتا رہا ہے۔''

''وہ مجھے ملی ہی تو نہیں۔'' وہ زیر لب بڑبڑایا۔

''او کے لیو اٹ، تو نے مجھے نہیں بتایا اس بات کو فی الحال جانے دے، لیکن اس کے بارے میں سب کچھ جاننے کے بعد بھی آشی سے شادی کیوں کر رہا ہے۔''

''جب تک وہ مجھے نہیں ملی تھی تب تک ٹھیک تھا ارسل، لیکن جب ملی اور جس رشتے کے تحت ملی وہ مجھے اجازت نہیں دیتا کہ میں اسے ایک محبوب کی نظر سے دیکھوں، میں اس کا استاد ہوں اور استاد کا مقام روحانی باپ کا ہے، میں اسے علم دے سکتا ہوں اس کی شخصیت کی تعمیر کر سکتا ہوں اس کے علاوہ کچھ مجھے سوٹ نہیں کرتا۔''

''معاذ کس صدی کی باتیں کر رہا ہے تو، میرے یار آج کل ان فلسفوں کی تقلید کون کر رہا ہے، جدید دور ہے، آج کل تو کتنے ہی استاد اپنی اسٹوڈنٹس سے شادیاں کرتے ہیں اور ویسے بھی تجھے اس سے پیار تیری اسٹوڈنٹ بننے سے پہلے ہوا، تو پھر اس رشتے کو شرعی رنگ دینے میں کیا قباحت ہے۔'' اس کی بات سن کر ارسل کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے۔

''بلاشبہ اس سے پیار مجھے میری اسٹوڈنٹ بننے سے پہلے ہوا، لیکن شناسائی تو ایک استاد اور طالبعلم کی حیثیت سے ہی ہوئی ہے نا ارسل اور اگر صحیح اور غلط کو ختم کر کے اس کے مابین جو تفاوت

ہے اس سے بالاتر ہو کر زندگی گزارنا جدت ہے تو سوری تو سے بٹ آئی کانٹ، میرے لئے وہ قابل احترام ہے ایک طالبہ کی حیثیت سے ڈیٹس اٹ اور ویسے بھی بات آج کل کی نہیں بات صحیح اور غلط کی ہے، اگر لوگ ایسا کر رہے ہیں تو پھر اس پیشے سے خیانت کر رہے ہیں جسے انبیاء کا پیشہ کہا گیا ہے۔" اس کا لہجہ سچائی کا غماز تھا، اس کے لفظوں میں گراوٹ نہیں حقیقت اور سچائی کا وزن تھا، وہ کس قدر مخلص اور صاف ستھری شخصیت کا مالک تھا، ارسل کو لگا جیسے وہ معاذ کو کبھی جان ہی نہیں پایا، اپنی محبت پانے کے لئے تو لوگ صحیح غلط خیر شر ہر شے کا فرق بھلا دیتے ہیں۔

معاذ چاہتا تو آسانی سے اپنی محبت پا سکتا تھا لیکن اس نے اپنے پیشے اور اس رشتے کو معتبر کیا جسے عرف عام میں استاد کہتے ہیں۔

"آئی ایم سو لکی دیٹ آئی ہیو آ فرینڈ لائک یو (میں بہت خوش قسمت ہوں کہ میرے پاس تم جیسا دوست ہے)۔" ارسل جیسے اس کے جذبات کے احترام میں کھڑا ہو گیا اور بے ساختہ اسے گلے لگا لیا، ایک پچیس چھبیس سال کے جوشیلے، جذباتوں اور امنگوں سے بھرے نوجوان کی اس قدر مثبت اور ایماندار سوچ دیکھ کر ارسل دنگ رہ گیا۔

"تھینکس آف تو یو میرے یار لیکن اس دل کا کیا کرے گا جو کوئی دلیل نہیں مانتا، چاہے وجہ کوئی بھی ہو محبت کا بیج وجود میں اگ جائے تو درد کے پانی سے افزائش پاتا ہے اتنا تو ارسل جانتا تھا۔"

"بس بس اب تو مجھے زیادہ چڑھا مت، میں نے وہی کیا جو ٹھیک تھا، رہی بات دل کی تو ہاں دل میں کہیں خالی اور ادھورا پن تو ہے ارسل، لیکن میں نے اپنا روحانی فرض ادا کیا ہے یہ بات مطمئن رکھتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر حقیقی سکون چھلک رہا تھا جو اللہ تعالیٰ نے اسے رشتوں کے تقدس کو قائم رکھنے کی صورت میں دائمی طور پر انعام میں دے دیا تھا، ارسل نے بغور اس کے طمانیت و سکون سے لبریز چہرے کو دیکھا اور چپکے سے اس کی دائمی خوشیوں کی دعا کر ڈالی۔

☆☆☆

میری ذات کا دیا

صبا جاوید

قلم خاموش، ذہن الفاظ سے خالی، فضائیں ساکن و جامد اور آنکھیں جیسے کوئی بھی نظر دیکھنے سے عاری ہیں، میں تو پہلے بھی لفظوں کی ساحرہ نہیں ہوں مگر آج تو جیسے ڈھونڈے سے بھی لفظ نہیں مل رہے، تمام الفاظ جیسے کہیں کھو گئے ہیں۔

زندگی میں کبھی نہیں سوچا تھا کہ ہلکے پھلکے موضوعات پر طبع آزمائی کرنے والی صبا جاوید قسیم خوشاں کی باسی بننے والی اپنی بڑی بہن کی دائمی جدائی کو ضابطہ تحریر میں لائے گی۔

فوزیہ آپی نے جب آپی کے بارے میں کچھ لکھنے کی پیش کش کی تو یوں ہی میں نے حامی بھر لی مگر اپنے اندر اتنا حوصلہ مجتمع نہیں کر پائی کہ آپی کے حصے میں آئی اذیت بیان کر پاتی، میری حالت تو یہ تھی گویا قلم چلانا بھول گئی ہوں۔

لیکن آج جب آپی کی جاب کا کنفرمیشن لیٹر موصول ہوا تو دل میں نجانے کتنے چھید ہوئے، وہ لیٹر میں نے وصول کیا جس کی پشت پہ یہ الفاظ تحریر کر کے میں نے محفوظ کر لیا۔

''جس لڑکی کو آپ نے کنفرم کیا ہے اسے منوں مٹی تلے سوئے آج اٹھارہ دن بیت گئے۔''

ان کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش میڈیکل کرنا تھا، وہ Adhoc پر ہاسپٹل میں جاب کر رہی تھیں اور کنفرمیشن کے لئے انٹرویو دیا ہوا تھا، یہ لیٹر اسی کی ایک کڑی تھی۔

شاید دوستی کے رشتے کی بنیاد بہن بھائیوں کے رشتے سے پہنچتی ہے جب ہم گھر کی چار دیواری میں ہی مقید ہوتے ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر روتے گرتے پڑتے اپنے کسی بڑے کی طرف دوڑتے ہیں وہ ہمیں تھام لیتے ہیں پھر سے انہی حالات سے لڑنے کے قابل بناتے ہیں، یہی برتاؤ ہم اپنے مسکن سے سیکھ کر پھر بیرونی دنیا میں برتتے ہیں، فاطمہ آپی (میری بہن) گھر میں دوسرے نمبر پہ تھیں، لیکن رعب و دبدبہ، سنجیدگی اور رکھ رکھاؤ کے اعتبار سے سب سے بڑی ہی نظر آتیں۔

امی بتاتی ہیں کہ ہم سب ددھیال والوں سے زیادہ قریب تھے اور گرمیوں کی تعطیلات ہوتے ہی لاہور بھاگتے، جبکہ آپی ہمیشہ امی سے قریب رہتی تھیں، وہ کہیں بھی نہیں جاتی تھیں، جب وہ چھوٹی تھیں تو سورج ڈھلتے ہی امی کے سر ہو جاتیں امی کو ڈھیروں کام نمٹانے ہوتے (تب بمطابق امی جوائنٹ فیملی تھی) وہ امی کے قمیض کا دامن تھامے امی کے ساتھ ساتھ پھرتی رہتیں، امی جب فارغ ہوتیں تب ان کے ساتھ لیٹ کر سوتیں۔

تھوڑی بڑی ہوئیں تو امی کے ساتھ باقی تمام چھوٹے بہن بھائیوں کو سنبھالتی ہم سب کو ہوم ورک کروانا، بیگ تیار کرنا، ٹیچرز کی کمپلینٹس سننا، پیپر کی تیاری کروانا سب ان کی ذمہ داری تھی اور آپ یقین کریں وہ اتنی بڑی بھی نہیں تھیں یہ سب ان کی ذمہ داری تھی یا یوں کہہ لیں انہوں نے خود ہی یہ ذمہ داری اپنے ناتواں کندھوں پہ ڈال لی تھی بہر حال آپی کی نگرانی کا

نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے الحمدللہ آج تک کبھی ٹیوشن وغیرہ نہیں پڑھی۔

امی کام میں مصروف ہوتیں، ہم میں سے کوئی روتا تو فوراً اٹھا کر کندھے سے لگا کر امی کو جیسے مطمئن کر دیتیں۔

شاید بچپن سے ہی ان میں احساس ذمہ داری بہت زیادہ تھی جو عالم شباب میں نا صرف پختہ ہو گئی بلکہ ان کو گھر میں ایک منفرد مقام دلانے میں بھی کامیاب ٹھہری، پاپا کو کوئی اہم کام آپی سے مشورہ پائے بغیر پایہ تکمیل تک نہیں پہنچتا تھا۔

"سونو (میری آپی کو امی سونیا اور پاپا پیار سے سونو کہتے تھے) یہ بات ایسی ہے کیسے کریں، ہر معاملے پر گفت و شنید امی سے کرتے نہ صرف، پاپا کی بلکہ وہ تو ہم سب کی وکیل، دوست اور غمگسار تھیں، ہم سب اپنے اپنے مسائل لے کر ان کے پاس جاتے اور پھر وہی ان کا حل نکالتیں، مجھے یاد ہے چند برس پہلے بھائی دوبئی جانا چاہ رہے تھے اور پاپا اتنی چھوٹی سی عمر میں انہیں قطعی طور پر بھیجنے کے لئے راضی نہ تھے، آپی نے نا صرف انہیں اجازت دلوائی بلکہ پاسپورٹ وغیرہ بھی بنوا کر دیا۔"

میری شادی شدہ بہن کی زندگی کن مسائل سے دو چار ہے، ہمیں کبھی پتہ نہیں چلا وہ سب معاملات فاطمہ آپی ہی ہینڈل کرتی تھیں، کچھ اس طرح کہ سسرال اور میکے والے دونوں ہی بے خبر رہتے، بڑی آپی کو بھی تو اپنا ہر فیصلہ آپی ہی سے شیئر کرنے کی عادت تھی۔

کس کس بات پہ انہیں یاد کروں وہ تو ہر لمحے میں سانس لیتی دکھائی دیتی ہیں، پچھلے سال میں نے گھر میں ذکر کیا کہ مجھے بی ایڈ میں ایڈمیشن لینا ہے جبکہ میرا ماسٹرز کا پہلا سال تھا امی تو سنتے ہی مجھ سے الجھ گئیں۔

"ایک ہی وقت میں کتنے کام کرو گی، جاب، اکیڈمی، ماسٹرز، کیا یہ کم ہے جو تم مزید درد سر لینا چاہتی ہو۔" اپنی طرف سے امی نے کورا سا جواب دیا، پھر آپی فاطمہ ہی تو تھیں جنہوں نے نا صرف ایڈمیشن لے کر دیا بلکہ امی کو کنونس بھی کیا۔

آپی کی سپورٹ کی بدولت اسی سال میرا ماسٹرز اور بی ایڈ کمپلیٹ ہو جائے گا، آپی اگر آپ تب داخلہ نہ لے کر دیتیں تو میں اس سال کیسے لیتی کیونکہ بی ایڈ اب چار سال کا ہو گیا ہے آپ کے ہاتھوں تو خدا نے بھلا ہی کروایا۔

وہ ہماری سپورٹر تھیں، وکیل تھیں اپنا مقدمہ ان کے کورٹ میں پھینک کر ہم سب بری الذمہ ہو جاتے تھے روشن پیشانی، روشن آنکھیں اور کھلتی رنگت والی وہ نازک سی لڑکی جو بات منوانے کے ہر ہنر سے واقف تھی تب ہی تو ہر مقدمہ جیت جاتی تھی، مگر اس نازک سی لڑکی کو روشن پیشانی کسی الجھن یا پریشانی کے سبب میں نے سلوٹ ذرہ نہیں دیکھی، وہ بلند حوصلوں کی مالک تھی، میں دور تک دیکھوں تو بھی مجھے یاد نہیں کہ اپنا کوئی مسئلہ آپی نے ہم سے شیئر کیا ہو۔

وہ انتہائی خاموش طبع تھیں، میں ان کو بے جا بولتے نہیں دیکھا، ان کی اس خوبی کے سبب اکثر آنے والے مہمان امی سے کہتے۔

آپ کی یہ بیٹی بہت مغرور ہے اور امی صفائیاں دیتیں یہ تو بہن بھائیوں سے بھی کم ہی بات کرتی ہے اور آپی ان کی باتیں سن کر مسکراتی رہتی ہے، مختصر اور ٹو دی پوائنٹ بات کرتی تھیں اس کے برعکس ان کا حلقہ احباب بے حد وسیع تھا شاید ان کا شعبہ ہی ایسا تھا۔

آپی بے حد پر عزم تھیں، بلند و بانگ دعوے کبھی نہیں کیے جو سوچا مصمم ارادہ کیا اور اسے

عملی جامہ پہنانے کی جستجو شروع کر دی، اپنا مقصد حاصل کر کے ہی دم لیا، ورنہ نیند، کھانا پینا سب حرام ہے، حالات پر کڑی نگاہ رکھتی تھیں امی سے زیادہ ہم آپی کے قریب تھے۔

ہماری خواہشات ان ہی کے توسط سے والدین تک پہنچتیں، ہاں میں اب سوچتی ہوں آپی اپنی خواہشات کا اظہار کیسے کرتیں، وہ میری بہن تھیں مگر ان کے چہرے پر میں نے کبھی ایسے تاثرات نہیں دیکھے جن سے مثبت یا منفی رویے کی تشخیص ہو سکے، ان کی مسکراہٹ سے ہمیشہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا کہ مسکراہٹ کا باطن کیا ہے۔

''آپی کیا آپ واقعی حالت سکون میں رہنا پسند کرتی تھیں یا آپ کو خود پر مکمل کنٹرول حاصل تھا کہ آپ کو اندر تک جانچنا بے حد مشکل تھا۔''

نجانے خدا کی یہ کیسی منشا تھی کہ آپی اکثر و بیشتر بیمار ہی رہتی تھیں میں نے کسی اسلامی تہوار پر انہیں چاق و چوبند اور آرائش و زیبائش سے آراستہ نہیں دیکھا، جب سے میں نے ہوش سنبھالا تب سے میں نے دیکھا کہ اور کچھ نہ ہو تو عید پر آپی کو بخار ہی گھیر لیتا، ہم سب نئے کپڑے پہن کر یہاں وہاں گھومتے پھرتے اور آپی کسلمندی سے لیٹی رہتیں، امی کے بارہا کہنے پر بھی نئے کپڑے نہ پہنتیں، البتہ دوائی بہت آرام سے نگل لیتیں، آپی بہت حلیم اور صابر و شاکر تھیں، آخری دنوں میں جب آپی چھ چھ (بلکہ ان گنت) گولیاں نگلتیں تو مجھے بیک وقت آپی کے صبر پر اشک اور اذیت محسوس ہوتی، میں جسے دوائی دیکھ کر ابکائی آنے لگتی ہے وہ آپ کے صبر پر کیسے نہ رشک کرتی۔

کسی نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کی بہن کو کھانے میں کیا پسند تھا جو چیزیں اسے پسند تھیں چہلم تک جو کھانا بھجوانا اس میں وہی چیزیں رکھنا میں چپ چاپ اس خاتون کا چہرہ دیکھتی رہی، میں کیسی بہن ہوں جسے آپی کی پسند ناپسند کا بھی اندازہ نہیں، اندازہ کیسے ہو آپ نے کبھی کھانے پینے کے بارے میں نخرے کیے ہی نہیں، جو ملا ٹھنڈا گرم چپ چاپ خندہ پیشانی سے کھا لیا، شلجم، بینگن، ٹینڈے وغیرہ بننے پر جیسے ہم شور مچاتے تھے آپ نے تو کبھی ایسا ردعمل ظاہر ہی نہیں کیا، ہمیں امی آپی کی مثالیں دے کر کھانا کھلانے کی کوشش کرتیں، ہاں میٹھے چاول بہت شوق سے کھاتی تھیں، آپی کو جذبات کے اظہار کی زبان نہ آتی تھی یا شاید آپ جذبوں کا اظہار کرنا ہی نہیں چاہتی تھیں۔

کچھ عرصہ پہلے ان کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا جس میں ان کے دائیں پیر کی ہڈیاں بری طرح ٹوٹ گئیں، دو آپریشن ہو چکے تھے مگر پیر کی بناوٹ میں تھوڑا سا ٹیڑھا پن تھا اس دوران وہ ایک قدم بھی خود نہیں چل سکتی تھیں۔

میں آپی کی بردبار اور پرسکون طبیعت کا الفاظ سے کیسے احاطہ کروں، ہم حتی المقدور ان کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے لیکن کوتاہی ہو بھی جاتی تو شکوہ نہ کرتی، شاید خدا کو آپ کا یہی صبر اور عاجزی پسند آ گئی، مصیبتوں کو برداشت کرنے اور شکوہ نہ کرنے کی ادا بھا گئی جو چھبیس ستائیس سال کی مختصر سی مدت کے بعد اپنی امانت لے لی۔

میں لکھنے کے معاملے میں بے حد کاہل ہوں مجھے تھوڑا بہت لکھنے پر اکسانے والی میری آپی کی ہی ذات ہے وہ مجھ سے استفسار کرتیں۔

''کافی عرصہ ہو گیا تمہاری کوئی تحریر نہیں آئی۔''

''میں نے لکھی ہی نہیں۔''

''تو لکھو نا۔''

”آپی میں کون سا پروفیشنل رائٹر ہوں بس موڈ ہو تو کبھی کبھار طبع آزمائی کر لیتی ہوں۔“

”صبا تم ایک رائٹر ہو اور قلم چلانے سے لکھنے میں نکھار آتا ہے۔“

میں کہتی۔

”آپی رائٹر کے لفظ کے لئے میری ذات بہت چھوٹی ہے ابھی۔“

ہاں ٹھیک ہے لیکن اتنے جھلملاتے ستاروں کے بیچ میں تمہارا نام دیکھ کر ہمیں کس قدر خوشی ہوتی ہے اگر تمہیں اندازہ ہو جائے تو قلم چھوڑو ہی مت، ٹھیک ہے تم خود کو کچھ نہیں سمجھتی لیکن پھر بھی تم بہت کچھ ہو۔

”آہ..... آپی کا ایک ایک ہمت دلاتا لفظ میرے ذہن پر نقش ہے، ایک بار ان کی کولیگز (شب گزیدہ سحر) ایک افسانے پر تبصرہ کر رہی تھیں (یہ افسانہ ایک اور ماہنامہ میں شائع ہوا تھا) اور ساتھ ساتھ رو رہی تھیں آپی کافی دیر ان کی باتیں سنتی رہیں اور پھر مسکراتے ہوئے بتایا کہ یہ لڑکی میری بہن ہے ان کو حیرت ہوئی تو وہ تو الگ، لیکن آپی نے جس فخر سے مسکراتے ہوئے مجھے یہ واقعہ سنایا وہ میں کبھی نہیں بھول سکتی۔“

میں تو کچھ بھی نہیں ہوں آپی، ہاں آپ محسن انسانیت تھیں، انسانیت، مخلوق خدا کی خدمت کرتی تھیں، میڈیکل جیسے قابل احترام اور درد مندانہ پیشے سے منسلک تھیں۔

اگست کے اینڈ میں آپی کی طبیعت کچھ ناساز رہنے لگی تھی جسے آپی نے معمولی بخار گردانا، ڈیوٹی کے بعد حرارت اور تھکاوٹ کا بے کل کرتا احساس انہیں بستر چھوڑنے ہی نہ دیتا، آپی کی اپنی ذات سے لاپروائی انہیں ہم سے دور لے گئی، یا قسمت کے باب یہ سب یوں ہی درج تھا۔

12 ستمبر (چاند رات) کو آپی 106F بخار تھا، رنگ خزاں رسیدہ پتے کی مانند زرد تھا اور وجود کانپتا محسوس ہو رہا تھا ڈاکٹرز نے آپی پر چھاؤں کر رکھی تھی، وہ ساری رات ہم نے ایمرجنسی میں گزاری ان کی اذیت دیکھ کر امی اپنا دل پکڑ کر بیٹھ جاتیں (امی دل کی مریضہ ہیں) عید کا دن بھی یوں ہی گیا، ہر گزرتے دن آپی کی کمزوری مانند پڑتے لگی کھانا پینا دیکھنے کی حد تک تھا آئی وی سلوشنز ہی ان کا کھانا پینا تھا، بخار کسی صورت کم نہیں ہوتا تھا، ایک دو گھنٹے کم ہوتا پھر 106F کے ہندسے پر پہنچ جاتا، بہتر سے بہترین دوائیں استعمال کروائیں لیکن خدا نے جیسے ہر دوا سے شفاء کا مادہ چھین لیا کسی دوا کا اثر ہوتا دکھائی نہ دیتا تھا، ستمبر کا مہینہ گھر اور ہاسپٹل انہی دو منزلوں کے مابین گردش کرتا رہا، ہم بے بس تھے کہ دنیا کی کس نعمت کے بدلے آپی کے لئے آرام و چین خرید لیں، ساری ساری رات آپی کے سرہانے بیٹھ کر گزرتی مگر انہیں نیند آتی نہ سکون۔

21 ستمبر کو آپی ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھیں، میں سارا دن ان کے پاس رہی، خاموشی ان کی طبیعت کا خاصہ تھی لیکن اب تو جیسے لبوں کو جنبش دینا بھول گئیں تھیں۔

قارئین میری بہن کی آنکھیں بھوری اور کانچ کی طرح چمکدار تھیں مگر تب ان میں مجھے زردی اور تھکن سی اترتی نظر آتی میرا دل کٹ کر سینکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا، اس دن میں نے اپنے رب سے لڑائی کی شاید گناہ کی مرتکب ہوئی۔

ہماری فیملی میں انہیں سب سے خوبصورت لڑکی ہونے کا اعزاز حاصل تھا اور جب اکثر و بیشتر لوگ کہتے کہ سونیا، صبا کے خدوخال میں تمہاری شباہت بہت نمایاں ہے تو آپی کا تو پتہ نہیں لیکن میں بہت خوش ہو جاتی تھی۔

اس دن آپی بے حد کمزور اور زرد دکھائی دے رہی تھیں، لیکن پھر بھی میرے دل میں ایک لمحے کے لئے یہ گماں نہیں گزرا تھا کہ ایک دن بعد آپی یوں داغ مفارقت دے جائیں گی۔

22 ستمبر بروز جمعرات جب آپی کے پاس میری تیسرے نمبر والی بہن میرا چھوٹا بھائی اور امی تھیں تب انہوں نے کسی کی نہیں مانی گیارہ بجے کے قریب ان کی روح اپنے اصل کی طرف لوٹ گئی۔

پندرہ راتوں کی جاگی وہ بے چین روح دائمی نیند سو گئی، بدھ کی رات کو جب تکلیف حد سے بڑھی تو ڈاکٹر سے کہہ کر نیند کا انجکشن لگوالیا، ہر بات کو جاننے والی میری بہن سکون کی تلاش میں یہ کام بھی کر گئی امی کے منع کرنے پر بولی۔

"امی میں کچھ دیر آرام سے سونا چاہتی ہوں میں بہت تھک گئی ہوں۔"

میں وہاں نہیں تھی لیکن میں اندازہ کر سکتی ہوں ماں کا کلیجہ اولاد کی بے بسی پر شق ہو گیا ہوگا، آپی تو امی کے بغیر نہیں رہتی تھیں، پھر اب اس شہر خاموش میں تنہا کیسے رہتی ہو، آپی ادھر آ کر دیکھو امی اٹھارہ دنوں میں بستر سے لگ گئی ہیں، آپ کو سنبھالتے ہوئے وہ ساری ساری رات جاگ کر بھی چاق و چوبند رہتی تھیں مگر آپ کو کھو کر ہر دوسرے دن ہاسپٹل کا چکر لگتا ہے۔

آپی اب پاپا سونو کے کہیں گے امی میٹھے چاول کس کے لئے پکائیں گی، ہم اپنے مسائل کے حل کے لئے کس کے پاس جائیں گے، آپ جذبات کا اظہار نہیں کرتی تھیں میں بھی تو ایسی ہی ہوں، اپنے غم کی شدت آنکھوں میں چھپا کر خود بھی چھپ جاتی ہوں، نماز پڑھ کر جب آپ کے درجات کی بلندی کے لئے دعا مانگتی ہوں تو نماز ادھوری رہ جاتی ہے، میرے درد کا بیان احاطہ قلم سے باہر ہے۔

یہ غم دائمی ہے یا شاید تب تک چلے گا جب تک آپ سے وابستہ لوگ زندہ ہیں۔

آپی آپ نے منہ سے کچھ نہیں بولا، اپنی اب تک کی زندگی میں، میں نے جو کچھ آپ کے انداز و اطوار سے اخذ کیا لکھ دیا۔

خدا گواہ ہے اس میں کوئی لفاظی نہیں، آپ کی ذات کو جتنا صابر و شاکر میں نے پایا لکھ دیا، پھر بھی کوئی غلطی کر دی ہو معاف کیجئے گا۔

دنیا میں شاید سب کچھ ویسے ہی چل رہا ہے جیسے پہلے چل رہا تھا، لیکن کچھ لوگ ہیں جن کی زندگیوں میں یہ غم موت تک کے لئے پیوست ہو گیا ہے، دل میں ایک خلا سا اتر آیا ہے جس کو پورا صرف فاطمہ جاوید کی ذات کر سکتی ہے مگر اب وہ خاموش طبع ذات ہی تو نہیں۔

قارئین سے التماس ہے کہ میری آپی کے لئے دعا کے مغفرت کریں چار بار سورۃ فاتحہ پڑھ کر ان کی روح کو بخش دیں۔

خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے (آمین)۔

☆☆☆

جب برائی زیادہ ہو جائے

ام المومنین زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیند سے جاگے اور فرمایا۔

"لا الہ الا اللہ، خرابی ہے عرب کی اس آفت سے جو نزدیک ہے، آج یاجوج اور ماجوج کی آڑ اتنی کھل گئی۔" (یعنی انگوٹھے اور کلمہ کی انگلی سے حلقہ بنایا) میں نے عرض کیا۔

"یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا ہم تباہ ہو جائیں گے، ایسی حالت میں جب ہم میں نیک لوگ موجود ہوں گے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"ہاں، جب برائی زیادہ ہو گی۔" (یعنی فسق و فجور یا زنا یا اولاد زنا یا معاصی) (صحیح بخاری)

سعدیہ جبار، ملتان

رضائے الٰہی

امیر المومنین حضرت سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں۔

"مجھے اس بات کی پروا نہیں کہ میں کسی حال میں صبح کروں گا، آیا اس پر جس کو میری طبیعت ناپسند کرتی ہے، یا اس حال پر کہ جس کو میری طبیعت پسند کرتی ہے، کیونکہ مجھے معلوم نہیں کہ میری بھلائی اور بہتری کس میں ہے۔"

یہ بات اللہ تعالیٰ کی تدبیر، رضا مندی، اس کی پسندیدگی اور اختیار اور اس کی قضاء پر اطمینان وسکون ہونے کے سبب فرمائی۔

فرح عامر، جہلم

یادیں

بس یہی مشکل ہے کہ بھول جانا انسان کے بس میں نہیں، جو حادثہ ایک دفعہ گزر جائے، وہ یاد بن کے بار بار گزرتا ہے، بھولنے کی کوشش ہی اسے زندہ رکھتی ہے، انسان ظالم کو معاف کر سکتا ہے، لیکن اس کے ظلم کو بھول نہیں سکتا، بھول جانا انسان کے اختیار میں نہیں۔

موسم گزر جاتے ہیں لیکن یاد نہیں گزرتی، مرحوم زمانوں کی یاد مرحوم نہیں ہوتی، پرانے چہرے نئے چہروں میں نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں، پرانے غم نئے غم میں شامل نظر آتے ہیں۔

پرانی یاد نئی زندگی کے ساتھ چلتی ہے، تہ در تہ یاد انسان کے اندر ہمیشہ محفوظ رہتی ہے، یاد سے نجات کی کوشش دلدل سے نجات کی کوشش کی طرح رائیگاں ہو جاتی ہے۔

آنسہ ممتاز، رحیم یار خان

خشک چشمے

☆ لوگوں پر جو بھی بلا نازل ہوتی ہے وہ آنکھ کے سبب سے ہوتی ہے، نعمت و مصیبت دونوں آنکھ میں رکھ دی گئی ہیں۔

☆ جو نیک بخت ہیں وہ ماں کے شکم ہی سے نیک بخت پیدا ہوتے ہیں اور جو بد بخت

ہیں وہ بھی اس کے شکم ہی سے بد بخت نکلتے ہیں۔

☆ شریف، پارسا ہو جاتا ہے تو تواضع اختیار کرتا ہے، کمینہ، پارسا ہو جاتا ہے تو تکبر اختیار کرتا ہے۔

☆ دل آنکھ کی تابع ہے، آنکھ کے بگڑنے کے بعد دل کی حفاظت مشکل ہے اور دل کے بگڑنے کے بعد شرم گاہ کی حفاظت مشکل تر ہے۔

☆ اگر کسی نے تیرے ایذا کے لئے راہ میں کانٹے بکھیر دیے ہیں تو، تو اس کے راستے میں انتقاماً کانٹے نہ رکھو، وگرنہ دنیا میں ہر طرف کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے۔

☆ اپنی حاجت پر دوسروں کی حاجت کو مقدم رکھنا ہی حقیقی کرم ہے۔

فائزہ قاسم، سکھر

روشن حرف وہ سارے

☆ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پرکھنا اور لوگوں پر اعتبار کرنا محض اس لئے نہ چھوڑ دیں کہ ان میں سے کچھ نے آپ کو مایوس کیا ہے، کوئی نہ کوئی شخص اور کوئی نہ کوئی پہلو آپ کا ضرور ہے۔

☆ جب آپ پہلا قدم اٹھا لیتے ہیں، تہیہ کر لیتے ہیں تو پھر واپسی نہیں ہوتی، گھڑا چاہے کچا ہو پھر بھی پار پہنچا دیتا ہے۔

☆ ادب بہترین کمال اور خیرات افضل ترین عبادت ہے۔

☆ احساس کمتری اور احساس برتری میں مبتلا انسان کبھی بھی کامیاب نہیں ہوتا۔

☆ ذرا ناموافق حالات کی سوئی چبھی، شکل ہی نہیں حالت اور حالات تک بدل دیتی ہے۔

ثریا امین، ٹوبہ ٹیک سنگھ

طرز تخاطب

ایک تاجر نے بہلول کو دیکھا، تو کہنے لگا۔
"یا شیخ میں کون سا مال خریدوں کہ مجھے فائدہ ہو؟"
بہلول نے جواب دیا۔
"روئی اور لوہا خرید لو۔"
تاجر نے ایسا ہی کیا، کچھ عرصے میں اس کی قیمت کئی گناہ بڑھ گئی اور تاجر کو بہت زیادہ فائدہ ہوا، کافی عرصہ گزر جانے کے بعد تاجر نے ایک بار پھر بہلول کو دیکھا تو کہنے لگا۔
"اے پاگل بہلول، اس سال میں کون سا مال خریدوں جو مجھے فائدہ ہو؟"
"اس سال پیاز اور تربوز خرید لو۔" تاجر نے اس بار بھی بہلول کے کہنے پر عمل کیا اور پیاز و تربوز کا اسٹاک کر لیا، لیکن کچھ ہی دن میں پیاز اور تربوز دونوں سڑ گئے اور اس مرتبہ تاجر کو بہت زیادہ نقصان ہوا، تاجر نے بہلول کے پاس جا کر اس غلط مشورے کی وجہ دریافت کی، بہلول کہنے لگے۔

"اے تاجر تم نے پہلی بار مجھے یا شیخ کہہ کر پکارا تھا، اس لئے میں نے عقل و منطق کے ساتھ تمہیں مشورہ دیا، لیکن تم دوسری بار مجھے پاگل کہہ کر مخاطب کیا، اس لئے میں نے تمہیں اپنے پاگل پن میں مشورہ دیا، پس تم اپنے نقصان کے ذمہ داری مجھ پر نہیں ڈال سکتے، کیونکہ کوزے میں وہ ہی نکالا جاتا ہے جو اس میں ڈالا گیا ہو۔"

نعیم امین، کراچی

منافقت

اگرچہ اہل وفا ہیں خلوص کے بھوکے

مگر خلوص نہیں شرط دوستی کے لئے
یہ نکتہ ہم کو سکھایا ہے عہد حاضر نے
منافقت بھی ضروری ہے آدمی کے لئے
ہما رائے، کراچی

یاد

سکوت شام جب خاموش کر جائے زمانے کو
ستارے آئیں جس دم نور کی چادر بچھانے کو
نسیم صبح جب چلتی ہو دنیا کے سلانے کو
یہ الفاظ دگر جب نیند آ جائے زمانے کو
تو تم یہ جان لینا کہ کوئی تم کو یاد کرتا ہے
نازیہ کمال، حیدر آباد

غیر ملکی کہاوتیں

☆ عمدہ دوا اکثر کڑوی ہوتی ہے۔ (جاپانی کہاوت)
☆ جہاں صدق وخلوص نظر آئے وہاں دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ، ورنہ تنہائی ہی تمہاری بہترین رفیق ہے۔ (ایرانی کہاوت)
☆ کپڑے کاٹنے سے پہلے سات بار ناپ لو کیونکہ اسے کاٹنے کا ایک ہی موقع ملتا ہے۔ (چینی کہاوت)
☆ بغیر دیکھے کوئی چیز منہ میں نہ ڈالو اور بغیر پڑھے کسی کاغذ پر دستخط نہ کرو۔ (افریقی کہاوت)
☆ گھر میں حقیقی معنوں میں صرف ایک نوکر کام کرتا ہے، وہ ہے گھر کا مالک۔ (جرمنی کہاوت)
☆ جو بات عقل چھپاتی ہے، نشہ اسے ظاہر کر دیتا ہے۔ (لاطینی کہاوت)
☆ زبان عمر کو چھوٹا کرتی ہے، جبکہ زبان سر کی نگہبان بھی ہے۔ (ایرانی کہاوت)
☆ بزدل مریض کو کوئی ڈاکٹر اچھا نہیں کر سکتا۔ (افغانی کہاوت)
☆ دولت جب بولتی ہے تو سچائی بھی بعض دفعہ خاموش ہو جاتی ہے۔ (مصری کہاوت)
☆ نیند آدمی غذا کا کام کرتی ہے۔ (سوڈانی کہاوت)
☆ پیٹ کے ساتھ بحث کرنا فضول ہے کیونکہ اس کے کان نہیں ہوتے۔ (اردنی کہاوت)
نبیہ آصف، قصور

گوہر آبدار

☆ کہانی میں نام اور تاریخ کے سوا سب کچھ سچ ہوتا ہے اور تاریخ میں نام اور تاریخ کے سوا کچھ بھی سچ نہیں ہوتا۔
☆ سانس کا سفر ختم ہو جاتا ہے، لیکن آس کا سفر باقی رہتا ہے، یہی تو وہ سفر ہے جو انسان کو متحرک رکھتا ہے اور متحرک ہونا زندگی کی علامت ہے، یہ علامت رگوں میں خون کی طرح دوڑتی رہے تو انسان مایوس نہیں ہوتا، چاہے سانس کا سفر ختم ہی کیوں نہ ہو جائے۔
☆ گزرا ہوا واقعہ گزر تا ہی تو نہیں ہے بلکہ وہ یاد بن کر بار بار گزرتا ہے۔
☆ محبت اور بارش ایک جیسی ہوتی ہے، دونوں ہی یادگار ہوتی ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ بارش ساتھ رہ کر جسم بھگواتی ہے اور محبت دور رہ کر آنکھیں بھگو دیتی ہے۔
☆ کبھی کبھی خلوص، خون سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔
مریم رباب، خانیوال

☆☆☆

میری ڈائری سے

صائمہ محمود

سعدیہ جبار: کی ڈائری سے ایک نظم

زندگی سے ڈرتے ہو
زندگی تو تم بھی ہو
زندگی تو ہم بھی ہیں
آدمی سے ڈرتے ہو
آدمی تو تم بھی ہو
آدمی تو ہم بھی ہیں
آدمی زباں بھی ہے
آدمی بیاں بھی ہے
اس سے تم نہیں ڈرتے
حرف اور معنی کے رشتہ ہائے
آہنگ سے آدمی سے وابستہ
آدمی کے دامن سے آدمی ہے وابستہ
ان سے تم نہیں ڈرتے
ان کہی سے ڈرتے ہو
جو ابھی نہیں آئی
اس گھڑی سے ڈرتے ہو
اس گھڑی کی آمد کی آگہی سے ڈرتے ہو
تم مگر یہ کیا جانو
لب اگر نہیں ہلتے، ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں
ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں
روح کی زباں بن کر
راہ کا نشاں بن کر
روشنی سے ڈرتے ہو
روشنی تو تم بھی ہو
روشنی تو ہم بھی ہیں
شہر کی فصیلوں پر دیو کا جو سایہ تھا
پاک ہو گیا آخر خاک ہو گیا آخر
رات کا لبادہ بھی چاک ہو گیا آخر
اژدہام انساں سے فرد کی نوا آئی
ذات کی صدا آئی
راہ شوق سے جیسے راہ رو کا خوں لپکے
اک نیا جنوں لپکے
آدمی چھلک اٹھے
آدمی ہنسے دیکھو
شہر بھی بسے دیکھو
تم ابھی سے ڈرتے ہو
ہاں ابھی تو تم بھی ہو
ہاں ابھی تو ہم بھی ہیں
تم ابھی سے ڈرتے ہو۔

آنسہ ممتاز: کی ڈائری سے خوبصورت غزل

ہمارا یہ تم کو سلام آخری ہے
سنو! آج تم سے کلام آخری ہے
اگر ہو سکے تو بھلا دینا ہم کو
یہی ایک چھوٹا سا کام آخری ہے
ابھی آرزوؤں کے صحرا ہیں پیاسے
مگر آنسوؤں کا یہ جام آخری ہے
مریض محبت کی اے چارہ سازو
تمہارے نگر میں یہ شام آخری ہے
ذرا دیر ٹھہرو قضا کے فرشتو!
لبوں پہ ہمارے پیام آخری ہے
کوئی مل سکے گا نہ امجد کے جیسا
ترے حسن کا یہ غلام آخری ہے

فرح عامر: کی ڈائری سے خوبصورت نظم

ہم خوابوں کے بیوپاری تھے پر
اس میں ہوا نقصان بڑا
کچھ بخت میں ڈھیروں کالک تھی
کچھ اب کے غضب کا کال پڑا
کچھ راکھ لیے جھولی میں
اور سر پہ ساہوکار کھڑا
جب دھرتی صحرا صحرا تھی
ہم دریا دریا روئے تھے
جب ہاتھ کی ریکھائیں چپ تھیں
اور سر سنگیت میں کھوئے تھے
تب ہم نے جیون کھیتی میں
کچھ خواب انوکھے بوئے تھے
کچھ خواب سجل مسکانوں کے
کچھ بول بہت دیوانوں کے
کچھ الفاظ جنہیں معانی نہ ملے
کچھ گیت شکستہ جانوں کے
کچھ پر پاگل پروانوں کے

فائزہ قاسم: کی ڈائری سے ایک غزل

پھر وہی میں ہوں وہی درد کا صحرا یارو
تم سے بچھڑا ہوں تو دکھ پائے ہیں کیا کیا یارو
پیاس اتنی ہے کہ آنکھوں میں بیاباں چمکیں
دھوپ ایسی ہے کہ جیسے کوئی دریا یارو
یاد کرتی ہیں تمہیں ... کی رتیں
کس بیاباں میں ہو میرے تنہا یارو
تم تو نزدیک رگ جاں سے تھے تمہیں کیا کہنا
میں نے دشمن کو بھی دشمن نہیں سمجھا یارو
آسماں گرد میں گم ہے کہ گھٹا چھائی ہے
کچھ بتاؤ کہ میرا شہر ہے پیاسا یارو
کیا کہوں کہ وہ گل ہے کہ شبنم غزل ہے کہ غزال
تم نے دیکھا ہی نہیں اس کا سراپا یارو
اس کے ہونٹوں کے تبسم میں تھی خوشبو غم کی
ہم نے محسن کو بہت دیر میں سمجھا یارو

فریال امین: کی ڈائری سے خوبصورت نظم

”دعا“

تم مجھے بہت عزیز ہو
سوچتا ہوں خدا سے
تمہارے لئے کیا مانگوں
دولت و شہرت علم و اقبال مندی
خوشی و کامرانی
شادمانی محبت یا شادی عشق
سکون جاں یا بے تابی روح
کون سی دعا مانگوں، اچھا سنو!
میں تمہارے لئے
سب سے اچھی دعا مانگتا ہوں
کہ جب تمہیں میرا خدا تمہیں بھی
قلب مطمئن عطا کر دے

نعیم امین: کی ڈائری سے ایک نظم

اک دن
تم نے مجھ سے کہا تھا
دھوپ کڑی ہے
اپنا سایہ ساتھ ہی رکھنا
وقت کے ترکش میں جو تیر تھے کمل کر بر سے ہیں
زرد ہوا کے پتھریلے جھونکوں سے
جسم کا پنچھی گھائل ہے
دھوپ کا جنگل، پیاس کا دریا
ایسے میں آنسو کی اک اک بوند کا
انساں ترسے ہیں
تم نے مجھ سے کہا تھا
سے کی پہچان بھی رکھنا
میرے دل میں جھانک کے دیکھو
دیکھو ساتوں رنگ کا پھول کھلا ہے
وہ لمحہ جو میرا تھا وہ میرا ہے
وہ وقت کے پیکاں بے شک تن پر آن لگے
دیکھو اس لمحے سے کتنا گہرا رشتہ ہے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

خوشبو بند دریچے کھول رہی ہے
چاندنی راتوں سا موسم بھی
کلیاں بھی ہیں، شبنم بھی
یہ سب میرے آئینے ہیں
اور ہر آئینے میں تم ہو

ثناء حیدر: کی ڈائری سے ایک غزل

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے سے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں
حدیث یار کے عنوان نکھرنے لگتے ہیں
تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں
ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے
جو اب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں
صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکر وطن
تو چشم صبح میں آنسو ابھرنے لگتے ہیں
وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق ولب کی بخیہ گیری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں
در قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

در ثمن: کی ڈائری سے ایک نظم

"اے عشق ہمیں برباد نہ کر"

اے عشق ہمیں برباد نہ کر
ہم بھولے ہوؤں کو یاد نہ کر
پہلے ہی بہت ناشاد ہیں ہم
تو اور ہمیں ناشاد نہ کر
قسمت کا ستم ہی کم تو نہیں
یہ تازہ ستم ایجاد نہ کر
یوں ظلم نہ کر بے داد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر
جس دن سے ملے ہیں دونوں کا
سب چین گیا آرام گیا
چہروں سے بہار صبح گئی آنکھوں سے فروغ شام گیا
ہاتھوں سے خوشی کا جام چھٹا
ہونٹوں سے ہنسی کا نام گیا
غمگین نہ بنا ناشاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر
وہ راز ہے یہ غم
آہ جسے پا جائے کوئی تو خیر نہیں
آنکھوں سے جب آنسو بہتے ہیں
آ جائے کوئی تو خیر نہیں
ظالم ہے یہ دنیا دل کو یہاں
بھا جائے کوئی تو خیر نہیں
ہے ظلم مگر فریاد نہ کر
اے عشق ہمیں نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

آسیہ وحید: کی ڈائری سے ایک غزل

تم پوچھو اور میں نہ بتاؤں ایسے تو حالات نہیں
ایک ذرا سا دل ٹوٹا ہے اور تو کوئی بات نہیں
کس کو خبر تھی سانولے بادل بن برسے اڑ جائیں گے
ساون آیا لیکن اپنی قسمت میں برسات نہیں
ٹوٹ گیا جب دل تو پھر یہ سانس کا نغمہ کیا معنی
گونج رہی ہے کیوں شہنائی جب کوئی بارات نہیں
غم کے اندھیرے میں تجھ کو اپنا ساتھی کیوں سمجھوں
تو پھر تو ہے میرا تو سایہ بھی میرے ساتھ نہیں
مانا جیون میں عورت اک بار محبت کرتی ہے
لیکن مجھ کو یہ تو بتا دے کیا تو عورت ذات نہیں
ختم ہوا میرا افسانہ اب یہ آنسو پونچھ بھی لو
جس میں کوئی تارا چمکے آج کی رات وہ رات نہیں
میرے غمگین ہوتے پہ احباب ہیں یوں حیران قتیل
جیسے میں پتھر ہوں میرے سینے میں جذبات نہیں

☆☆☆

ثبوت

تیز رفتاری کے جرم میں نثار صاحب کا چالان ہوا اور انہیں مجسٹریٹ صاحب کے سامنے پیش کیا گیا، انہوں نے صحت جرم سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! میں تو صرف بیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہا تھا۔“

”کیا ثبوت ہے اس بات کا؟“ مجسٹریٹ نے دریافت کیا؟

”جناب والا! ثبوت کے طور پر صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ میں اس وقت اپنے سسرال جا رہا تھا۔“

ام خدیجہ، شاہدرہ لاہور

غلط فہمی

ایک حسین و جمیل عورت اپنے ڈاکٹر کے پاس گئی، اس کی ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی اور سر بھی بڑا سا گومڑا تھا۔ ڈاکٹر نے مرہم پٹی کے دوران چوٹوں کا سبب معلوم کیا تو خاتون نے جواب دیا۔

”یہ میرے شوہر کی عنایت ہے۔“

ڈاکٹر نے کہا۔

”مگر میں نے تو سنا تھا کہ آپ کے شوہر تو شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں؟“

خاتون نے آہ بھر کر جواب دیا۔

”جی، میں بھی اسی غلط فہمی کا شکار تھی۔“

ثمینہ رفیق، کورنگی کراچی

مسٹر کافی

اک یار سے میں نے کہا دو لفظ ہی لکھ دو
چلتی ہے سفارش یہاں اور تم ہو صحافی
کہنے لگے کافی کی پیالی کو اٹھا کر
بس نام بتا دینا مرا نام ہے کافی

ثناء حیدر، سرگودھا

جوتے

اس بات پہ ہم کو تو تعجب نہیں مطلق
کھائے ہیں جو بغداد میں مردود نے جوتے
تاریخ کے صفحات پہ دیتے ہی گواہی
کھائے ہیں ہر اک دور میں نمرود نے جوتے

رمشہ ظفر، بہاول پور

دیکھ بھال

بھنوا کے پہلے کھائیں کلیجی کی بوٹیاں
معشوق نے ڈکار لی پھر دیکھ بھال کے
اس میں قصور عاشق مرحوم کا بھی تھا
کاغذ پہ رکھ دیا تھا کلیجہ نکال کے

درثمن، میاں چنوں

اعتراف گناہ

تین خواتین گپ شپ کر رہی تھیں کہ سنجیدہ موضوعات بھی زیر بحث آ گئے۔ ایک خاتون بولیں۔

”آج کل زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، موت

بالکل اچانک بھی آسکتی ہے، ہمیں کم از کم ایک دوسرے کے سامنے اپنی سب سے بڑی برائی یا گناہ کا اعتراف کر لینا چاہیے، ابتدا میں ہی کرتی ہوں، میرا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ میں نے جو رفاہی تنظیم بنائی ہے، اس کے تمام فنڈز خود برد کر چکی ہوں۔"

دوسری خاتون نے جھجکتے ہوئے اعتراف کیا۔

"میرا گناہ یہ ہے کہ میں پچھلے چھ سال سے اپنے شوہر سے بے وفائی کر رہی ہوں۔" تیسری خاتون بولیں۔

"مجھ میں سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ مجھے جس کا بھی راز معلوم ہو جاتا ہے، وہ میں ادھر ادھر ضرور بتاتی پھرتی ہوں، اچھا، اب میں چلتی ہوں۔"

عاصمہ سرور، وہاڑی

خصوصی پرواز

بیس گھنٹے کے سفر پر روانہ ہونے والی مسافر پرواز کی ائیر ہوسٹس نے بھرپور انداز میں سب مسافروں کو خوش آمدید کہا اور شیریں لہجے میں گویا ہوئی۔

"میں اپنے ادارے کی طرف سے تمام مسافروں کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے پرسکون اور محفوظ سفر کے لئے ہماری کمپنی کا انتخاب کیا، آپ کو بتاتے چلیں کہ ایک چھوٹی اور غیر معمولی خبر یہ ہے کہ ٹی بیگز اور ملک پاؤڈر ختم ہونے کی وجہ سے چائے یا کافی دستیاب نہیں ہو گی۔" یہ سنتے ہی مسافر سرد آہیں بھرنے لگے۔
ائیر ہوسٹس دوبارہ قاتل مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"ایک اور خبر یہ ہے کہ لنچ اور ڈنر کا انتظام نہ کرنے کے سلسلے میں ہماری خدمت قبول فرمائیں، اگر ہم مطلوبہ سامان خریدنے جاتے تو ممکن تھا کہ ہماری پرواز لیٹ ہو جاتی، لہٰذا ہم نے آپ کے قیمتی وقت کو اہمیت دی، انسان گھر میں بھی جا کر کھا پی سکتا ہے۔" یہ سنتے ہی وہ مسافر جن کا بھوک سے برا حال تھا، انتہائی غصے میں بولے۔

"ارے اس جہاز میں کیا پینے کا پانی بھی نہیں ہے؟"
ائیر ہوسٹس ایک کافرادا کے ساتھ مسکرا کر بولی۔

"اس بارے میں آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ہمارے پاس ایک ڈیڑھ لیٹر منرل واٹر موجود ہے۔"
یہ سنتے ہی مسافروں نے غصے کے عالم میں کہا۔

"اسے گلاس میں ڈالو اور شرم سے ڈوب مرو۔" یہ سن کر ائیر ہوسٹس کا چہرہ چمک اٹھا، اس نے گردن جھکائی اور پیار بھرے لہجے میں کہا۔
"آپ لوگ کتنے اچھے ہیں، آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ، اگر آپ پینے کے لئے پانی مانگ لیتے تو ہمیں کتنی پرابلم ہوتی۔"

آسیہ وحید، لاہور

انتباہ

ایک شخص کی سائیکل چوری ہو گئی، وہ چوک میں آ کر اعلان کرنے لگا۔
"اگر میری سائیکل نہ ملی، تو میں وہ ہی کروں گا جو میرے باپ نے کیا تھا۔" چور بوکھلا گیا اور سائیکل چھوڑ کر فرار ہو گیا، سائیکل ملنے کے بعد لوگوں نے اس شخص سے پوچھا۔
"تمہارے باپ نے کیا کیا تھا؟" وہ شخص

بولا۔

''میرے باپ نے نئی سائیکل خریدی تھی۔''

رابعہ ارشد، فیصل آباد

پھکی اور بٹ صاحب

بٹ صاحب شادی پہ گئے، کھانا زیادہ کھا لیا، حالت بری ہو گئی، باہر سڑک پر لیٹ گئے، یار دوستوں نے کہا۔

''آئیں صاحب آپ کو گھر چھوڑ آئیں۔''

بٹ صاحب کراہتے ہوئے۔

''مجھ سے چلا نہیں جاتا۔'' یار اصرار کرنے لگا۔

''نہیں بٹ صاحب چلیے آپ کو پھکی کھلاتے ہیں، آپ کی طبیعت سنبھل جائے گی۔''

بٹ صاحب کراہتے ہوئے۔

''اگر پھکی کی گنجائش ہوتی تو دو بوٹیاں اور نہ کھا لیتا۔''

جویریہ ناصر، گلبرگ لاہور

تجربہ کار

تعلیم بالغاں کے دوران استاد نے سوال کیا۔

''پرسکون اور آرام دہ زندگی گزارنے کے لئے شوہر کے پاس کس چیز کا ہونا ضروری ہے۔''

''بہرا پن۔'' ایک پچاس سالہ شخص نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

مسرت مصباح، لاڑکانہ

غم

سردار شراب پیتے ہوئے بیوی سے۔

''تم کون ہو؟''

بیوی بولی۔

''پاگل ہو گئے ہو کیا، اپنی بیوی کو نہیں پہچانتے۔''

سردار بولا۔

''نشہ ہر غم بھلا دیتا ہے باجی۔''

ام ایمن، گوجرانوالہ

ہر جگہ

مکینک کے انٹرویو ہو رہے تھے، ایک سردار جی جب آئے تو ان سے پوچھا گیا۔

''پہلے یہ بتائیں کہ بجلی کی موٹر کیسے چلتی ہے۔'' سردار جی نے مسکرا کر کہا۔

''بہت آسان سوال ہے بجلی کی موٹر تو ہر جگہ ایسے ہی چلتی ہے گڑ..... گڑ..... گڑ۔''

عابدہ سعید، گجرات

خوبی

ایک بڑے مجمع میں ایک کار کی نیلامی ہو رہی تھی بیس لاکھ، پچیس لاکھ، تیس لاکھ، مجمع میں ایک شخص کھڑا بڑی حیرت سے کار کی حالت زار پر غور کر رہا تھا، مگر اسے کار میں کوئی بھی شے بہتر نظر نہ آئی، اس سے رہا نہ گیا تو قریب کھڑے بولی لگانے والے شخص کا ہاتھ دباتے ہوئے پوچھا۔

''ارے بھائی اس کھٹارا کار میں ایسی کون سی خوبی ہے جس کی بنا پر تم اس کے اتنے دام لگا رہے ہو؟''

ایک شخص نے پلٹ کر غور سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

''جناب اس کار کے اب تک آٹھ حادثے ہو چکے ہیں اور حیرت کی بات ہے کہ ہر حادثہ میں صرف ایک صرف خاتون خانہ کا ہی انتقال ہوا ہے۔''

☆☆☆

دیا صبح
تسنیم طاہر

نازیہ کمال ---- حیدرآباد
یہ ضد ہے ہماری کہ ایسے چھین لیں سب سے
ہم اور زمانے سے تقاضا نہیں کرتے
گوشہ تنہائی میں رو لیتے ہیں اکثر
ہم شہر کی گلیوں میں تماشا نہیں کرتے

....

ہم نے اپنی اداسی کا اس طرح بھرم رکھا
رابطے کم کر دیے مغرور کہلانے لگے

....

محور سوچ دونوں کا ایک ہی ہے
مجھے اس سے اور اسے خود سے فرصت نہیں ملتی
ہمارائے ---- کراچی
ڈھلنے لگی تھی رات کو تم یاد آ گئے
پھر اس کے بعد رات بہت دیر تک رہی

....

بہت امید رکھنا اور پھر بے آس ہونا بھی
بشر کو مار دیتا ہے بہت احساس ہونا بھی

....

عشق ہے اپنے اصولوں پہ ازل سے قائم
امتحاں جس کا بھی لیتا ہے رعایت نہیں کرتا
مریم رباب ---- خانیوال
محبت کے سفر میں دل جلا کر چین ملتا ہے
تمہارے درد کی محفل سجا کر چین ملتا ہے
کبھی احساس ہوتا ہے بہاروں کے اجڑنے کا
کبھی سوکھے ہوئے پتے اٹھا کر چین ملتا ہے

....

تیر کھائے ہیں ہم نے اپنوں سے
یہ کرم خیر خواہ کرتے رہے
اپنا سمجھا تھا ہم نے جن کو قدیر
وہ ستم بے پناہ کرتے رہے

....

تجھ سا کوئی آیا ہے نہ آئے گا جہاں میں
دیتا ہے گواہی یہی عالم کا جریدہ
نبیہ آصف ---- قصور
یوں ذہن میں جمال رسالت سما گیا
میرا جہاں فکر و نظر سا گیا
اس کے قدم سے پھوٹ پڑا چشمہ بہار
وہ دشت زندگی کو گلستان بنا گیا

....

میں کرب کے تپتے صحرا میں کھڑا ہوں
آقا تیری رحمت کو دیکھ رہا ہوں
گو مجھ کو عقیدت کا سلیقہ تو نہیں ہے
اتنا ہی کافی ہے تیرے در پہ کھڑا ہوں

....

آسمان محبت پہ کیسی رونق ہے
چمکتا عشق محمدؐ میں ہر ستارا ہے
اُم خدیجہ ---- شاہدرہ لاہور
کون اجڑا ہوگا بھری دنیا میں ہماری طرح محسن
وہ بھی نہ ملا ہم کو اور ہم خود کو بھی گنوا بیٹھے

....

تیرے قریب رہ کر تجھے تلاش کروں
محبتوں میں میری بد حواسیاں نہ گئیں

....

ہیں دفن مجھ میں میری کتنی رونقیں مت پوچھو

اجڑ اجڑ کر جو بستا رہا وہ شہر ہوں میں
ثمینہ رفیق ---- کورنگی کراچی

مغرور ہی سہی مجھے وہ اچھا بہت لگا
وہ اجنبی تو تھا مگر اپنا بہت لگا
روٹھا ہوا تھا ہنس تو پڑا مجھے دیکھ کر
مجھ کو اس قدر بھی دلاسا بہت لگا

باقی ہیں تیری یاد کے کچھ نقش ابھی تک
دل بے سرو سامان سہی ویران تو نہیں

نہ وہ آنکھ ہی تیری آنکھ تھی نہ وہ خواب ہی تیرا خواب تھا
دل منتظر تو پھر کس لئے تیرا جاگنا اسے بھول جا
وہ بساط جاں ہی الٹ گیا وہ جو راستے سے پلٹ گیا
اسے روکنے سے حصول کیا اسے مت بلا اسے بھول جا
شاہ حیدر ---- سرگودھا

نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی
نہیں وصال میسر تو آرزو ہی سہی
نہ تن میں خون فراہم نہ اشک آنکھوں میں
نماز شوق تو واجب ہے بے وضو ہی سہی

سوچا کیسے کہ ٹوٹ نہ جائے کسی کا دل
گزری ہے اپنی عمر اسی دیکھ بھال میں
خالد وہ بات تو اسے یاد بھی نہیں
ہم جی کو خوں کر گئے جس کے ملال میں

عمر بھر کی ہیں مسافتیں یہ دوریاں یہ فاصلے
تم چاہو تو کچھ عجب نہیں یہ پل ہیں سر ہو جائیں
میں کاٹ سکوں گا تنہا نہ تم کاٹ سکو گے
یہ زیست کے کٹھن راستے ہمسفر ہو جائیں
رمشہ ظفر ---- بہاول پور

جاگا نہیں گیا کبھی سویا نہیں گیا
ہم سے حساب ہجر میں نہیں رکھا گیا
اک عمر جن پہ جاں کو نچھاور کیے رہے
ان سے ہمارا حال بھی پوچھا نہیں گیا

تمہاری یادیں کسی مفلس کی پونجی جیسی
جسے ہم ساتھ رکھتے ہیں جسے ہم روز گنتے ہیں

تمنا دید کی موسیٰ کرے اور طور جل جائے
عجب دستور الفت ہے کرے کوئی بھرے کوئی
درخشاں ---- میاں چنوں

سوچتا ہوں کبھی تیرے دل میں اتر کر دیکھ لوں
کون بسا ہے تیرے دل میں جو مجھے بسنے نہیں دیتا

دین دھرم سب پاپ ہوئے غربت تقویٰ چھین گئی
رات گئے کل شہر سے باہر رہبر رستہ بیچ رہا تھا
تعلیم کا زیور پہن کر بھی بہنیں میری کنواری ہیں
یہ کہہ کر کل اک مفلس بچہ اپنا بستہ بیچ رہا تھا

سدا رہے جکڑے قسمت کی جو زنجیروں میں
ہمارا نام بھی شامل ہے ان اسیروں میں
وہ جس کے ساتھ کی خواہش اڑان بھرتی ہے
اسی کا نام نہیں ہاتھ کی لکیروں میں
آسیہ وحید ---- لاہور

وہ محبتوں کے سودے بھی عجیب کرتا ہے فراز
بس مسکراتا ہے اور دل خرید لیتا ہے

تمہارا ساتھ تسلسل سے چاہیے مجھ کو
تھکن زمانوں کی لمحوں میں کب اترتی ہے

ہمیں آ کر منا لینا
کسی بھی شام سے پہلے
اداسی ٹھہر جاتی ہے
تمہارے نام سے پہلے

جویریہ ناصر ---- گلبرگ لاہور
کاش ایسا ہو اب کے بے وفائی میں کروں
تو پھرے قریہ بہ قریہ کو بہ کو میرے لئے
میں لامحدود ہو جاؤں سمندر کی طرح
تو بہے دریا بہ دریا جو بہ جو میرے لئے

روٹھ جاتے ہو تو کچھ اور حسین لگتے ہو
ہم نے یہ سوچ کر ہی تم کو خفا رکھا ہے

تاروں کو گو شمار میں آنا محال ہے
لیکن کسی کو نیند نہ آئے تو کیا کرے
رابعہ ارشد ---- فیصل آباد
تمام عمر کی بیداریاں بھی سہہ لیں گے
ملی ہے چھاؤں تو بس ایک نیند سو لیں آج

کچھ ایسی بھی گزری ہیں تیرے ہجر کی راتیں
دل درد سے خالی ہو مگر نیند نہ آئے

ہم رہا ہونے کو تھے جب خواہشوں کی قید سے
اس کو نیند اچھی تو مجھ کو رت جگا اچھا لگا
مسرت مصباح ---- لالڑکانہ
نیند تو درد کے بستر پہ بھی آ سکتی ہے
ان کی آغوش میں سر ہو یہ ضروری تو نہیں

بھول کر ذات تم کو یاد کیا
بات بے بات تم کو یاد کیا
نیند ناراض ہو گئی ہم سے
ہم نے جس رات تم کو یاد کیا

گردش دوراں زمانے کی نظر آنکھوں کو نیند
کتنے دشمن اک رسم دوستی سے ہو گئے
ام ایمن ---- گوجرانوالہ

گزرتے ہیں یہ لمحے خاموشی سے
مگر ایسے کہ نیندیں ہی اڑا دیں

برسات کے موسم سے تجھے پیار بہت تھا
اب دیکھ لے آ کر میری بھیگی ہوئی آنکھیں

بدن میں آگ لگی ہے اور آنکھ روتی ہے
کہیں پہ دھوپ کہیں بارشوں کا موسم ہے
عابدہ سعید ---- گجرات
رفاقتوں کے نئے خواب خوشنما ہیں مگر
گزر چکا ہے ترے اعتبار کا موسم

رتوں کا قاعدہ ہے یہ وقت پہ آتی جاتی ہیں
ہمارے شہر میں کیوں رک گیا فریاد کا موسم
نہ کوئی غم خزاں کا ہے نہ خواہش ہے بہاروں کی
ہمارے ساتھ ہے امجد کسی کی یاد کا موسم

ابھی تو خشک ہے موسم بارش ہو تو سوچیں گے
کہ ہم نے اپنے ارمانوں کو کس مٹی میں بونا ہے
سعدیہ جبار ---- ملتان
آنکھ تازہ منظروں کی آس میں کھو جائے گی
دل پرانے موسموں کو ڈھونڈتا رہ جائے گا

نیا موسم میری بینائی کو تسلیم نہیں
مری آنکھوں کو وہی خواب پرانا لا دے

تمہاری یاد کے موسم بھی رخ بدلنے لگے
ہوا چلی ہے تو بارش کے تیر چلنے لگے

☆☆☆

حنا کا دستر خوان

افراح طارق

ہرے بھرے کباب

اشیاء

پودینہ	چار گٹھی
بیسن	ایک کپ
ہری مرچ	دس عدد
ہرا دھنیا	ایک گٹھی
نمک	حسب ذائقہ
ثابت دھنیا بھنا ہوا	ایک چائے کا چمچہ
پیاز	ایک عدد
ٹماٹر بڑے سائز کے	دو عدد
تیل	ڈیپ فرائی کے لئے

ترکیب

پودینے اور ہرا دھنیا کو صاف کر کے پتے الگ کر لیں اور انہیں دھو کر باریک کاٹ لیں، پیاز، ٹماٹر اور ہری مرچ کو باریک کاٹ کر اس آمیزے میں نمک، ثابت دھنیا اور بیسن ملا کر اچھی طرح گوندھ لیں، جب یہ سخت آٹے کے پیڑے کے مانند ہو جائے تو اس کو ایک بڑے رول کی شکل دے دیں، اب ایک دیگچی میں پانی گرم کریں اور اس کے اوپر چھلنی رکھ کر اس پر رول رکھ دیں، کچھ دیر اسے بھاپ میں سخت ہونے دیں، اس کے بعد اس کے سلائس کاٹ لیں، کڑاہی میں درمیانی آنچ پر تیل گرم کریں اور میں سلائس ڈال کر گولڈن براؤن کر لیں، مزے دار ہرے بھرے کباب تیار ہیں املی کی چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

یوگرٹ مٹن

اشیاء

بکرے کا گوشت دھولیں	ایک کلو
دہی	ایک پاؤ
پیاز باریک کاٹ لیں	دو عدد
ادرک، لہسن پیسٹ	دو کھانے کے چمچ
ہری مرچ درمیانی سائز کی	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ
گرم مصالحہ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
تیل	آدھا کپ

ترکیب

دیگچی میں تیل گرم کریں، اس میں پیاز ڈال کر گولڈن براؤن ہونے تک تلیں، گوشت، نمک اور ادرک لہسن پیسٹ ڈال دیں، دو منٹ تک بھون کر تقریباً چار گلاس پانی گوشت میں ڈال کر گلنے کے لئے چھوڑ دیں، (اگر پانی خشک ہو جائے اور گوشت نہ گلے تو تھوڑا پانی اور ڈال دیں) آدھی ہری مرچ گرائنڈر میں پیس لیں، جب گوشت گل جائے تو دہی پھینٹ کر اس میں ملا دیں اور ساتھ ہی پسی ہوئی ہری مرچ بھی ملا دیں، جب دہی کا پانی بھی خشک ہو جائے تو باقی کی ثابت ہری مرچوں کے درمیان میں کٹ لگا کر گوشت میں ڈال دیں، ہلکی آنچ پر مزید دس منٹ پکائیں، جب تیل اوپر آ جائے تو اوپر سے پسا ہوا گرم مصالحہ ڈال دیں، مزے دار یوگرٹ مٹن تیار ہے، روغنی نان اور سلاد کے ساتھ گرم گرم سرو کریں۔

جہانگیری سیخ کباب

اشیاء

قیمہ	ایک کلو
ادرک لہسن پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
سونٹھ پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ
گرم مصالحہ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
پیاز باریک کٹی ہوئی	دو کھانے کے چمچے
ثابت دھنیا کوٹ لیں	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ پاؤڈر	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
کاجو باریک چوپ کر لیں	تین کھانے کے چمچے
خشخاش پیس لیں	ایک چائے کا چمچہ
دیسی گھی	حسب ضرورت
ناریل پاؤڈر	دو کھانے کے چمچے
بیسن	دو کھانے کے چمچے
دہکتا ہوا کوئلہ	ایک عدد

ترکیب

ایک پیالے میں قیمہ، ادرک، لہسن پیسٹ، ہلدی پاؤڈر، سونٹھ، گرم مصالحہ پاؤڈر، پیاز، ثابت دھنیا، نمک، لال مرچ کا پاؤڈر، خشخاش، ناریل پاؤڈر اور بیسن ڈال کر اچھی طرح مکس کریں، جس طرح آٹا گوندھتے ہیں اس طرح گوندھ لیں، اس کو بیس منٹ کے لئے رکھ دیں، پھر درمیان ڈبل روٹی یا پیاز کا چھلکا رکھ کر کوئلہ رکھیں، دو تین قطرے دیسی گھی ٹپکا کر ڈھک دیں۔

اب اس قیمے کو سیخوں پر سیخ کباب کی طرح چڑھا کر دہکتے کوئلے پر سینک لیں، دیسی گھی کا بگھار لگا کر سرونگ ڈش میں نکال لیں، پراٹھوں یا نان کے ساتھ سرو کریں۔

منگولین گوشت

اشیاء

گوشت	آدھا کلو
سویا ساس	ایک کھانے کا چمچہ
سرکہ	دو کھانے کے چمچے
چینی	آدھا چائے کا چمچہ
گرم مصالحہ پاؤڈر	چوتھائی چائے کا چمچہ

سوس بنانے کے لئے:۔

مرغی کی یخنی	چوتھائی کپ
سویا ساس	ایک کھانے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت
سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ
چلی سوس	آدھا چائے کا چمچہ
چینی	آدھا چائے کا چمچہ
کارن فلور	ڈیڑھ چائے کا چمچہ

(تمام اشیا مکس کر لیں)

ہری مرچ	آٹھ عدد
لہسن کے جوئے	چار عدد
ثابت لال مرچ	آٹھ سے دس عدد
ثابت سیاہ مرچ	چوتھائی چائے کا چمچہ
ادرک	ایک انچ کا ٹکڑا

ترکیب

مرغی کی یخنی میں سویا ساس، سرکہ، چلی سوس، چینی اور کارن فلور ڈال کر مکس کر کے سوس تیار کر لیں۔

کڑاہی میں دو چمچے تیل گرم کریں، اس میں لال مرچ ڈال کر کڑکڑائیں اور گوشت، گرم مصالحہ پاؤڈر، سویا ساس اور سرکہ ڈال کر تقریباً پانچ منٹ کے لئے فرائی کریں، دوسری کڑاہی میں تھوڑا سا تیل ڈالیں، اس میں ہری پیاز، سیاہ مرچ اور چینی ڈال کر پکائیں، جب سارا مصالحہ بھون جائے تو گوشت ڈالیں اور ساتھ ہی سوس بھی ڈال دیں اور پکا کر گاڑھا کر لیں سادہ ابلے

ہوئے چاولوں کے ساتھ سرو کریں۔

کابلی چنے کے کباب

اشیاء

کابلی چنے ابلے ہوئے	آدھا کلو
آٹا	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ
کٹی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچ
سیاہ مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
سفید زیرہ	ایک کھانے کا چمچ
ہری مرچ باریک کٹی ہوئی	ایک چائے کا چمچ
سفید تل	تین کھانے کے چمچے
تیل	فرائی کے لئے

ترکیب

چنے اچھی طرح ابال کر میش کرلیں، اس میں آٹا، نمک، لال مرچ، سیاہ مرچ پاؤڈر، ہری مرچ، زیرہ اور تل ڈال کر مکس کرلیں، ہاتھ سے گول کباب بنائیں، تیل گرم کرکے کبابوں کو ہلکا فرائی کرکے دونوں طرف سے گولڈن کرلیں کیچپ اور کھٹی میٹھی املی سوس کے ساتھ سرو کریں۔

ہنٹر بیف

اشیاء

بیف	ڈیڑھ کلو
دار چینی	چار اسٹکس
ثابت سیاہ مرچیں	تین چائے کے چمچے
لونگیں	ایک چائے کا چمچ
سفید زیرہ کٹا ہوا	ایک کھانے کا چمچ
لیموں رس نکال لیں	چار عدد
نمک	حسب ذائقہ
قلمی شورہ (کالا نمک)	دو کھانے کے چمچے
دیسی گڑ	تین کھانے کے چمچے

ترکیب

بیف کو کانٹے سے اچھی طرح گود لیں، دار چینی، ثابت سیاہ مرچیں، لونگ، سفید زیرہ، نمک، قلمی شورہ اور دیسی گڑ ملا کر مصالحہ کو اچھی طرح پیس لیں، اس کے بعد لیموں کا رس اور پسا ہوا مصالحہ گوشت پر لگا کر چار سے پانچ دن کے لئے فریج میں رکھیں اور روزانہ گوشت کو گود لیں، چار پانچ منٹ کے بعد تین کپ پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں، تیار ہو جائے تو اتار لیں اور ٹھنڈا کرکے سلائس کاٹ لیں، ٹماٹو کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔

شکارپوری کباب

اشیاء

قیمہ	ایک کلو
لونگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
دار چینی پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
چھوٹی الائچی پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
جاوتری	ایک چٹکی
سرخ مرچ	ایک کھانے کا چمچ
ادرک، لہسن	چار کھانے کے چمچے
انڈا	ایک عدد
ہری مرچ	آٹھ عدد
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
ادرک	ایک بڑا ٹکڑا
لہسن	دس جوئے
پیاز	دو عدد
کشمش	دس عدد

ترکیب

ایک برتن میں قیمے کے ساتھ لونگ، دار چینی، چھوٹی الائچی، جاوتری، سرخ مرچ، لہسن، ادرک کا پیسٹ اور نمک ملا کر گلا لیں اور ٹھنڈا کرلیں، ٹھنڈا ہونے کے بعد پیس کے ان کی چھوٹی چھوٹی گیندیں بنا لیں، کشمش سمیت باقی ہرا مصالحہ پیس کر ان گیندوں میں بھر لیں اور انڈے

میں ڈبو کر تل لیں، پودینے کی چٹنی اور نان کے ساتھ سرو کریں۔

سفید گوشت

اشیاء

مٹن درمیانے پیس	ایک کلو
پیاز	دو عدد
لہسن، ادرک	۲/۱ چمچ
لونگ	آٹھ عدد
دار چینی	ایک بڑا ٹکڑا
کالی مرچ	پندرہ دانے
نمک	حسب ضرورت
ہری مرچ	چار عدد
تیل	ایک کپ

ترکیب

دیگچی میں تیل گرم کریں اور اس میں گوشت ڈال کر اس کی بو ختم کر لیں، تقریباً پانچ منٹ کے وقفے سے اس میں چار کپ پانی ڈال دیں، پیاز کے چار چار ٹکڑے کر لیں، ہری مرچ، نمک، لہسن، ادرک، لونگ، دار چینی اور کالی مرچ گوشت میں ڈال دیں، تیز آنچ پہ دس منٹ پکائیں، پھر آنچ ہلکی کر لیں اور دیگچی پہ وزن رکھیں، تقریباً دو گھنٹے پکنے دیں۔

مزے دار سفید گوشت تیار ہے، سادہ پلاؤ اور شامی کباب کے ساتھ نوش فرمائیں۔

آلو کوفتہ بوٹی بریانی

اشیاء

قیمہ	250 گرام
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
لہسن، ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچ
ہرا دھنیا کٹا ہوا	ایک چوتھائی کپ
ہری مرچیں کٹی ہوئی	تین عدد
زیرہ پاؤڈر	ڈیڑھ چائے کا چمچ
پیاز کٹی ہوئی	ڈیڑھ کپ
سیلا چاول	آدھا کلو
گوشت کی بوٹی	250 گرام
آلو	دو سے تین عدد
تیل	ایک کپ
ہلدی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
دہی	ایک چوتھائی کپ
ثابت گرم مصالحہ	ایک چائے کا چمچ
پسا گرم مصالحہ	آدھا چائے کا چمچ
زردہ رنگ	دو چٹکی

ترکیب

قیمہ کو چوپر میں پیس کر نمک، مرچ، ہرا دھنیا، زیرہ پاؤڈر، پیاز باریک کر کے لہسن ادرک کا پیسٹ اور ہری مرچیں ڈال کر مکس کر لیں اور کوفتے بنا لیں۔

ایک کڑاہی میں تیل گرم کر کے اس میں پیاز سنہری کر لیں، نمک لال مرچ پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر، ثابت گرم مصالحے، لہسن، ادرک پیسٹ اور دہی ڈال کر بھونیں، کوفتے ڈالیں، پانچ منٹ بعد ابلی ہوئی بوٹیاں اور آلو بھی ڈالیں اور ایک کپ پانی ڈال کر پکائیں، آلو گل جائیں تو ہری مرچیں، ہرا دھنیا، گرم مصالحہ ڈالیں۔

دیگچی میں چاولوں کی آدھی مقدار ڈالیں، کوفتے، بوٹی، آلو مصالحہ ڈال کر باقی چاول ڈالیں اور زعفرانی رنگ ڈال کر دم پر لگائیں، آلو کوفتہ بوٹی بریانی تیار ہے سرو کریں۔

☆☆☆

کس قیامت کے یہ نامے

فوزیہ شفیق

السلام وعلیکم!

آپ کے خطوط اور ان کی جوابات کے ساتھ حاضر ہیں۔

آپ سب کی سلامتی، عافیت اور خوشیوں کے لئے بے شمار دعائیں لئے ہوئے۔

ابتداء سے اب تک انسان نے جو ترقی کی ہے وہ علم کی ہی مرہون منت ہے، کسی بھی قوم کی ترقی کے لئے معیاری تعلیمی نظام ناگزیر ہے، تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جو قومیں علم سے دور اور عیش و عشرت میں پڑی ان کے زوال کا آغاز ہو گیا۔

اس تیز رفتار دنیا میں جب ہر گزرتا لمحہ ترقی و تبدیلی کا پیغام لا رہا ہے اپنا وجود برقرار رکھنے اور دنیا سے منوانے کے لئے ضروری ہے کہ علمی اور عقلی جدوجہد میں پیچھے نہ رہیں ورنہ ہر میدان میں پیچھے رہ جانا ہی مقدر ہوگا۔

آج ہم جن مشکلات سے گزر رہے ہیں اس کی بنیادی وجہ بھی ہے کہ ہم جدید علوم سے دور ہیں، ہمارے گورنمنٹ تعلیمی ادارے زبوں حالی کا شکار ہیں، جن نجی تعلیمی اداروں میں جدید سہولیات موجود ہیں وہ پاکستان کی تقریباً ستر فیصد آبادی کی پہنچ سے دور ہے۔

جس ملک میں غربت، افلاس اور جہالت کا راج ہو وہاں ترقی کا تصور بھی محال ہے تمام تر قدرتی وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود آج ہم کشکول لئے دنیا کے سامنے سراپا سوال بنے کھڑے ہیں تو یقیناً یہ ہماری اپنی غلطیاں اور کوتاہیاں ہیں۔

یاد رکھیے کوئی بھی قوم ہو یا فرد اسے اپنے حالات بدلنے کے لئے خود محنت اور کوشش کرنا پڑتی ہے تب ہی قدرت بھی ساتھ دیتی ہے۔

اپنا بہت سا خیال رکھیے گا، ان کا بھی جو آپ کا خیال رکھتے ہیں آپ سے محبت کرتے ہیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا یہ سوچ کر کہ نہ جانے کس کی زبان سے نکلنے والی دعا ہماری بخشش کا سبب بن جائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ اپنے پیارے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے ہمارے گناہ معاف فرمائے ہمیں اور ہمارے پیارے وطن پاکستان کو اپنی حفظ و امان میں رکھے آمین۔

اس سے پہلے کہ ہم آپ کے خطوط کی محفل میں چلیں، کامیاب زندگی گزارنے کا انتہائی آسان نسخہ نوٹ کریں۔

درود پاک، کلمہ طیبہ اور استغفار کے ورد کو زندگی کا لازمی جز بنا لیجئے پھر دیکھیے دنیا کی کامیابیاں کیسے آپ کی منتظر ہوں گی انشاء اللہ۔

لیجئے آپ کے خطوط کی محفل کا آغاز ہم آپ سب کی پسندیدہ مصنفہ اُم مریم کے خط سے کرتے ہیں، اُم مریم لکھتی ہیں۔

ڈیئر قارئین فوزیہ آپی اور حنا اسٹاف دعا ہے اللہ ہمیشہ آپ پہ مہربان ہو آمین۔

ان گزرنے والے دس مہینوں میں آپ کی الجھنوں کو بار بار محسوس کیا آپ کے شکووں کو اور

بجا سمجھ کر مسکرا دی، آپ غلط تو نہیں اور میں وہ ہوں الحمدللہ جسے اپنی خوبیوں کا علم بھلے نہ ہو خامیوں کا ضرور ادراک رہتا ہے، یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس میں اصلاح کا پہلو ہمیشہ روشن رہتا ہے۔

ہاں تو شکوہ یہ تھا کہ یہ ناول ویسا نہیں، میرا انداز ویسا نہیں، میں اسے بد دلی سے لکھ رہی ہوں، یہ بھی بالکل بجا کہ ناول پہلے ناولز جیسا نہیں، میرا انداز ویسا ہی ہے، بس تحریر کا رنگ الگ ہے تو اس لئے آپ کو کچھ کمی لگ رہی ہے، دراصل یہ ناول جب آپی نے مجھ سے بہت محبت سے مانگا تب میں خود بھی اسے لکھنے کو بے تاب تھی چونکہ یہ ناول رومینٹک ناولز میں سے میرا سب سے ٹاپ کلاس ناول تھا جبھی اسے سب سے آخر کے لئے بچا کے رکھا تھا اور اب جبکہ میرا اصلی سفر اختتام کی جانب ہے، آخری مرحلے میں تھا تب اس کا نمبر لگا، بہت دل سے اس کی پہلی تین اقساط لکھ کر اکتوبر میں آپی کو بھیجی تھیں، دسمبر میں اس کا آغاز ہوا تو ساتھ ہی میری زندگی کا بھی سب سے حسین باب کھل گیا، رشتہ طے ہوا منگنی ہوئی اور شادی کا سلسلہ چل نکلا، مجھے اعتراف ہے اس کے بعد میرا دھیان بھٹکا اور ناول میں دلچسپی بتدریج ختم ہوتی چلی گئی، بہت معذرت، کہ شادی کی تیاریوں میں وقت نہ دے سکی، لیکن آپ تسلی رکھیں اور یہ یقین بھی کہ یہ آپ کا نہیں میرا اپنا بھی پسندیدہ ناول ہے، میں خود اس کے ساتھ کوئی زیادتی برداشت نہیں کر سکتی اور ان شاء اللہ کروں گی بھی نہیں۔

الحمدللہ 17 ستمبر 2016 کو میری شادی بخیر و خوبی انجام پائی اور اب مجھے پورا یقین ہے میں پوری طرح پھر سے اس ناول میں انوالو ہو جاؤں گی، بالکل ویسے جیسے میں ہمیشہ لکھتی رہی ہوں ان شاء اللہ، آپ یہ یاد رکھیے گا کہ یہ اگر میرا فیورٹ ناول ہے تو آپ کا ان شاء اللہ ہارٹ فیورٹ ہو جائے گا، بس مجھے تھوڑا وقت دیں میرے ساتھ تعاون کریں، ویسے ہی جیسے فوزیہ آپی نے کیا ہے، اتنا تعاون کہ مجھے ہر طرح کا اختیار دے دیا ہے یہی اعتماد اور محبت ہے کہ میں اس ناول کے ساتھ معمولی سی بھی بے توجہی نہیں برتوں گی۔

جہاں تک میرے مخصوص رنگ کی بات ہے جو میری تحریروں کا خاصا ہے تو ڈیئر قارئین اس ناول کے ٹائٹل اور اس کی تھیم کو پلیز مت بھولیں، یہ دل گزیدہ ہے، دل گزیدہ کی کہانی کو کچھ تو ایسا ہونا چاہیے جیسی یہ ہے، باقی کہانی تو آگے چل کر ہی آپ کے سامنے آئے گی، خوش رہیں خوشیاں بانٹیں۔

مجھے اپنی دعاؤں میں شامل رکھیے کہ زندگی کے نئے سفر پہ مجھے آپ سب کی دعاؤں کی بہت ضرورت ہے، مجھے میرے والدین بھائی بہنوں کو اور فرحان صاحب کو بھی جو اب میری زندگی کا اہم حصہ ہیں۔

ام مریم ایک طویل عرصے کے بعد اس محفل میں آپ کو دل : جان سے خوش آمدید، دیکھو تو ذرا تمہاری آمد سے ہماری محفل کیسے جگمگا اٹھی ہے بالکل ایسے ہی جیسے آپ جھلمل کر رہی ہیں آج کل، اللہ پاک آپ کو ہمیشہ ایسے ہی رکھے آمین۔

آپ کی معصومانہ وضاحت شائع کر رہے ہیں، یہ بھی آپ کی قارئین سے محبت کا ایک انداز ہے جو ہمیں بڑا اچھا لگا، یقیناً قارئین بھی مطمئن ہوں گے، آپ کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی امید ہے کہ یہ ناول آپ کے پچھلے ناولوں کی طرح ریکارڈ کامیابی حاصل کرے گا۔

نئی زندگی کی شروعات پر ہماری بہت سی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، بہت سے قارئین نے بھی آپ کے لئے نیک تمناؤں کا اظہار کیا، آپ کی نئی زندگی کے لئے بہت سی دعائیں خوش رہیں ہمیشہ۔

فاریہ رحیم: سیالکوٹ سے لکھتی ہیں۔

سب سے پہلے میں اپنی پسندیدہ مصنفہ ام مریم کو ان کی شادی کی دلی مبارکباد پیش کرتی ہوں ام مریم آپ کے لئے بہت ساری دعائیں اللہ پاک آپ کو اپنے گھر میں ہمیشہ خوش رکھے آمین۔

اکتوبر کے حنا کو آرینا خان کے ٹائٹل نے چار چاند لگا دیئے، ہمیشہ کی طرح حمد و نعت، پیارے نبی کی پیاری باتوں سے مستفید ہوئے، انشاء جی نے تاریخ کے ادوار بتا کر ہماری معلومات میں گراں قدر اضافہ کیا، بے شک تحریر مزاح میں لکھی گئی تھی مگر اس کے اندر چھلکتی سنجیدگی معاملے کی حساسیت کو نمایاں کر رہی تھی، اکتوبر کے شمارے نے جہاں ہمیں ام مریم کی شادی کی خوشخبری سنائی وہیں کنول ریاض کے والد کی وفات کی دکھ بھری اطلاع بھی دی، کنول ریاض غم کی اس گھڑی میں ہم آپ کے لئے دلی طور پر دعا گو ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل عطا کرے، بلاشبہ والدین کا سایہ اولاد کے لئے بڑی نعمت ہے، اس کا نعم البدل ہو ہی نہیں سکتا، آپ کے اپنے والد کے لئے لکھی گئی تحریر پڑھ کے بے اختیار آنکھیں نم ہو گئیں، اللہ پاک آپ کے والد کے جنت الفردوس میں درجات بلند کرے آمین۔

ایک دن حنا کے ساتھ میں ایک بھولی بسری مصنفہ سحرش بانو نظر آئیں، مختصر سا لکھا انہوں نے اپنے بارے میں، سحرش بانو آپ نے لکھنا کیوں چھوڑ دیا، جب آپ خالدہ نثار کے نام سے لکھتی تھیں تب تو اکثر آپ کی تحریر حنا میں پڑھنے کو ملتی تھی مگر سحرش بانو بننے کے بعد تو آپ غائب ہی ہو گئیں، سلسلے وار ناول ایک ہی تھا، نایاب جیلانی کا "پربت کے اس پار کہیں" ناول میں دلچسپی کا عنصر بڑھ رہا ہے ہر واقعہ کا منبع کسی دوسرے واقع سے جڑا ہوتا ہے، ویلڈن نایاب آپ بہت اچھا لکھ رہی ہیں، درثمن کی تحریر ہو اور اس میں رومانس نہ ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے "تو میری ضرورت ہے" ناولٹ نہ صرف عنوان خوبصورت ہے اس کی کہانی، لفظوں کی ادائیگی بھی بے مثال ہے، درثمن آپ کے لئے صرف یہی کہیں گے، "آگے رہو" ہمیں آپ کے لکھنے کا اسٹائل بے حد پسند ہے، ارے واہ جی سندس جبیں کی تشریف آوری ہوئی ہے کافی عرصے بعد، یہ کہتے ہوئے "امید سحر" سندس ہمیشہ کی طرح آپ نے اچھا لکھا، ہمیں آپ کی تحریر کا انتظار رہتا ہے، تحسین اختر جی شکر ہے کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے، آپ کو بھی حنا اور اس کے قارئین یاد آئے، سچ کہا آپ نے "عشق کچھ بھی نہیں پوچھتا اسے ہونے کے لئے کسی حسب و نسب کی ضرورت نہیں ہوتی، مکمل ناول کی بات کریں تو فوزیہ آپی اس مرتبہ طیبہ ہاشمی کا ناول پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی اس تحریر کو آپ نے سلیکٹ کیسے کر لیا، معذرت کے ساتھ طیبہ جی آپ کی تحریر بے حد بور تھی دلچسپی سے خالی یوں لگ رہا تھا جیسے کسی ہندی تحریر کا اردو ترجمہ پڑھ رہے ہوں اور پھر باقی آئندہ بھی۔

فلک ارم ذاکر آپ کی تحریر "محبت چاندی" بے حد پسند آئی مناظر کی عکاسی آپ نے بڑی اچھی کی کہانی کے پلاٹ پر آپ کی مکمل گرفت نظر آئی، سبزہ، طوطے اور ٹھنڈی ہوائیں بھی کہانی کا اہم حصہ نظر آئے، افسانوں میں سرفہرست

کلیاں کی امید رہیں۔ مصباح آپ کا افسانہ "کونپل ابھی سے پھوٹیں گی" پڑھ کر دل اداس ہو گیا، آپ نے کتنی خوبصورتی سے مایوس لوگوں کے دلوں میں امید کا دیا جلا دیا، ہما راؤ کی تحریر "مہک کے گلاب" بھی اچھی تھی جبکہ سباس گل کی "مارننگ واک" مزہ دے گئی سچ کہا سباس آپ نے عورت کی عظمت مرد کی بڑائی ماننے میں ہی ہے، حنا اصغر اور فرزانہ حبیب کی تحریریں بھی بہتر تھیں۔

مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح ادارے کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھے، کس قیامت کے یہ نامے میں ہر ایک نے بہترین تبصرہ لکھا۔

قادریہ رحیم خوش آمدید، اس محفل میں ام مریم کے لئے آپ کے نیک جذبات ہم ان سطور کے ان تک پہنچا رہے ہیں۔

اکتوبر کے شمارے کو پسند کرنے کے لئے شکریہ، تعریف اور تنقید دونوں آپ کا حق ہیں ہم برا کیوں مانیں گے، آپ کو اپنا خط دیکھ کر اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہم ہر طرح کے خطوط شائع کرتے ہیں اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیے گا ہم منتظر رہیں گے شکریہ۔

سمعان آفریدی: کا تبصرہ چکوال سے موصول ہوا ہے وہ لکھتے ہیں۔

اکتوبر کا حنا چار کو ملا، ٹائٹل گرل دل کو خوب بھائی، حمد ونعت دونوں اچھی لگیں، پیاری باتیں میں سب باتیں پیاری لگیں، انشاء نامہ حسب حال زبردست رہا، روز و شب بیان کرتی سحرش بانو سے ملاقات اچھی لگی، جہاں اپنے ناول "دل مزیدہ" کو منہ پا کر دکھ ہوا وہیں مریم آپی کی شادی کی خبر سن کر دل خوشی سے جھوم اٹھا، دعا ہے رب تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش وخرم رکھے آمین۔

اور فرحان بھائی ہماری مریم آپی شل ہیرا ہیں سو اس ہیرے کی قدر آپ کو تا قیامت تک کرنی ہے او کے جی اور مریم آپی آپ اپنی شادی کا احوال نامہ لے کے حاضر ہو جائیں ہمیں انتظار رہے گا۔

افسانے اس بار پانچ تھے سب کے سب اچھے لگے مگر کفارہ اور مارننگ واک کا کوئی ثانی نہیں، "محبت چاندنی" کے عنوان سے مکمل ناول خوب لگا جبکہ "دل چڑا" تبصرہ ادھار، ناولٹ "تو میری ضرورت ہے" واہ تحسین آپی آپ تو قاری کو اپنے سحر میں جکڑنا خوب جانتی ہیں۔

"امید سحر" اور "عشق نہ پچھے ذات" تو اس ماہ کے رسالے کی جان تھے۔

"پربت کے اس پار کہیں" اف نایاب آپی آپ بھی ناں پل بھر میں ہماری جان نکال دیتی ہیں، نثرہ کا نکاح ہو گیا گل اور نبیل پر آشکار ہوا اپنے باپ کا ایک اور راز؟ ویسے جہانگیر کو بدلہ مردوں سے لینا چاہیے ناں کہ معصوم و دلفریب ادا کی مالک نبیل پر سے، حاصل مطالعہ اور میری ڈائری سے بہت کچھ سنگ ریزے میری ڈائری کی زینت بنے، محفل حنا میں سب کے سوالات خوب لگے، رنگ حنا بجز، بیاض میں تو گویا اس بار مقابلہ تھا ایک سے بڑھ کر اشعار تھے یہاں، حنا کے دستر خوان پہ تو مائی فیورٹ کریلے پیاز موجود تھے، نامے میں سب کے تبصرے اچھے لگے، آخر میں مجھے فوزیہ آپی کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے مجھے اس محفل میں تہہ دل سے جگہ دی۔

بھائی سمعان آفریدی اکتوبر کے شمارے کے لئے آپ کی پسندیدگی کا شکریہ، ام مریم کے لئے جو دعائیہ نظم آپ نے لکھی طویل ہے شائع نہیں ہو سکتی معذرت امتحانات میں کامیابی پر مبارک باد، ہم آئندہ بھی آپ کی قیمتی رائے کے منتظر رہیں گے شکریہ۔

☆☆☆